بسم اللہ الرحمن الرحیم

عظمتِ اسلام

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

عظمتِ رب

علمی استدلال

خدا کے وجود پر استدلال اتنا ہی ممکن ہے جتنا کسی بھی دوسری چیز پر استدلال۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں انسانوں کی بہت بڑی اکثریت خدا کے وجود پر یقین کرتی رہی ہے۔ تاریخ کے کسی بھی دور میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بڑی تعداد میں لوگ خدا کے وجود کے منکر بن جائیں۔ تاہم موجودہ زمانہ میں کچھ لوگوں نے یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کی کہ خدا کا عقیدہ ایک بے بنیاد عقیدہ ہے، کیوں کہ اس کے حق میں کوئی علمی اور عقلی دلیل موجود نہیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں کسی چیز کو دریافت کرنے کا وہ طریقہ وضع ہوا جس کو سائنسی طریقہ (scientific method) کہا جاتا ہے۔ اس طریقہ میں چیزوں کو قابل مشاہدہ یا قابل تجربہ واقعات کی روشنی میں جانچا جاتا ہے۔ اس طریقہ کے رواج سے انسان کو بہت سی نئی چیزوں کے بارہ میں واقفیت ہوئی۔ مثلاً شمسی نظام کا تفصیلی علم، یا زمین کی تہوں کے بارہ میں قطعی معلومات ۔ وغیرہ۔

ان مادی دریافتوں کے بعد ایک مستقل فلسفہ بنا جس کو عام طور پر پازیٹوزم (positivism) کہا جاتا ہے۔ اس فلسفہ کے تحت یہ سمجھا جانے لگا کہ کسی حقیقی علم تک پہنچنے کا معیار (criterior) صرف ایک ہے، اور وہ براست تجربہ یا مشاہدہ ہے جو قابل تصدیق (verifiable) ہو۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھا گیا تو خدا کے وجود کا عقیدہ اس معیار علم پر پورا اترتا ہوا نظر نہیں آیا۔ کیوں کہ یہ عقیدہ تمام تر بالواسطہ استدلال یا استنباط کی بنیاد پر قائم تھا۔ خدا کا وجود قابل مشاہدہ نہیں تھا۔ اس کے حق میں جو دلیل دی جاتی تھی وہ بس اس قسم کی تھی کہ اس عالم میں چونکہ منصوبہ (ڈزائن) ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک منصوبہ ساز (ڈزائنر) ہو۔ اس قسم کا استنباطی استدلال جدید علمی معیار کے مطابق غیر معقول (invalid) تھا۔ اس لیے اس کو فرضی توجیہہ (pseudo explanation) کہہ کر رد کر دیا گیا۔ یہ اعلان کر دیا گیا کہ خدا کا عقیدہ صرف ایک بے دلیل عقیدہ ہے۔ اس کو جدید منطقی اصول کے مطابق علمی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

علم کی دنیا میں تقریباً سو سال تک یہ فکری بحث جاری رہی۔ مگر اس نقطۂ نظر میں فکری وزن صرف اس وقت تک تھا جب تک انسانی علم کی رسائی عالم کبیر (macro-world) تک محدود تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب انسانی علم کی رسائی عالم صغیر (micro-world) تک پہنچ گئی تو ساری صورت حال یکسر بدل گئی۔

اب معلوم ہوا کہ براہ راست استدلال کا میدان بہت محدود ہے۔ نئے حقائق جو انسان کے علم میں آرہے تھے وہ اتنے لطیف تھے کہ صرف استنباطی یا بالواسطہ استدلال ہی وہاں قابل عمل نظر آتا تھا۔ مثال کے طور پر جرمن سائنس داں رانٹجن (Whilhelm Conrad Rontgen) نے ۱۸۹۵ میں ایک تجربہ کے دوران پایا کہ اس کے سامنے کے شیشہ پر کچھ اثرات (effects) ظاہر ہو رہے ہیں جب کہ اس کے تجربہ اور اس شیشہ کے درمیان کوئی معلوم رشتہ موجود نہ تھا۔ اس نے کہا کہ یہاں ایک ناقابل مشاہدہ شعاع (invisible radiation) ہے جو ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کر رہی ہے۔ اس کی نامعلوم نوعیت (unknown nature) کی بنا پر رانٹجن نے اس کا نام اکسرے (X-rays) رکھ دیا (19/1058)

بیسویں صدی میں اس طرح کے کثیر حقائق سامنے آئے جن کا براہ راست مشاہدہ ممکن نہ تھا مگر ان کے بالواسطہ اثرات کی بنا پر ان کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے جدید علماء مجبور ہوئے کہ براہ راست استدلال کے ساتھ استنباطی استدلال کو بھی ایک معقول استدلالی معیار کے طور پر تسلیم کریں۔ کیوں کہ اس کے بغیر اکسریز کی تشریح نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے بغیر ایٹم کے سائنسی ڈھانچہ کو ماننا ممکن نہ تھا۔ اس کے بغیر بلیک ہول یا ڈارک میٹر کے وجود کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وغیرہ، وغیرہ۔

جدید تحقیقات بتا رہی تھیں کہ ماورائے مشاہدہ بہت سی حقیقتیں موجود ہیں۔ پازیٹوزم کے اصول پر ان حقیقتوں کو ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا، مگر تجربات کی بنا پر ان حقیقتوں کا انکار بھی ممکن نہ تھا۔ اس بنا پر اہل سائنس کے درمیان یہ تسلیم کر لیا گیا کہ استنباطی استدلال بھی اصولاً اتنا ہی معقول ہے جتنا کہ براہ راست استدلال۔

معیار استدلال میں اس توسیع کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی۔ اب خدا کے وجود پر استدلال بھی علمی اعتبار سے ایک معقول (valid) استدلال بن گیا۔ اس توسیعی منطق کے بعد اصولاً مذہبی استدلال اور سائنسی استدلال میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ جس استنباطی منطق سے سائنس کے جدید نظریات ثابت کیے جا رہے تھے عین اسی استنباطی منطق سے خدا کے وجود کا عقیدہ بھی پوری طرح قابل اثبات ہو گیا۔

خدا کا وجود

برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ - ۱۸۷۲) ایک ملحد فلسفی تھا۔ اس نے اپنی کتاب ——— میں کیوں مسیحی نہیں ہوں (Why I am not a Christian) میں لکھا ہے کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ جب میں نوجوان تھا اور میں اپنے ذہن میں خدا کے وجود کے مسئلہ پر بہت سنجیدگی کے ساتھ غور و بحث کرتا رہتا تھا، میں نے ایک عرصہ تک سبب اوّل کی دلیل کو مان لیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن جب کہ میری عمر ۱۸ سال تھی، میں نے جان اسٹوارٹ مل کی آپ بیتی پڑھی۔ میں نے اس میں یہ عبارت دیکھی کہ ——— میرے باپ نے مجھے بتایا کہ "مجھ کو کس نے بنایا" اس سوال کا جواب ممکن نہیں۔ کیوں کہ اس کے فوراً بعد دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ "خدا کو کس نے بنایا"۔

اس سادہ سے جملہ نے مجھے بتایا، جیسا کہ اب بھی میں سوچتا ہوں کہ سبب اوّل کی دلیل ایک مغالطہ پر قائم ہے۔ اگر ہر چیز کا ایک سبب ہونا ضروری ہے تو خدا کے وجود کا بھی ایک سبب ہونا ضروری ہے۔ اور اگر کوئی چیز بغیر سبب کے ہو سکتی ہے تو دنیا بھی اسی طرح سبب کے بغیر ہو سکتی ہے جس طرح خدا۔ اس لیے اس دلیل میں کوئی معقولیت نہیں ہے :

> I may say that when I was a young man and was debating these questions very seriously in my mind, I for a long time accepted the argument of the First Cause, until one day, at the age of eighteen, I read John Stuart Mill's Autobiography, and I there found this sentence: 'My father taught me that the question, "Who made me?" cannot be answered, since it immediately suggests the further question, "Who made God?" That very simple sentence showed me, as I still think, the fallacy in the argument of the First Cause. If everything must have a cause, then God must have a cause. If there can be anything without a cause, it may just as well be the world as God, so that there cannot be any validity in that argument. (p. 15)

یہ استدلال صحیح نہیں۔ اس معاملہ میں اصل سوال سبب کا نہیں ہے بلکہ دو بے سبب میں سے ایک بے سبب کو ترجیح دینے کا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم کائنات کو ماننے پر مجبور ہیں۔ مگر ہم جس کائنات کو مانتے ہیں وہ کائنات یہ ثابت نہیں کرتی کہ وہ اپنی خالق آپ ہے۔ اس مشکل کا واحد حل یہ ہے کہ ایک بے سبب خدا کو مانیں اور اس کو کائنات کا خالق سمجھیں۔ عقلی طور پر اس کے سوا کوئی اور جائز صورت ممکن نہیں۔

موجودہ کائنات مسلسل ہمارے تجربہ میں آتی ہے۔ اس میں پیش آنے والے واقعات کا ہم تجزیہ کرنے کی حیثیت میں ہیں۔ اور انسان نے یہ سب کچھ بہت بڑے پیمانہ پر کیا بھی ہے۔ مگر آج تک کوئی بھی ایسی چیز دریافت نہ ہو سکی جو یہ ثابت کرے کہ کائنات بلا سبب بن گئی۔ یا یہ کہ وہ اپنی خالق آپ ہے۔ ایسی حالت میں ہم مجبور ہیں کہ کائنات کا خالق کسی اور ہستی کو مانیں، خود کائنات کو ہم اس کا خالق تسلیم نہیں کر سکتے۔

خدا عیاناً ہمارے سامنے نہیں، اس لیے ایک شخص خدا کے وجود کے بارہ میں شک کر سکتا ہے۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ کیوں کہ خدا دکھائی نہ دے تب بھی کائنات تو دکھائی دے رہی ہے۔ کوئی شخص خدا کو مانے یا نہ مانے۔ وہ بہر حال کائنات کو ماننے پر مجبور ہے۔ ناقابل ذکر متشککین کے سوا کوئی نہیں جو کائنات کو تسلیم نہ کرتا ہو۔

ایسی حالت میں ہمارے سامنے یہ لازمی سوال ہے کہ کائنات اگر موجود ہے تو وہ کیسے وجود میں آئی۔ گویا اگر ہم مذکورہ سوال کی بنا پر خدا کو نہ مانیں تب بھی اصل سوال سے بچنا ممکن نہیں۔ کیوں کہ پہلے اگر یہ سوال تھا کہ خدا کو کس نے بنایا تو اب یہ سوال ہے کہ کائنات کیسے بن کر تیار ہوئی۔

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ ہمیں کسی نہ کسی کو خالق کے بغیر ماننا ہے۔ اگر ہم خدا کو موجود بالذات (self-existent) نہ مانیں تو اس کے بعد ہمیں کائنات کو موجود بالذات (self-existent) ماننا پڑے گا۔ اور کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات کو موجود بالذات ماننا ممکن نہیں۔ کیونکہ کائنات کے اندر تخلیقی صلاحیت کا کوئی ثبوت نہیں۔

یہ مسئلہ مجرد طور پر ماننے یا نہ ماننے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ دو میں سے ایک کو انتخاب کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہاں ہمارے لیے انتخاب با خدا کائنات اور بے خدا کائنات میں نہیں ہے بلکہ با خدا کائنات اور غیر موجود کائنات میں ہے۔ چونکہ ہم کائنات کو غیر موجود نہیں مان سکتے، اس لیے دوسرا ممکن انتخاب ہمارے لیے صرف یہ ہے کہ ہم با خدا کائنات کا اقرار کریں۔ ایک مشین کو ماننے کا سوال ہو تو آپ کے لیے انتخاب با انجینیر مشین اور بے انجینیر مشین کے درمیان نہیں ہوگا بلکہ با انجینیر مشین اور غیر موجود مشین کے درمیان ہوگا۔ منطقی طور پر آپ غیر موجود مشین کا عقیدہ نہیں رکھ سکتے، اس لیے آپ مجبور ہیں کہ با انجینیر مشین کو مانیں۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر کائنات کا ہے۔

خدا کا عقیدہ

دنیا کی ہر چیز اپنے آخری ماڈل پر ہے۔ کوئی چیز جیسی بنائی گئی ہے اس چیز کا اس سے بہتر ماڈل ممکن نہیں۔ کوئی بھی آرٹسٹ کسی بھی چیز کا موجودہ ماڈل سے بہتر ماڈل تیار نہیں کر سکتا۔ گھاس لے کر درخت تک، چیونٹی سے لے کر شیر تک، چڑیا سے لے کر انسان تک، ہر چیز اپنے آخری بہترین ماڈل پر ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انسانی دماغ آج تک اس سے بہتر ماڈل کا تصور نہ کر سکا۔

جب عالم مخلوقات کی ہر چیز اپنے آخری ماڈل پر ہے تو مخلوقات کے خالق کو بھی یقینی طور پر اسی معیاری صفت کا حامل ہونا چاہیے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو خدا کے بارہ میں جتنے تصورات ہیں ان میں توحید کا تصور آخری اعتقادی ماڈل نظر آئے گا۔ دو خدا کا تصور، تین خدا کا تصور یا بہت سے خداؤں کا تصور، سب کے سب توحید سے کمتر ہیں، اس لیے پہلے ہی جانچ میں وہ قابلِ رد ہو جاتے ہیں۔

خدا ایک ہے، اسی لیے وہ خدا ہے۔ خدا اگر ایک نہ ہوتا تو وہ خدا بھی نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ کائنات کا خدا ایک ہی خدا ہو سکتا ہے۔ کئی خدا کا تصور نہ ممکن ہے اور نہ معقول۔ توحید کا آخری اعتقادی ماڈل ہونا بذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہی درست عقیدہ ہے، اور تمام انسانوں کو بلا بحث اسی کو اپنا مذہبی عقیدہ بنانا چاہیے۔ اس کے سوا کوئی اور عقیدہ نہ اصولاً درست ہے، اور نہ کسی اور عقیدہ کو اختیار کرنا انسان کے لیے فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے۔

توحید ہی دین حق کی واحد فکری اساس ہے۔ تمام معلوم حقیقتیں اسی تصور کی تائید کرتی ہیں کہ اس کائنات کا خالق و مالک ایک ہے۔

کائنات بظاہر مختلف اور متنوع اشیا، کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ مگر تمام چیزوں کا آخری ترکیبی جزء ایک ہے۔ کائنات میں بے شمار قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر سب کی سب ایک ایک ہی مرکزی نظام سے جڑی ہوئی ہیں۔ کائنات ناقابل بیان حد تک وسیع ہے۔ مگر پوری وسیع کائنات میں ایک ہی قانون کی کارفرمائی ہے۔ کائنات کو جس رخ سے بھی دیکھا جائے۔ اس میں حیرت انگیز یکسانیت دکھائی دیتی ہے۔ وغیرہ۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے ـــــ اللہ، اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہ زندہ ہے۔ سب کو تھامنے والا۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں پر اور زمین پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ تھکتا نہیں ان کے تھامنے سے۔ اور وہی ہے بلند مرتبہ، وہی ہے بڑا (البقرہ ۲۵۵)

یہ بظاہر ایک بیان ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ عین دلیل بھی ہے۔ کیوں کہ قرآن کی اس آیت میں خدائے رب العالمین کا جو تعارف کیا گیا ہے وہی خدا کا واحد تعارف ہے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے تو اس کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ خدا انھیں اعلیٰ صفات کا حامل ہے جس کا ذکر مذکورہ آیت میں کیا گیا ہے۔

خدا ایک ہے اور ایک ہی ہو سکتا ہے۔ وہ زندہ ہے، اگر وہ زندہ نہ ہو تو کسی کو بھی زندگی نہ ملے۔ خدا قیوم ہے، اگر وہ قیوم نہ ہو تو کوئی بھی چیز قائم رہنے والی نہیں۔ وہ نیند اور تھکن سے بالاتر ہے، اگر ایسا نہ ہو تو سارا نظام کائنات درہم برہم ہو جائے۔ وہی تمام چیزوں کا مالک ہے۔ اس کے سوا کسی اور کے لیے ملکیت کا استحقاق ثابت نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت خداوندی کے منافی ہے کہ کوئی اس کے یہاں سفارش کے لیے کھڑا ہو سکے۔ اس کا خدا ہونا ہی اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ وہ آگے اور پیچھے کی تمام چیزوں سے پوری طرح باخبر ہو۔ اس کے خدا ہونے کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اس کے پاس تمام معلومات ہوں مگر دوسرا کوئی اس کی معلومات میں حصہ دار نہ بن سکے۔ یہ عین فطری ہے کہ اس کا اقتدار تمام آسمانوں اور زمین کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہو۔ خدا کا خدا ہونا ہی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ تھکن جیسی کمزوریوں سے ماورا ہو۔ جب وہ خدا ہے تو تمام بلندی بھی اسی کے لیے ہے اور تمام بڑائی بھی اسی کے لیے۔

حمدِ الٰہی

سب سے بڑی لذت حقیقتِ اعلیٰ کا ادراک ہے۔ آدمی کے لیے سب سے زیادہ خوشی کا لمحہ وہ ہوتا ہے جب کہ وہ حقیقتِ اعلیٰ کی معرفت حاصل کرے اور اس کو اپنے لفظوں میں بیان کر سکے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو شریعت میں "حمد" کہا گیا ہے۔

خدا اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس لیے خدا کی دریافت کسی انسان کے لیے لذت و انبساط کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ آدمی جب اس حقیقتِ کبریٰ کو دریافت کرتا ہے تو اس پر ابتہاج و انبساط کی ناقابل بیان کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے اعتراف کے جو ربّانی کلمات نکل پڑتے ہیں اسی کا نام حمد ہے۔ قرآن کی آیت (الحمد للہ رب العالمین) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

موجودہ دنیا میں کسی انسان کی سب سے بڑی یافت یہ ہے کہ اس کو حقیقی معنوں میں الحمد للہ ربِ العالمین کہنے کی توفیق مل سکے۔ کوئی شخص اُس معرفتِ خداوندی کا تجربہ کرے جو آدمی کے اندرون کو ربّانی نور سے روشن کر دیتا ہے اور اس کی زبان پر حمد و شکر کے نغمے جاری ہو جاتے ہیں۔

تاہم موجودہ دنیا میں ہر چیز ناقص و ناتمام حالت میں ہے۔ اس لیے یہاں جو چیز بھی انسان کو ملتی ہے وہ ناقص و ناتمام حالت میں ملتی ہے۔ اسی طرح معرفت الٰہی اور حمدِ خداوندی کی توفیق بھی موجودہ دنیا میں صرف ناقص صورت میں مل سکتی ہے۔ یہاں کسی انسان کے لیے معرفتِ کلّی اور حمدِ کامل کی نعمت ملنا ممکن نہیں۔ یہ سب سے بڑی خوشی ان نادر روحوں کے لیے مقدر ہے جن کو اگلے مرحلۂ حیات میں جنّت کا داخلہ دیا جائے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنّت میں اہل ایمان کہیں گے کہ الحمد للہ ربِ العالمین (الزمر ۵)۔ اس سے مراد کلمۂ حمد کا وہ اعلیٰ اور کامل اظہار ہے جس کا موقع صرف جنّت کی کامل اور معیاری دنیا میں حاصل ہوگا۔

جنّت کا انسان کامل ترین صورت میں حقیقت کا ادراک کرے گا۔ اس لیے وہ کامل ترین صورت میں کلمۂ حمد کا اظہار کر سکے گا۔ یہ برتر لذّت کی وہ قسم ہے جو صرف اہل جنّت کے حصہ میں آئے گی۔ موجودہ دنیا میں جو لوگ آج کی سطح پر حمدِ خداوندی کا ثبوت دیں گے وہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو آخرت کی دنیا میں کل کی سطح پر حمدِ خداوندی کی توفیق پائیں گے۔

خدا انسان کے قریب ہے۔ خدا انسان کے کلام کو سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔ یہ حقیقت موجودہ زمانہ میں ہمیشہ سے زیادہ واضح اور قابل فہم ہو گئی ہے۔

۱۲ فروری ۱۹۹۱ کے ٹائمس آف انڈیا اور دوسرے اخبارات میں واشنگٹن کی ڈیٹ لائن کے ساتھ پی ٹی آئی کی ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۱۱ فروری کو دو آدمیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے سے خلیج کے مسئلہ پر بات چیت کی۔ حالاں کہ دونوں کے درمیان نصف کرۂ ارض کا فاصلہ تھا۔ ان میں سے ایک شخص واشنگٹن میں تھا اور دوسرا شخص عمان میں۔ واشنگٹن میں اے بی سی ٹیلی ویژن کا نمائندہ تھا اور عمان میں بیٹھا ہوا شخص وہ تھا جس کو دنیا اردن کے شاہ حسین کے نام سے جانتی ہے۔ یہ گفتگو اور ملاقات جدید ٹیلی ویژن سسٹم پر ہوئی جو سٹلائٹ کے ذریعہ دونوں کی تصویریں اور ان کی گفتگو ایک دوسرے کو بلاتاخیر پہنچا رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا میں یہ امکان اس لیے رکھا ہے تاکہ انسان یہ سوچے کہ جس دنیا میں انسان اور انسان کے درمیان اس قسم کی بعید ملاقات ممکن ہے، کیا وہاں خود خدا اور انسان کے درمیان اس قسم کی ملاقات ممکن نہ ہوگی۔ قرآن اور حدیث میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ ایسی ملاقات ممکن ہے اور بلاشبہ ممکن ہے۔ شرط یہ ہے کہ آدمی اس کے ضروری تقاضوں کو پورا کرے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سجدہ کرو اور اپنے رب سے قریب ہو جاؤ (واسجد واقترب) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور بندے کی نزدیکی کے لیے "سجدہ" وہی کام کرتا ہے جو انسان اور انسان کی نزدیکی کے لیے سٹلائٹ اور ٹیلی ویژن کرتا ہے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تم خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو (کانک تراہ) اسی طرح ایک اور حدیث میں بتایا گیا ہے کہ بندہ جب عبادت اور دعا میں مشغول ہوتا ہے تو وہ اس وقت اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے (یناجی ربہ) اس سے معلوم ہوا کہ بندہ اپنے رب کو اس طرح پا سکتا ہے گویا کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

حتیٰ کہ اس پر یہ تجربہ بھی گزر سکتا ہے کہ وہ محسوس کرے کہ وہ اپنے رب سے ہم کلام ہے۔ تاہم یہ قربت اور مشاہدہ اور ہم کلامی تمام تر ایک روحانی تجربہ ہے نہ کہ کوئی مادی واقعہ۔ خدا سے ملنا، حدیث کے الفاظ میں، گویا کہ خدا سے ملنا ہے، اور خدا کو دیکھنا گویا کہ خدا کو دیکھنا۔

اللہ اکبر

اس کائنات کی اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک خالق ہے، اور یہ خالق سب سے بڑا ہے۔ اس سے بڑا اور کوئی نہیں۔ اذان اور نماز میں بار بار اللہ اکبر کہنا اسی سب سے بڑی سچائی کا مسلسل اعلان ہے۔ اذان اور نماز کے ذریعہ گویا ہم کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔

سب سے بڑی حقیقت کا اعتراف کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ خود اپنے آپ کو سب سے بڑے مقام کا مستحق بنانے کے ہم معنی ہے۔ مغرب نے اس کا اعتراف کیا کہ کائنات سب سے بڑی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کو تمام قوموں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ بڑی حیثیت حاصل ہوگئی۔ پھر جو لوگ کائنات کے خالق کی بڑائی کو پالیں، ان کا حال کتنا عظیم ہونا چاہیے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان ہر جگہ کمزور اور مغلوب ہیں۔ ہمارے حق میں "اللہ اکبر" کی وہ برکتیں ظاہر نہیں ہوتیں جو مغرب کے حق میں "الکون اکبر" کہنے کے نتیجہ میں ظاہر ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اللہ اکبر کے الفاظ کو پایا۔ مگر ہم نے اس کی حقیقت کو نہیں پایا۔ ہم اللہ اکبر کے الفاظ فضا میں بکھیرتے ہیں۔ مگر خود اپنے اندر اسے داخل نہیں کرتے۔

میں نے ایک عربی اخبار میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان تھا: اللہ اکبر فی سماء لندن (لندن کی فضا میں اللہ اکبر کی آواز) یہ لندن کی جامع مسجد کا تعارف تھا۔ مضمون کے ساتھ لندن کی نو تعمیر عظیم مسجد کی تصویر تھی اور دکھایا گیا تھا کہ یہاں سے ہر روز پانچ وقت "اللہ اکبر" کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر بلند کی جاتی ہے جو لندن کی فضاؤں میں گونجتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لاؤڈ اسپیکر کی ایجاد نے ہمیں یہ موقع دیا ہے کہ ہم آسمان تک اللہ اکبر کی آواز کو پہنچا دیں، مگر خود اپنے سینہ کے اندر ہم اللہ اکبر کی آواز کو نہ پہنچا سکے۔ آلۂ مکبر الصوت کے ذریعہ ہم نے بلند فضاؤں میں اللہ اکبر کا ارتعاش پیدا کر دیا۔ مگر اس واقعہ کو ریکارڈ کرنے کے لیے ابھی خدا کے فرشتے انتظار کر رہے ہیں جب کہ خدا کی کبریائی کا احساس ہمارے دلوں میں ارتعاش پیدا کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ اکبر کی برکتوں میں سے کوئی برکت ابھی تک ہمارے حق میں ظاہر نہیں ہوئی۔

عقیدۂ خدا کی تائید میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ وہ فطرت انسانی کی طلب کا حقیقی جواب ہے۔

ایورسٹ دنیا کی سب سے اونچی پہاڑی چوٹی ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے ۲۹۰۲۸ فٹ (۸۸۴۸ میٹر) ہے۔ ۳۰ سال کے اندر تقریباً دس مہمیں اس پر چڑھنے میں ناکام ہو چکی تھیں۔ آخرکار ۲۹ مئی ۱۹۵۳ کو دو آدمی ہمالیہ کی اس چوٹی پر پہونچنے میں کامیاب ہوگیے۔ ان میں سے ایک سر ایڈمنڈ ہلیری تھے اور دوسرے تن زنگ نارگے۔

تن زنگ نارگے (۱۹۸۶-۱۹۱۴) نیپال کے ایک پہاڑی قلی تھے۔ اس واقعہ کے بعد اچانک ان کو غیر معمولی شہرت حاصل ہو گئی۔ دنیا بھر سے ان کو دعوت نامے ملنے شروع ہوگیے۔ اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور دوسری عالمی شخصیتوں نے ان سے ملاقاتیں کیں۔ وہ ہمالین ماونٹینرنگ انسٹی ٹیوٹ (دارجلنگ) کے ڈائرکٹر بنا دیئے گیے۔ تن زنگ صرف برائے نام انگریزی جانتے تھے مگر ایک مغربی مصنف جیمز ریمزے اولمن (James Ramsey Ullman) نے انگریزی زبان میں ان کی سوانح عمری لکھی جو ایورسٹ کا آدمی (Man of Everest) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (انڈین اکسپریس، نئی دہلی، ۱۰ مئی ۱۹۸۶)

۹ مئی ۱۹۸۶ کو تن زنگ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد سر ایڈمنڈ ہلیری (ہندستان میں نیوزی لینڈ کے ہائی کمشنر) نے ایک تعزیتی بیان دیا۔ اس بیان میں بتایا گیا تھا کہ تن زنگ جب ایورسٹ تک پہونچنے میں کامیاب ہوگیے۔ تو اس وقت اپنی زندگی کے آخری نقطہ پر، وہ برف پر گھٹنوں کے بل جھک گیے، انھوں نے برف میں چھوٹا سا سوراخ بنایا اور اس کے اندر کچھ شیرینی رکھی۔ یہ دیوتاؤں کے لیے ان کا اظہار عقیدت تھا:

And then, at the high-point of his life, Tenzing knet in the snow, made a little hole and put sweets into it, his gesture to the gods.

انسان عین اپنی فطرت کے زور پر چاہتا ہے کہ وہ اپنی کامیابیوں کو کسی برتر ہستی کے خانہ میں ڈالے مگر خدائے واحد سے آگاہ نہ ہونے کی بنا پر وہ اس کو فرضی دیوتاؤں کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کی دعوت ایک ایسی چیز کی طرف دعوت ہے جس پر لبیک کہنے کی صلاحیت آدمی کے اندر پہلے سے موجود ہے۔

خدا کا ذکر

عن قیس بن ابی حازم قال کان عبد اللہ بن رواحۃ واضعاً راسہ فی حِجر امراتہ فبکٰی فبکت امرأتہ۔ قال مایبکیکِ قالت رأیتک تبکی فبکیت قال انی ذکرت قول اللہ عز وجل (وان منکم الا وارِدھا) فلا ادری انجو منہا ام لا۔ وفی روایۃ وکان مریضاً

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۱۳۲)

قیس بن حازم تابعی حضرت عبد اللہ بن رواحہ صحابی کے بارہ میں بتاتے ہیں کہ وہ اپنا سر اپنی بیوی کے گود میں رکھے ہوئے تھے کہ وہ رو پڑے۔ ان کی بیوی بھی رونے لگیں۔ انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم کو کس چیز نے رلایا۔ بیوی نے کہا کہ میں نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا تو میں بھی رونے لگی حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے کہا کہ مجھے اللہ تعالی کا یہ قول یاد آیا کہ تم میں سے ہر شخص جہنم سے گزرے گا (مریم) تو مجھے نہیں معلوم کہ میں اس سے بچ جاؤں گا یا نہیں بچوں گا۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت حضرت عبد اللہ بن رواحہ بیمار تھے۔

حضرت عبد اللہ بن رواحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں۔ ایک جلیل القدر صحابی کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے جس کو شریعت میں "ذکر" کہا جاتا ہے۔ ذکر الفاظ کے ورد کا نام نہیں۔ وہ ایک معنوی طوفان کا نام ہے جو ایک بندے کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے رب کو یاد کرے۔

ایک شخص جو واقعۃً اللہ پر یقین رکھتا ہو وہ جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ اس کی عظمت سے دہل اٹھتا ہے۔ وہ اس کے سامنے پیشی کے تصور سے کانپنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کے اندر کی کیفیت بے اختیارانہ طور پر لفظوں کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی ذکر ہے۔ خدا کا ذکر خدا کو اپنے سینہ میں اتارنے کا نام ہے، ایسے خدا کو جس کی برداشت پہاڑ بھی نہیں کر سکتے۔ اس طوفان خیز لمحہ میں جو ربانی کلمات انسان کی زبان سے نکلتے ہیں انھیں کا نام ذکر ہے۔ ذکر خدا کو پانے کا نام ہے نہ کہ کسی قسم کے الفاظ کو پانے کا۔

خدا کی یاد یا خدا سے دعا انسان اور خدا کے درمیان رابطہ کا ذریعہ ہے۔ حتی کہ انسان جب دل سے پکارتا ہے تو اسی وقت وہ خدا کی طرف سے اس کا جواب بھی پالیتا ہے۔

ہیون سانگ (Hsuan-tsang) ایک چینی بدھسٹ ہے۔ وہ ۶۰۲ء میں پیدا ہوا اور ۶۶۴ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ۶۲۹ء میں چین سے سفر کر کے انڈیا آیا۔ انڈیا کے بارہ میں اس کا سفرنامہ بہت تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے بتایا ہے کہ ہندستان میں قیام کے آخری زمانہ میں ہیون سانگ کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔ ایک سفر کے دوران کچھ بحری قزاقوں نے اس کو پکڑ لیا۔ یہ لوگ ہندو دیوی دُرگا کے پجاری تھے۔ انھوں نے ہیون سانگ کو اپنی دیوی کے نام بلیدان کرنا چاہا۔ سانگ نے کافی احتجاج کیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک بودھ درویش ہے اور صرف سچائی کی تلاش میں نکلا ہے۔ مگر بحری قزاقوں نے اس کی چیخ پکار کا کچھ بھی لحاظ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بظاہر اس کی موت یقینی ہو گئی۔

ہیون سانگ اس وقت کشتی پر سوار تھا۔ آخر کار وہ خاموش ہو کر دھیان گیان اور دعا میں مصروف ہو گیا۔ جس وقت وہ دعا اور مراقبہ میں مشغول تھا، سمندر میں زبردست طوفان اٹھا۔ موجوں کے تھپیڑے نے کشتی کو گھیر لیا۔ یہ منظر دیکھ کر بحری قزاق اتنا گھبرائے کہ انھوں نے ہیون سانگ کو چھوڑ دیا اور شرمندہ ہو کر اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگنے لگے:

While he was absorbed in meditation, a violent storm arose that buffeted the boat. The priates were so terrified that they freed the holy monk and asked for forgiveness and repentance. (8/1126)

چینی سیاح کے ساتھ یہ جو واقعہ پیش آیا۔ وہ قرآن کے اس بیان کے مطابق تھا کہ جب کوئی آدمی اضطرار اور مجبوری کی حالت کو پہنچ جائے اور اس وقت وہ دل سے خدا کو پکارے تو خدا اس کی مدد کرتا ہے اور اس کی مصیبت کو اس سے دور کر دیتا ہے (النمل ۶۲) اس میں مومن اور غیر مومن کی کوئی تفریق نہیں۔ جو بندہ بھی اپنے کسی نازک وقت میں اپنے رب کو پکارے گا وہ اس کی طرف سے اس کا جواب پائے گا۔

اس قسم کے واقعات ایک طرف خدا کے وجود کا ثبوت ہیں، اور دوسری طرف وہ بتاتے ہیں کہ اس دنیا میں انسان تنہا نہیں بلکہ اس کا ایک پاسبان ہے جو ہر مشکل وقت میں اس کے کام آتا ہے۔

خدا کی موجودگی

جیمز وائلڈ (James Wilde) ایک جرنلسٹ ہے۔ وہ اوٹاوہ میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۹ سے وہ امریکی میگزین ٹائم سے وابستہ ہے۔ اس کی پوری زندگی عالی شان دفتروں اور جان جوکھم صحافت میں گزری ہے۔ جنگ کے شور اور دھوئیں میں گھس کر براہ راست اخباری رپورٹ تیار کرنا اس کا مشغلہ رہا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کو بڑے ہولناک تجربے ہوئے ہیں۔

وائلڈ کا ایک خوف ناک تجربہ وہ ہے جو کسی دور دراز جنگل میں پیش نہیں آیا، بلکہ ۱۹۸۱ میں نیویارک شہر کے اندر پیش آیا۔ وہ ایک چودہ سالہ لڑکے کا انٹرویو لے رہے تھے جو بچۂ محبت (Baby love) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ وائلڈ نے بتایا کہ انٹرویو کے بعد جب میں نے اپنا ہاتھ رخصتی سلام کہنے کے لیے اٹھایا تو لڑکے نے ایک گن میرے اوپر سیدھی کر دی۔ میں نے اس کو بتایا کہ اگر اس نے مجھ کو مار ڈالا تو وہ "ٹائم" کے صفحات میں جگہ نہ پا سکے گا۔ اس نے جواب دیا کہ مسٹر جیمز تمہارا کہنا درست ہے۔ اس کے بعد اس نے گن میری طرف سے ہٹا دی (ٹائم ۸ جنوری ۱۹۹۰)

جیمز وائلڈ نے بہت پُر واقعات زندگی گزاری ہے۔ تاہم ان کی سب سے زیادہ محبوب چیز نیچر ہے۔ چند سال پہلے انھیں ایک کام سے افریقہ بھیجا گیا، وہ اس پر بہت خوش ہوئے۔ افریقی براعظم جانے پر اس نے خصوصی جذبات کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ افریقہ کے بارہ میں جو چیز مجھے پسند ہے، وہ یہ کہ وہاں کی فضاؤں میں خدا کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے :

What I love about Africa, is that God is in air over there.

قدرت کے وہ مناظر جن میں انسانی ہاتھوں کی آمیزش نہ ہوئی ہو، اپنے اندر عجیب کشش رکھتے ہیں۔ قدرت خدا کی براہ راست کاریگری ہے۔ اس لیے قدرت کی سطح پر خدا گویا براہ راست دکھائی دیتا ہے۔ قدرت خدا کا آئینہ ہے۔ اس آئینہ میں ہر آدمی خدا کو بے حجاب دیکھ سکتا ہے، بشرطیکہ اس نے اپنی آنکھ کو لطیف حقائق دیکھنے کے لیے اندھا نہ بنالیا ہو۔

تمدنی دنیا میں لوگ انسانی مصنوعات میں گم رہتے ہیں۔ فطرت کی دنیا میں خدائی مصنوعات کے کرشمے نظر آتے ہیں۔ فطرت کی دنیا آدمی کو وہ بہترین ماحول دیتی ہے جہاں وہ خدا کو یاد کر سکے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ عظیم اور بامعنی کائنات اپنے آپ بن گئی اور اپنے آپ چل رہی ہے۔ وہ ایک ایسی بات کہتے ہیں جس سے زیادہ بے دلیل بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

۳ جون ۱۹۸۸ کو ہونے والے واقعات میں سب سے اہم اخباری واقعہ وہ حادثہ تھا جو ایران کی ہوائی کمپنی کے ساتھ پیش آیا۔ ایران ایر (Iran Air) کا ایک مسافر بردار جہاز (Airbus A-300) تہران سے اڑا۔ وہ دبئی جانے کے لیے خلیج فارس کے اوپر سے گزر رہا تھا کہ امریکہ کے جنگی جہاز (USS Vincennes) نے اس کو مار کر گرادیا۔ عملہ سمیت اس کے ۲۹۰ مسافر ہلاک ہوگیے جن میں مرد، عورتیں اور بچے سب شامل تھے۔

یہ بلاشبہ ایک وحشیانہ واقعہ تھا۔ اتنا سنگین وحشیانہ واقعہ کیوں پیش آیا۔ اس کا جواب امریکی بحریہ کے افسروں نے یہ دیا ہے کہ یہ کمپیوٹر کی غلطی (Computer error) تھی۔ ان کے کمپیوٹر نے مسافر بردار جہاز کو جنگی جہاز بتایا، اس لیے انھوں نے اس پر وار کیا۔

امریکی بحریہ کے مذکورہ جہاز پر جدید ترین قسم کے راڈر لگے ہوئے ہیں۔ اس راڈر کے ساتھ کمپیوٹر کا انتہائی جدید نظام نصب کیا گیا ہے جو مصنوعی ذہانت (Artificial intelligence) سے مسلح ہے۔ یہ سسٹم یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ فضا میں اڑنے والے جہاز کا معائنہ کرکے راڈر اسکرین پر لفظوں میں لکھ دے کہ وہ کس قسم کا جہاز ہے، دوست یا دشمن۔

۳ جون کو جب مذکورہ جہاز فضا کی بلندی میں اڑ رہا تھا تو کمپیوٹر نے اس کا معائنہ کرکے راڈر اسکرین پر جہاز کا اصل نام (ایربس اے ۳۰۰) لکھنے کے بجائے جٹ فائٹر (F-14 jet fighter) لکھ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دوست جہاز نہیں ہے بلکہ دشمن کا جنگی جہاز ہے۔ اس کے فوراً بعد جہاز کے افسر (Captain Will Rogers III) نے بٹن دبایا اور دو میزائل نے اڑ کر جہاز کو اس کے تمام مسافروں سمیت قبرستان میں پہونچا دیا (ہندستان ٹائمس، ۱۳ جولائی ۱۹۸۸، صفحہ ۱۲)

جدید ملحدین کا یہ کہنا ہے کہ کائنات ایک مشین ہے۔ اگر کائنات صرف ایک مشین ہے تو یہاں مذکورہ قسم کی مشینی غلطیاں کیوں نہیں ہوتیں۔ کیا وجہ ہے کہ اتنی بڑی کائنات بالکل بے خطا انداز میں مسلسل چلی جا رہی ہے۔

بامقصد تخلیق

یہ دنیا کیوں بنی ۔ انسان کیوں یہاں پیدا ہوتا ہے ۔ کس لیے وہ ایک خاص مدت کے بعد مر جاتا ہے ۔ مرنے کے بعد کیا ہونے والا ہے ۔ ـــــ یہ سب سے زیادہ اہم سوالات ہیں جن پر ہر انسان کو سوچنا چاہیے ۔ ان سوالات کا صحیح جواب معلوم کرنا بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے ۔

ہزاروں برس سے انسان ان سوالوں کے بارہ میں سوچتا رہا ہے ۔ مختلف لوگوں نے ان کے مختلف جوابات دیے ہیں ۔ تاہم بڑی تقسیم میں ان کو دو قسم میں بانٹا جا سکتا ہے ۔ ایک وہ جوابات جن کے مطابق ، یہ سارا ہنگامہ عبث (المومنون ۱۱۵) اور بے مقصد ہے ۔ اور دوسرا جواب وہ ہے جو یہ خبر دیتا ہے کہ انسان کی تخلیق کا ایک مقصد ہے اور اس کا ایک انجام سامنے آنے والا ہے ۔

پہلا جواب شاعروں ، فلسفیوں اور دنیوی عالموں نے دیا ہے ۔ دوسرا جواب ان ہستیوں کا دیا ہوا ہے جن کو پیغمبر کہا جاتا ہے اور جس کا مستند متن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں پایا جاتا ہے ۔

ان دونوں قسم کے جوابوں کے تقابل میں بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں ۔ مگر ایک بات بالکل واضح ہے ۔ وہ یہ کہ پہلا جواب زندگی اور کائنات کے ڈھانچہ میں مطابق نہیں بیٹھتا ۔ جب کہ دوسرا جواب زندگی اور کائنات کے نقشہ میں پوری طرح فٹ ہو جاتا ہے ۔ اس میں کوئی اندرونی تضاد نہیں پایا جاتا ۔

یہ دنیا جس کے اندر انسان پیدا ہوتا ہے وہ انتہائی بامعنی ہے ۔ یہاں کوئی چیز بے معنیٰ اور الل ٹپ نظر نہیں آتی ۔ اسی طرح انسان کا وجود بھی پوری طرح ایک بامعنی وجود ہے ۔ اب یہ ناقابل قیاس ہے کہ ایک بامعنی انسان ایک انتہائی بامعنی کائنات میں پیدا کیا جائے مگر اس کا کوئی مقصد نہ ہو ۔ واقعہ اور توجیہہ کے درمیان یہ تضاد خود یہ ثابت کرتا ہے کہ واقعہ کی یہ توجیہہ درست نہیں ۔

جہاں معنویت ہو وہاں مقصدیت بھی ضرور ہوگی ۔ معنویت کبھی مقصد کے بغیر پائی نہیں جا سکتی ۔ کائنات کا یہ پہلو پیغمبر کے جواب کی کھلی ہوئی تصدیق ہے ۔

خدا بلاشبہ سب سے بڑی صداقت ہے۔ تاہم یہ دنیا امتحان کے لیے بنی ہے۔ اس لیے یہاں ہمیشہ یہ امکان باقی رہے گا کہ آدمی صحیح بات کو غلط روپ میں دیکھنے لگے۔

برٹرینڈرسل نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ میں ہزاروں سال تک مذہب کا دور تھا۔ اس زمانہ میں انسان کوئی ترقی نہ کر سکا۔ انسان کی تمام ترقیاں حالیہ چند صدیوں میں ہوئی ہیں جب کہ مذہب کا غلبہ ختم ہو گیا اور سائنس کا دور دنیا میں شروع ہوا۔

برٹرینڈرسل کی یہ بات ایک ترمیم کے ساتھ صحیح ہے۔ قدیم زمانہ میں جو غلبہ تھا وہ حقیقی مذہب کا غلبہ نہیں تھا۔ بلکہ مشرکانہ مذہب (بالفاظ دیگر شرک) کا غلبہ تھا۔ یہی شرک ہے جو قدیم زمانہ میں تمدنی ترقیوں میں رکاوٹ بنا رہا نہ کہ حقیقی معنوں میں مذہب۔ حقیقی مذہب موحدانہ مذہب ہے، جب کہ قدیم تاریخ میں مشرکانہ مذہب ہمیشہ غالب رہا ہے۔

تمدنی ترقیاں فطرت کی تسخیر کا نتیجہ ہیں۔ قدیم زمانہ میں شرک فطرت کی چیزوں کو معبود کا مقام دیے ہوئے تھا۔ ان چیزوں کو آدمی پرستش کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کو تحقیق اور تسخیر کی نظر سے کیوں کر دیکھتا۔ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا اس نے تاریخ میں پہلی بار سچے مذہب (توحید) کو غلبہ کا مقام عطا کیا۔

توحید کے غلبہ کے بعد یہ ہوا کہ فطرت کی چیزیں جو اس سے پہلے پوجنے کی چیز بنی ہوئی تھیں وہ اب تسخیر کی چیز بن گئیں۔ (وسخر لکم ما فی السمٰوات والارض) پہلے اگر یہ نظریہ تھا کہ ہم چیزوں کے لیے ہیں تو اب یہ نظریہ ہو گیا کہ چیزیں ہمارے لیے ہیں نہ کہ ہم چیزوں کے لیے۔

برٹرینڈرسل نے جس انقلاب کو سائنس کی طرف منسوب کیا ہے، وہ انقلاب حقیقۃً سچے مذہب کا لایا ہوا ہے۔ اس کا بیج ساتویں صدی عیسوی میں اسلام (دین توحید) کے ذریعہ رکھا گیا نہ کہ سولھویں صدی میں یورپ کے نشأۃ ثانیہ کی صورت میں۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ تو خود اسلامی انقلاب سے متاثر ہو کر ظہور میں آئی۔

برٹرینڈرسل جیسے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام اور دوسرے مذہبوں کا مطالعہ ایک ہی مشترک عنوان مذہب (ریلیجن) کے تحت کرتے ہیں۔ اگر وہ اس موضوع کا مطالعہ دو الگ الگ عنوانوں کے تحت کریں تو اس معاملہ کو سمجھنے میں انھیں دشواری پیش نہ آئے۔ محرف مذہب اور غیر محرف مذہب میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ دونوں کا مطالعہ ایک عنوان کے تحت نہیں جا سکتا۔

خدا اور مذہب

خدا ہمیشہ سے ہے، وہ ہمیشہ رہے گا۔ وہ ہر قسم کی طاقتوں کا مالک ہے۔ کسی کو بھی اس کے اوپر اختیار نہیں، اس کو سب کے اوپر اختیار ہے۔

خدا نے موجودہ کائنات کو پیدا کیا۔ جدید ترین سائنسی اندازہ کے مطابق، کائنات کی عمر ۱۳ بلین سال ہے۔ اتنی لمبی مدت سے کائنات مسلسل حرکت میں ہے اور اس میں کہیں کوئی نقص یا ٹکراؤ پیدا نہیں ہوا۔

ناقابل قیاس حد تک وسیع کائنات میں خدا نے زمین جیسا ایک کرہ پیدا کیا۔ یہاں وہ تمام اسباب مہیا کیے جو انسان جیسی ایک مخلوق کو زندہ رکھنے اور تمدن کی تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

موجودہ دنیا انسان کی قیام گاہ نہیں ہے بلکہ امتحان گاہ ہے۔ فرشتوں کا غیبی نظام یہاں ہر آدمی کی نگرانی کر رہا ہے۔ موت کے بعد تمام لوگ آخرت کی دنیا میں دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ وہاں ہر ایک کے عمل کے مطابق اس کو بدلہ یا انعام دیا جائے گا۔

زندگی کی اس نوعیت کو بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی انتظامات کیے ہیں۔ کائنات کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ وہ خدا کی اور خدا کی باتوں کی عملی تصدیق بن گئی ہے۔ وہ خاموش زبان میں خدا کے پیغام کا اعلان کر رہی ہے۔ اسی کے ساتھ انسان کی نفسیات کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ خدا کی بات ہر آدمی کے دل کی آواز ہے۔

ان ابتدائی انتظامات کے بعد مزید انتظام وہ کیا گیا ہے جس کو وحی و رسالت کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں اپنے بندوں میں سے کچھ بندوں کو چنا۔ ان پر فرشتے کے ذریعہ اپنا کلام اتارا۔ ان برگزیدہ ہستیوں نے انسان کی قابل فہم زبان میں انسان کو بتایا کہ انسان کے بارہ میں اس کے رب کی مرضی کیا ہے۔

آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ پچھلے پیغمبروں کی تعلیمات میں ان کے ماننے والوں نے تحریف کر دی۔ اس بنا پر ان کی مستند حیثیت ختم ہو گئی۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کی لائی ہوئی کتاب پوری طرح محفوظ ہیں۔ اس لیے اب خدا کی ہدایت کو معلوم کرنے کا واحد مستند ذریعہ صرف آپ کی تعلیمات ہیں۔

خدا آخری حد تک واضح ہے۔ وہ اس دنیا کی سب سے زیادہ ظاہر و باہر حقیقت ہے۔ مگر انسان بعض اوقات اپنے غلط مفروضات کی بنا پر خدا کا منکر بن جاتا ہے۔

منشی پریم چند (۱۹۳۶-۱۸۸۰) کو ناول نگاری میں اگرچہ غیر معمولی مقام ملا مگر وہ نہایت سادہ مزاج کے آدمی تھے۔ اور شہرت سے بہت دور رہنا چاہتے تھے۔ ان کے ایک دوست مسٹر جے نند کمار لکھتے ہیں کہ پریم چند کو میں نے پایا کہ وہ بڑے بننے کے پیچھے نہیں ہیں، سچا بننا ان کا مقصد ہے۔ میں نے انھیں بار بار دیکھا ہے وہ دھوم دھام کے آدمی نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ کسی اور گہری سچائی کے خواہاں رہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے ایک لٹریری کانفرنس میں صدر بنا کر پریم چند کو دہلی بلایا۔ لیکن وہ آنے کو راضی ہی نہ ہوتے تھے۔ خط لکھا، تار دیئے، لیکن انھوں نے لکھا، تم ذاتی طور پر بلاؤ تو آجاؤں لیکن کانفرنس کی تہمت کیوں دیتے ہو۔ آخر رضامندی دی بھی تو تار میں لکھا:

Reaching with protest

مسٹر جے نند کمار لکھتے ہیں کہ ایک بات پر اکثر ان کے ساتھ میری بات چیت ہوئی اور وہ ہے ایشور اور دھرم۔ وہ ایشور کے وجود کے قائل نہیں تھے۔ کیوں کہ وہ دیکھتے تھے کہ ایشور اور دھرم اچھے سے زیادہ برے کام میں لائے جاتے تھے۔ وہ پوچھتے، دنیا میں زور ہے، ظلم ہے، لوگ ستائے جاتے ہیں اور بھوکوں مرتے ہیں۔ چاروں طرف دکھ کی چیخ پکار ہے تم اس ایشور کو مانو گے جو اس سب کی اجازت دیتا ہے۔ وہ مصیبت زدوں کی حالت دیکھ کر خدا کے منکر ہو جاتے تھے (کیا خوب آدمی تھا)

منشی پریم چند نہایت نیک مزاج آدمی تھے مگر دنیا کے حالات کو انھوں نے صحیح رخ سے نہ دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حالات کی معنویت کو سمجھ نہ سکے اور خدا کے منکر ہو گیے۔ موجودہ دنیا کو سمجھنے کا راز یہ ہے کہ اس کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ وہ "دارالامتحان" ہے۔ یہی موجودہ دنیا کو دیکھنے کا صحیح زاویہ ہے اور کسی چیز کا مطالعہ اسی وقت صحیح ہوتا ہے جب کہ اس کو صحیح زاویہ سے دیکھا جائے۔

موجودہ دنیا کو آخرت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو مذکورہ نقطۂ نظر درست نظر آئے گا۔ لیکن اس کو آخرت سے ملا کر دیکھیے تو موجودہ خرابیاں معقول معلوم ہونے لگتی ہیں۔ کیوں کہ دارالامتحان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو عمل کی آزادی ہو۔ اور جب تمام لوگوں کو آزادی ہو گی تو کوئی صحیح کرے گا اور کوئی غلط، اور پھر وہی صورت حال پیش آئے گی جو موجودہ حالت میں دنیا میں دکھائی دے رہی ہے۔

کارساز

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ نومبر ۱۹۸۹) کے کالم اوپی نین (opinion) میں ایک عنوان نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اس کے الفاظ تھے ـــــــ میں لاپرواتھا مگر وہ نہ تھے :

I was careless; they were r

یہ نئی دہلی (فرینڈس کالونی ایسٹ) کے رہنے والے مسٹر کرشن کھنہ کا ایک تجربہ تھا جو مذکورہ سرخی کے ساتھ اخبار میں شائع ہوا۔ اس سرخی کے نیچے جو مختصر مضمون درج تھا، اس کا ترجمہ یہ ہے :

"میں کالکا سے دہلی کے لیے بذریعہ ٹرین سفر کررہا تھا۔ میں نے لاپروائی میں اپنا پرس ریل کوچ کے اندر گرادیا۔ میں نے سمجھا کہ اس کو کسی نے میری جیب سے نکال لیا ہے۔ مجھے کوئی امید نہ تھی کہ میرا پرس دوبارہ مجھے واپس ملے گا۔ اگلی صبح کو ایک ٹیلی فون آیا۔ یہ ناردرن ریلوے کے ڈویزنل منیجر کے دفتر سے تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ میرا پرس مل گیا ہے اور وہ ان کے پاس موجود ہے۔ انھوں نے پرس کے اندر رکھی ہوئی ایک شناختی سلپ کے ذریعہ مجھے جانا تھا۔ میں دفتر پہونچا تو میرے پرس کی تمام چیزیں پوری طرح محفوظ تھیں۔ افسر اور اس کے عملہ نے میرے ساتھ انتہائی خوش اخلاقی کا معاملہ کرتے ہوئے میرا پرس مجھے واپس دے دیا۔"

I was careless enough to drop my wallet in the rail coach I took from Kalka to Delhi. I took my pocket had been picked and had no hope of getting it back. The next morning came a telephone call from the office of Northern Railway's divisional manager to say it had been found. They located me by an identity slip in it. All the contents were intact and I was treated with utmost courtesy by the officer and his staff. (Krishen Khanna)

میں نے اس خبر کو پڑھا تو مجھے کسی فارسی شاعر کا وہ شعر یاد آگیا جو اس نے خدا اور بندے کی نسبت سے کہا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا خدا زیادہ بہتر طور پر ہماری کارسازی کر رہا ہے :

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

حقیقت یہ ہے کہ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے بشرطیکہ کوئی بندہ اللہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرکے یہ کہہ اٹھے کہ ـــــــ خدایا، انا عِندَ ظنِّ عبدی بی کے مطابق، میں

نے تیرے ساتھ یہ گمان قائم کیا ہے کہ تو میری فکر کرے گا جب کہ میں بے فکر ہو جاؤں۔ تو مجھے یاد رکھے گا جب کہ میں بھول جاؤں۔ تو مجھے سنبھالے گا جب کہ میں پھسلنے لگوں۔ تو میری کارسازی کرے گا جب کہ میں غفلت میں پڑ جاؤں۔ تو میرے لیے جاگے گا جب کہ میں سو جاؤں۔ تو مجھے بخش دے گا جب کہ میں غلطی اور کوتاہی کروں۔

جب کوئی بندہ اس طرح خدا کو اپنا رب بنائے تو خدا بھی اسی طرح اُس کو اپنا بندہ بنا لیتا ہے جیسا کہ اس نے اپنے رب کے ساتھ گمان کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جتنے واقعات پیش آتے ہیں، وہ سب سبق کے لیے پیش آتے ہیں۔ مذکورہ بالا قسم کے واقعات بھی دراصل اسی لیے ہیں کہ انسان ان سے سبق حاصل کرے۔ وہ انسانی واقعہ میں خدائی معاملہ کی جھلک پالے۔ وہ وقتی تجربہ میں اس مستقل اور پائیدار تعلق کا تجربہ کرلے جو بندہ اور خدا کے درمیان قائم ہوتا ہے، جس کو کبھی ٹوٹنا نہیں ہے۔ جس کا سلسلہ دنیا سے آخرت تک چلا جاتا ہے۔

خدا بلاشبہ سب سے بڑا کارساز ہے۔ مگر وہ اسی شخص کا کارساز بنتا ہے جو اس کو اپنا کارساز بنائے۔ جو اس پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے۔

آپ ایک گارڈن کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ اس کی ٹھنڈی ہوائیں آپ کے اندر ارتعاش پیدا کر رہی ہیں۔ اس کے پھولوں کی خوشبو سے آپ کی روح معطر ہو رہی ہے۔ اس کا سہانا منظر آپ کو ہمہ تن اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ آپ سرشاری کے عالم میں کہہ اٹھتے ہیں :

خدایا، یہ گارڈن گویا جنت کا ایک بعید نظارہ ہے۔ تو نے جنت مجھ کو دور سے دکھائی، اب تو جنت کو مجھے قریب سے بھی دکھا دے۔ تو نے مجھے جنت کا تعارفی مشاہدہ کرایا، اب تو مجھ کو جنت کا حقیقی مشاہدہ بھی کرا دے۔ تو نے مجھے خارج سے جنت کا تجربہ کرایا، اب تو اس کے اندر بھی مجھے داخل کر دے۔

خدا کی دنیا میں جو آدمی اس طرح کی روحانی خوراک حاصل کرے وہ اپنے آپ کو خدا کے عین قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ دیکھے بغیر خدا کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ پائے بغیر خدا کو پا لیتا ہے۔

عجز کی قیمت

۳ مئی ۱۹۸۸ کو دہلی کے اخبارات میں صفحہ اول پر جن خبروں کو جگہ ملی، ان میں سے ایک خبر وہ تھی جو ہندستانی سینما کے مشہور شومین (Showman) مسٹر راج کپور سے متعلق تھی۔ ۲ مئی کو ایک خصوصی تقریب میں بہت سی فلمی شخصیتوں کو انعامات دیے گئے۔ مسٹر راج کپور کو ایک خصوصی اوارڈ دیا جانے والا تھا جو ایک لاکھ روپیہ نقد اور ایک قیمتی شال پر مشتمل ہے۔ اسٹیج کے اوپر ہندستان کے پریسیڈنٹ اور دوسرے کئی وزیر موجود تھے۔ نیچے بھرے ہوئے ہال میں سامنے کی سیٹ پر مسٹر راج کپور بیٹھے ہوئے تھے۔ عین اس وقت ان کو دمہ کا شدید دورہ پڑا، وہ اٹھنے سے معذور ہو گئے۔ قاعدہ کے مطابق، راج کپور کو اوپر جا کر پریسیڈنٹ کے ہاتھ سے انعام لینا تھا۔ مگر پریسیڈنٹ وینکٹا رمن نے جب راج کپور کا یہ حال دیکھا تو تمام صدارتی آداب کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ خود اسٹیج سے نیچے اتر پڑے تاکہ مسٹر راج کپور کو داداصاحب پھالکے اوارڈ دے سکیں جو آڈیٹوریم میں اپنی سیٹ پر تقریباً گر پڑے تھے:

The President, Mr. R. Venkataraman, setting aside all protocol, walked down the steps of Siri Fort stage to hand over the Dadasaheb Phalke Award to an ailing Raj Kapoor who nearly collapsed in his seat in the auditorium.

راج کپور اپنے عمل کے اعتبار سے صرف "پھالکے اوارڈ" کے مستحق تھے۔ مگر جب وہ عجز اور معذوری کی سطح پر پہونچ گئے تو وہ "پریسیڈنٹ اوارڈ" کے مستحق قرار پائے۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کمزور مومن کے مقابلہ میں طاقت ور مومن اللہ کو زیادہ پسند ہے۔ مگر ہر ایک کے لیے خیر ہے۔ طاقت ور بندہ اگر حق کی حمایت کر کے اللہ کا پسندیدہ بنا تھا تو کمزور بندہ اپنے عجز کا اظہار کر کے اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔ عاجز انسان زیادہ بہتر طور پر اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ خدا کی بے پناہ قدرت کے مقابلہ میں اپنے بے پناہ عجز کو دریافت کرے۔ وہ عاجزانہ عبدیت کے نازک ترین اور لطیف ترین جذبات کو پیش کر کے خدا کی رحمت خاص میں حصہ دار بن جائے۔

انسان اور خدا کے درمیان گھمنڈ کی سطح پر رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ انسان اور خدا کے درمیان صرف عجز کی سطح پر رشتہ قائم ہوتا ہے۔ عجز انسان کو خدا سے قریب کرنے والا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ جولائی ۱۹۸۵) نے لتا منگیشکر کا ایک انٹرویو شائع کیا ہے۔ یہ انٹرویو نیویارک میں لیا گیا تھا۔ لتا منگیشکر ہندستان کی مشہور ترین خاتون سنگر ہیں۔ انٹرویور نے ان سے کہا کہ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ کی مقبولیت نے آپ کو مغرور بنا دیا ہے۔ خاتون سنگر نے اس کا جو جواب دیا وہ اخبار کے الفاظ میں یہ تھا:

> Surely, I'm no tyrant. I cannot afford to be nasty or arrogant. The day that happens — and I assure you it never will — there would be no sweetness in my music.

یقینی طور پر میں مغرور نہیں ہوں۔ میں بدطینت اور مغرور ہونے کا تحمل نہیں کر سکتی۔ جس دن ایسا ہوگا، اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا، اس دن میرے گانے میں کوئی مٹھاس باقی نہیں رہے گی۔

یہ اگرچہ ایک سنگر کی بات ہے مگر سنگر نے اس میں ایک بڑی اہم حقیقت بیان کر دی ہے۔ یہ حقیقت ایک داعی کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی ایک سنگر کے لیے۔

انسان کا اصل حسن تواضع ہے نہ کہ گھمنڈ۔ گھمنڈ کرنے والے آدمی کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ مگر جو شخص تواضع اختیار کرے اس کے اندر اپنے آپ ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ متکبر کی آواز کڑوی آواز ہوتی ہے اور متواضع انسان کی آواز میٹھی آواز۔

خدا کا داعی خدا کے گیت گانے والا ہوتا ہے۔ وہ انسانی زبان میں ابدی حقیقت کے نغمے بکھیرتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کا سینہ تواضع اور رمزتا سے بھرا ہوا ہو۔ اس نے اپنے آپ کو انا کے جذبہ سے خالی کر رکھا ہو۔ جس شخص میں یہ بات ہوگی اسی کی زبان سے وہ میٹھے بول نکلیں گے جو لوگوں کو تڑپا ئیں۔ وہی وہ گیت چھیڑ سکے گا جو روحوں میں وجد پیدا کر دیں۔

سچائی کی عظمت کو وہی شخص بیان کر سکتا ہے جس کا دل ذاتی عظمت سے اس طرح خالی ہو جائے کہ وہ ذاتی عظمت کے احساس کا تحمل نہ کر سکے۔

آخرت کا مسئلہ

خدا نے انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کے عرصۂ حیات (Life span) کے تقریباً سو سال کو موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ ساری عمر کو موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا میں ڈال دیا۔ اب بہترین عقل مندی یہ ہے کہ انسان اس آنے والی دائمی زندگی کو سامنے رکھ کر زندگی گزارے۔ اس کی زندگی آخرت رخی (Akhirat oriented) زندگی ہو۔

ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے:

It is a question for us now to consider whether we have any personal relations towards the Supreme Power; whether there exists another world in which we shall be requited according to our actions. Not only is this a grand problem of philosophy; it is of all questions the most practical for us, the one in which our interests are most vitally concerned. This life is short, and its pleasures are poor; when we have obtained what we desire it is nearly time to die. If it can be shown that by living in a certain manner, eternal happiness may be obtained, then clearly no one except a fool or a mad man will refuse to live in such a manner (p. 414).

"ہمارے لیے یہ ایک غور طلب سوال ہے کہ کیا خالق کائنات اور ہمارے درمیان کوئی ذاتی رشتہ ہے۔ کیا موجودہ دنیا کے علاوہ کوئی اور دنیا ہے جس میں ہم اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پائیں گے۔ یہ نہ صرف فلسفہ کا بہت بڑا سوال ہے، یہ خود ہمارے لیے سب سے زیادہ عملی سوال ہے، ایک ایسا سوال جس سے ہمارے مفادات بہت زیادہ وابستہ ہیں۔ موجودہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اس کی خوشیاں نہایت معمولی ہیں۔ جب ہم وہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں تو ہمارے مرنے کا وقت قریب آچکا ہوتا ہے۔ اگر یہ واضح ہو سکے کہ ایک خاص طریقہ پر زندگی گزارنے سے دائمی خوشی حاصل ہو سکتی ہے تو بیوقوف یا پاگل کے علاوہ کوئی بھی شخص نہیں ہوگا جو اس طرح زندگی گزارنے سے انکار کرے۔"

آخرت کا مسئلہ کس قدر اہم ہے، مگر انسان کتنی آسانی کے ساتھ اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر دن ہزاروں لوگ پیدا ہوتے ہیں اور ہر دن ہزاروں لوگ مر جاتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو موت کے آگے کے لیے سوچنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔

ایم ایس اوبرائے ہندستان میں ہوٹل کے بزنس میں سب سے ممتاز شخص گنے جاتے ہیں۔ وہ ایک "ہوٹل ایمپائر" کے مالک ہیں اور نہ صرف ہندستان کے مختلف شہروں میں ان کے ہوٹل قائم ہیں، بلکہ بیرونی دنیا میں بھی ان کے بڑے بڑے ہوٹل چل رہے ہیں۔ مسٹر اوبرائے ۱۵ اگست ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئے۔ اب ۹۰ سال کی عمر کو پہنچ کر وہ دہلی کے قریب ایک فارم میں سادہ طور پر رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا فارم میری پناہ گاہ ہے، وہ مجھ کو سکون دیتا ہے:

My farm is my refuge and gives me solace.

ٹائمس آف انڈیا کے سنڈے ایڈیشن (۱۲ اگست ۱۹۹۰ء) میں اپنی زندگی کی کہانی بتاتے ہوئے اس کو انھوں نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے ——— اپنی زندگی کی شام کو پہنچ کر مجھے کوئی افسوس نہیں۔ یہ جان کر مجھے راحت ملتی ہے کہ اپنے طریقہ کے مطابق، میں اس قابل ہو سکا کہ ضرورت مند لوگوں کی مدد کروں، اور یہ کہ جو کچھ میں نے حاصل کیا وہ میرے ملک کی عزت میں اضافہ کا سبب بھی بنا۔ اس سے زیادہ کوئی شخص اور کیا تمنا کر سکتا ہے:

In the evening of life, I have few regrets and there is comfort in knowing that I have been able to, in my humble way, help people in need and that whatever I have achieved has also helped to raise the prestige of my country. What more could any man have wished for?

ان الفاظ کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ایک شخص جو ملک کے لیے جئے، وہ اپنی آخر عمر میں پہنچ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ جس کے لیے جیا اس کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص خدا کے لیے جئے، اس کا احساس آخر عمر میں یہ ہوگا کہ وہ جس ہستی کے لیے جیا، وہ ہستی اس کے آگے ہے۔ پہلے شخص کو موت کے آگے صرف خلا نظر آئے گا، اور دوسرے شخص کو موت کے آگے امید سے بھری ہوئی ایک پوری دنیا دکھائی دے گی۔

پھر کیوں نہ آدمی خدا کے لیے جئے۔ کیوں وہ غیر خدا کے لیے جئے جس کا آخری انجام صرف مایوسی اور ناامیدی ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

آسمانی انتظام

ابتدائی دور کی جنگوں میں صرف انسانی آنکھ دیکھنے کا کام کرتی تھی۔ اس کے بعد دوربین سے کام لیا جانے لگا۔ اب ٹکنالوجی کی ترقی نے اس کو ممکن بنادیا ہے کہ آسمان میں گھومتی ہوئی مشینوں (سٹلائٹ) کے ذریعہ دشمن کے ٹھکانوں کو معلوم کیا جائے اور نہایت صحت کے ساتھ ان کو دور سے نشانہ بنایا جاسکے۔ خلیج کی جنگ اسی قسم کی ایک جنگ تھی۔ اس میں ایسی پیچیدہ ٹکنالوجی استعمال کی گئی جو اس سے پہلے کبھی کسی جنگ میں استعمال نہیں کی گئی تھی۔ اس اعتبار سے اس جنگ میں بہت سے نہایت اہم سبق ملتے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۳۱ جنوری ۱۹۹۱) میں خلیج کی جنگ سے متعلق اسی قسم کی ایک نصیحت آموز رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان اخبار نے ان لفظوں میں قائم کیا ہے کہ اتحادی فوجوں کی آنکھ آسمان میں:

Eyes of the Allies in the sky

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جنوری ۱۹۹۱ میں عراق نے کئی درجن اسکڈ میزائل (Scuds) اسرائیل اور سعودی عرب پر پھینکے۔ مگر ان کی زیادہ تعداد درمیان ہی میں بیکار کر دی گئی۔ وہ نشانہ پر نہ پہنچ سکی۔ اس سے پہلے جو جنگیں ہوتی تھیں ان میں توپ کے گولے یا بم جب دشمن کی طرف پھینکے جاتے تھے تو ان کو راستہ کے درمیان ناکارہ کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ پھر موجودہ جنگ میں کیوں کر ایسا ہوا
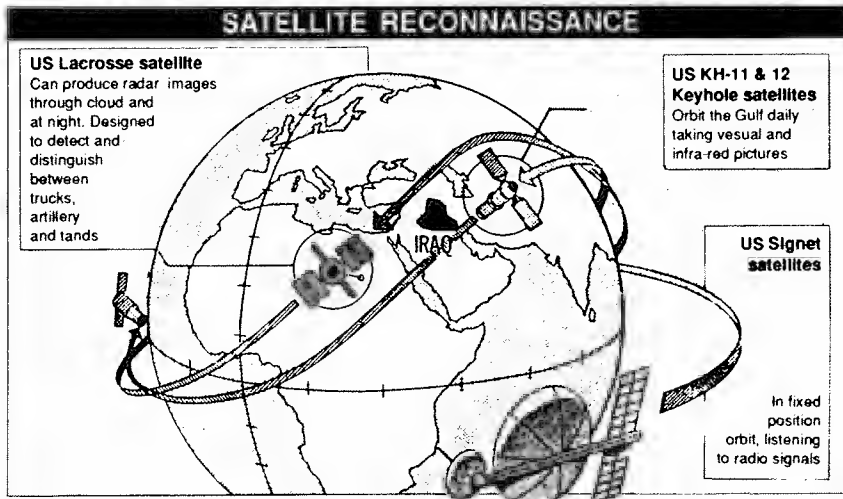
کہ ایک فریق کے پھینکے ہوئے میزائل کو دوسرے فریق نے راستہ ہی میں ناکارہ کر دیا۔ اس کا جواب خاص طور پر دو امریکی سیاروں میں ہے جو ایک زمینی اسٹیشن سے کنٹرول کئے جا رہے تھے۔ یہ زمینی اسٹیشن وسط آسٹریلیا میں واقع ہے۔

اس تدبیر کو ڈیفنس سپورٹ پروگرام کہا جاتا ہے۔ امریکہ کے یہ جاسوسی سیارے ڈیڑھ سو میل اوپر زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔ وہ مسلسل عراق کے بارے میں معلومات دیتے رہتے ہیں، خواہ موسمی حالات جو بھی ہوں۔ وہ نہ صرف اس وقت عراق کی تصویر لیتے ہیں جب کہ وہ براہ راست عراقی فضا کے اوپر ہوں بلکہ وہ مخصوص نظام کے تحت اس وقت بھی عراق کی تصویر حاصل کر لیتے ہیں جب کہ وہ کنارے کی طرف اڑ رہے ہوں۔

اس سیارے میں تین میٹر لمبی انفرارڈ دوربین لگی ہوئی ہے۔ جب اسکڈ میزائل چھوڑا جاتا ہے تو فضا میں اس کی سخت گرمی کے ذریعہ یہ سیارہ فوراً ہی اس کو معلوم کر لیتا ہے۔ اور عین اسی لمحہ زمین پر لگے ہوئے پیٹریٹ میزائل کو اس کی خبر دے دیتا ہے۔ اس کے بعد کمپیوٹر فوراً پیٹریٹ میزائل کو نشانہ کی طرف داغ دیتا ہے۔ میزائل فضا میں پہنچ کر اسکڈ سے ٹکرا کر اس کو عین راستہ میں برباد کر دیتا ہے۔ یہ سارا کام صرف ایک منٹ کے اندر انجام پاتا ہے۔ سٹیلائٹ کے ذریعہ جاسوسی کا خاص فائدہ یہ ہے کہ وہ دشمن کی مار کی حد سے پوری طرح محفوظ رہتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دفاعی سپورٹ کا یہ پورا سیاراتی نظام ۲۴ گھنٹے عراق کا جائزہ لیتا ہے اور اس کی تصویریں بھیجتا رہتا ہے۔ وہ ہر موسمی حالت میں یکساں طور پر کام کرتا ہے:

These Defence Support Programme satellites provide round-the-clock coverage of Iraq in all weather conditions.

یہ واقعہ تمثیل کے روپ میں یاد دلاتا ہے کہ اسی طرح ایک اور "آسمانی مشاہدہ" ہے جو زیادہ بڑے پیمانہ پر ساری دنیا کی نگرانی کر رہا ہے۔ وہ دونوں فریقوں کو یکساں طور پر دیکھ رہا ہے۔ وہ کسی ایک ملک کو نہیں بلکہ تمام ملکوں اور تمام انسانوں کا ہر لمحہ معائنہ کر رہا ہے۔

یہ وہ برتر مشاہدہ ہے جو خدائی نظام کے تحت قائم ہے۔ خدائی مشاہدہ کا یہ نظام اس لئے قائم کیا گیا ہے تاکہ وہ ظالم کے ظلم کا توڑ کرے، تاکہ وہ مجرم کے خلاف بروقت مداخلت کر کے اس کے مفسدانہ

منصوبہ کو ناکام بنائے اور جو شخص حق پر ہے اس کی مدد کرکے اسے کامیاب کر دے۔

جب بھی کوئی شخص کسی کے خلاف برا اقدام کرے تو اس کو جاننا چاہئے کہ اس کے اقدام کا ناکام ہو جانا یقینی ہے۔ اس کے برے اقدام کو خدا کے فرشتے درمیان ہی میں مداخلت کرکے بے اثر کر دیں گے۔ خدا کی دنیا میں کوئی فاسد منصوبہ کبھی اپنی تکمیل تک پہنچنے والا نہیں۔

موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ آزمائش کی مصلحت کی بنا پر یہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ ہر شخص کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ اس آزادی کی بنا پر کبھی ایک آدمی دوسرے آدمی کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

مگر یہ آزادی لامحدود نہیں ہے۔ آزادی دینے کے ساتھ خدا لوگوں کی نگرانی بھی کر رہا ہے۔ وہ کسی کو یہ موقع نہیں دیتا کہ وہ اپنی آزادی کو بے قید اور لامحدود انداز میں استعمال کرے۔ ایک حد کے بعد خدا آدمی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ ایک حد کے بعد وہ آدمی کو اس سے روک دیتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کو دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کرے۔

خدا کا وعدہ ہے کہ وہ مشکل کے وقت ضرور اپنے بندہ کی مدد کرتا ہے۔ کبھی مشکل پیش آنے کے بعد فوراً اور کبھی مشکل پیش آنے کے کچھ دیر بعد۔ خدا کی یہ مدد کبھی ایک صورت میں آتی ہے اور کبھی دوسری صورت میں۔ اس کی کوئی ایک مقرر اور متعین صورت نہیں۔

اس دنیا میں تمام انسان آسمانی نظام کے ماتحت ہیں۔ غلط کار لوگوں کو جاننا چاہیے کہ وہ اس آسمانی نگرانی سے محفوظ نہیں ہیں۔ اسی طرح نیک لوگوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ان کی نیکی ہرگز رائگاں جانے والی نہیں۔

آسمانی انتظام کے تحت جو مشاھدہ کیا جا رہا ہے اس کا جزئی مظاہرہ کبھی اسی دنیا میں دونوں کے حق میں کر دیا جاتا ہے۔ تاہم اس کا کلی مظاہرہ صرف آخرت میں ہونے والا ہے۔ آخرت میں ہر ایک کے قول و عمل کا ریکارڈ اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ تاکہ جب لوگوں کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہو تو ہر ایک یہ جان لے کہ اس کے موافق یا اس کے خلاف جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ اس کے اس کارنامہ کے عین مطابق ہے جو اس نے دنیا کے امتحانی مرحلہ میں انجام دیا تھا۔

فاطر السماوات والارض

بگ بینگ کا نظریہ ۱۹۲۷ میں جارجز لیمتری Georges Lemaitre نے پیش کیا۔ علماء فلکیات کے مشاہدہ میں آیا کہ کائنات چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اس لیے یہ سمجھا گیا کہ وہ کبھی سمٹی ہوئی تھی، پھر پھیلتے پھیلتے موجودہ وسعت تک پہنچی۔ ۱۹۶۵ میں بیک گراونڈ ریڈی ایشن (background radiation) کی دریافت سے اس کو مزید تقویت ملی۔ ۱۹۸۱ میں کائنات میں کچھ نئی کہکشاؤں کی دریافت نے اس نظریہ کو کچھ اور مستحکم کیا (Britannica II/10)

۱۹۹۱ اور اس کے آس پاس زمانہ میں امریکی سائنس دانوں نے مزید تحقیق کی۔ اب نئے حقائق کی روشنی میں بگ بینگ کا نظریہ علمی اعتبار سے پوری طرح ثابت شدہ سمجھا جانے لگا ہے۔ ان جدید تحقیقات کا خلاصہ مختلف جرنلوں میں شائع ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے حسب ذیل تین ماخذ ہیں:

Newsweek, New York, May 4, 1992
Time International, New York, May 4, 1992
The Times of India, New Delhi, April 25, 1992
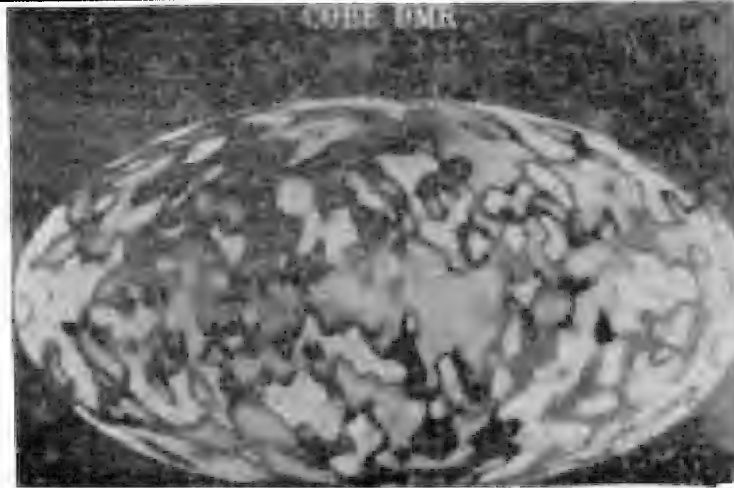
This photo released by NASA shows a microwave map of the whole sky made from one year of data taken by NASA's cosmic background explorer (COBE) differential microwave radiometers (DMR). A satellite on a 28-year space quest has made a momentous discovery that explains how the stars and galaxies evolved from the "big bang" that created the cosmos. —

زمین سے خلا کا مشاہدہ کرنے میں فضا کی کثافت حائل رہتی ہے۔ اس لیے مصنوعی سٹلائٹ کے ساتھ دوربینیں لگائی جاتی ہیں تاکہ وہ زمینی فضا سے اوپر جاکر خلا کا فوٹو لے سکیں۔ ۱۸ نومبر ۱۹۸۹ کو امریکہ کے ادارہ ناسا NASA نے ایک خصوصی سٹلائٹ اوپر بھیجا۔ اس کا نام Cosmic Background Explorer تھا۔ اس کی لاگت ۱۶۰ ملین ڈالر تھی۔ یہ ۵۶۰ میل اوپر جاکر زمین کے گرد گھومتا رہا۔

اس سٹلائٹ نے بالائی خلا کی جو تصویریں بھیجی ہیں، ان سے معلوم ہوا ہے کہ کائنات کے بیرونی حصہ میں لہردار سطح (ripples) موجود ہیں۔ یہ لہریں زمین سے ۱۵ بلین سال نور کی دوری پر واقع ہیں۔ سائنس دانوں کے تجزیہ کے مطابق، وہ بگ بینگ کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ قطعی طور پر ثابت کرتی ہیں کہ بگ بینگ جیسا معاملہ کائنات کے آغاز میں پیش آیا۔ یہ لہریں ثابت کرتی ہیں کہ کائنات خود سے نہیں بنی بلکہ ایک خالق کے تخلیقی عمل سے ظہور میں آئی۔ چنانچہ کیلی فورنیا یونی ورسٹی میں فزکس کے پروفیسر جویل پرائمیک (Joel Primack) نے کہا کہ یہ لہریں خدا کے ہاتھ کی تحریر ہے:

The ripples are no less than the handwriting of god.

بگ بینگ کے نظریہ کو سائنسی طور پر مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ خالص علمی سطح پر یہ ثابت ہو گیا کہ کائنات کے ابتدائی مادہ میں دھماکہ سے کائنات کا آغاز ہوا۔ بگ بینگ نے مزید یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دھماکہ خود کائنات اپنے قوانین کے تحت پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ دھماکہ یقینی طور پر کسی خارجی طاقت نے کیا۔ قرآن کے لفظوں میں ایک فاطر تھا جس نے کائنات کو پھاڑا۔ کیلی فورنیا یونی ورسٹی کے ایک اور پروفیسر جارج اسموٹ (George Smoot) نے کہا کہ اگر آپ مذہبی آدمی ہیں تو یہ خدا کو دیکھنے کی مانند ہے:

If you're religious, it's like looking to god.

قرآن میں خالق کے وجود پر یہ دلیل دی گئی تھی کہ کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین باہم جڑے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا (الانبیاء ۳۰) اس دلیل کو آج خود علم انسانی کی تصدیق حاصل ہو گئی ہے۔ کیونکہ کائنات کا ابتدائی مادہ (سپر ایٹم) فزیکل

قوانین کے تحت غیر معمولی شدت کے ساتھ اندرونی سمت میں کھنچا ہوا تھا۔ معلوم طبیعی اصول کے تحت اس کا بیرونی طرف سفر کرنا بالکل ناممکن تھا۔ لیکن بگ بینگ کا نظریہ ثابت کرتا ہے کہ ایک وقت خاص میں اس کے اندر دھماکہ ہوا اور ابتدائی مادہ کے اجزاء ناقابل قیاس تیزی کے ساتھ بیرونی سمت میں پھیلنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں موجودہ پھیلی ہوئی کائنات وجود میں آئی۔

یہ دھماکہ جو کائناتی مادہ کو خلاف قاعدہ طور پر بیرونی سمت میں چلا دے، وہ کسی خارجی مداخلت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ یہاں ایک خدا ہے جس نے کائناتی مادہ میں مداخلت کرکے اس کو پھیلتی ہوئی کائنات کی صورت دی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اعلان کیا تھا کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور خود لوگوں کے اندر بھی۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے) مذکورہ حقیقت بھی بلاشبہ انھیں حقیقتوں میں سے ایک ہے جو بعد کے زمانہ میں اس لیے ظاہر ہوئی کہ وہ قرآن کی صداقت کو لوگوں کے لیے خود ان کے معیار عقلی کے مطابق ثابت شدہ بنا دے۔

قرآن میں خدا کے وجود کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کیا گیا تھا کہ کائنات کا مادہ ابتداءً سختی کے ساتھ ملا ہوا اور جڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک وقت خاص پر اس کے اندر پھاڑنے کا عمل ہوا۔ اس کے نتیجہ میں کائنات خلا کی وسعتوں میں پھیلنے لگی۔ سمٹی ہوئی کائنات توسیع پذیر کائنات بن گئی۔

پھاڑنے کا یہ عمل لازمی طور پر ایک خارجی طاقت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ یہاں ایک ماورائے کائنات قوت ہے۔ اگر ایسی خارجی قوت موجود نہ ہوتی تو کائنات میں انفجار کا وہ عمل نہ ہوتا جس کو موجودہ زمانہ میں بگ بینگ نظریہ کی صورت میں دریافت کیا گیا ہے۔ فطر (پھاڑنے) کا جو عمل کائنات میں ہوا ہے، خود مادی کائنات میں ایسا کوئی قانون نہیں جو اس کی توجیہہ کر سکے۔ اس کی ایک ہی ممکن توجیہہ ہے، اور وہ فاطر کا عقیدہ ہے۔ کتاب الٰہی کے الفاظ موجودہ زمانہ میں مزید قوت کے ساتھ صحیح ثابت ہوئے ہیں ——— أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (ابراهیم ۱۰)

زندگی کا سوال

گریٹا گاربو (Greta Garbo) ۱۸ ستمبر ۱۹۰۵ کو سویڈن میں پیدا ہوئی، ۱۵ اپریل ۱۹۹۰ کو امریکہ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کو شہرت اور دولت (fame and money) کی تمنا تھی۔ اس کے لیے وہ فلمی دنیا میں گئی۔ یہاں اس کو اتنی کامیابی ملی کہ وہ فلمی دیوی (screen goddess) کہی جانے لگی۔

فلم نے گریٹا گاربو کو دولت اور شہرت دی۔ مگر اس نے اس کی اپنی شخصیت کو اس سے چھین لیا۔ وہ پوری طرح فلم کمپنی کے کنٹرول میں تھی۔ ایسا بال کاٹو، ایسا کپڑا پہنو، اس طرح بولو، اس طرح چلو۔ اس کے چہرے کو میک اپ کے ذریعہ بار بار بدلا جاتا۔ اس کی مسلسل مالش کی جاتی تاکہ اس کی جسمانی نزاکت باقی رہے۔ وغیرہ۔ ان چیزوں سے وہ اتنا گھبرا اٹھی کہ اپنی تنہائیوں میں اکثر وہ روتی اور چیختی۔ مگر وہ فلمی ذمہ داروں کے ہاتھ میں بالکل بے بس تھی۔

آخر کار ۱۹۴۱ میں اس نے فلمی زندگی کو مکمل طور پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد سے آخر عمر تک اس نے اپنے گھر کے اندر بالکل تنہا زندگی گزاری، یہاں تک کہ ۸۴ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ شہرت کی زندگی گمنامی کی موت پر ختم ہو گئی۔

گریٹا گاربو گم نام مرجانا چاہتی تھی۔ اینٹونی گرونو ویز نے بمشکل اس کو تیار کیا کہ وہ اس کو اپنی زندگی کے حالات لکھنے کی اجازت دے اور اس کو اپنے حالات بتائے۔ گریٹا گاربو نے سخت اصرار کے بعد اس شرط پر اجازت دی کہ اس کے بارہ میں جو کتاب لکھی جائے وہ اس کے مرنے کے بعد چھپے۔ اس طرح ایک کتاب تیار ہوئی۔ مگر مصنف کا انتقال ۱۹۸۵ میں ۷۱ سال کی عمر میں ہو گیا جب کہ گریٹا گاربو ابھی زندہ تھی۔ گریٹا گاربو کے مرنے کے بعد ۱۹۹۰ میں یہ کتاب امریکہ سے شائع کی گئی ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Garbo: Her Story by Antoni Gronowicz

ٹائمس آف انڈیا (۹ ستمبر ۱۹۹۰) میں اس کتاب کا ایک حصہ شائع ہوا ہے۔ اس کے مطابق گریٹا گاربو نے اپنی آخر عمر میں مصنف سے کہا:

I have lost a belief in people, in a God who put me in this situation without replying clearly to my questions. I am floating on the waters of life without direction, without a goal, without the knowledge of why and how long. (p. 15)

میں نے عوام میں اپنا یقین کھو دیا ہے۔ میں نے خدا میں بھی یقین کھو دیا ہے جس نے مجھے اس حال میں رکھا، بغیر اس کے کہ وہ میرے سوالات کا واضح جواب دے۔ میں زندگی کے پانی میں کسی سمت کے بغیر بہہ رہی ہوں۔ میری کوئی منزل نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ کیوں اور کب تک میرا یہ سفر جاری رہے گا۔

یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس نے خدا کو چھوڑ کر غیر خدا کو اپنا مرکز توجہ بنایا، پھر اس کو اس میں تسکین نہ مل سکی۔ یہاں تک پچاس سال بے چینی کی حالت میں رہ کر اس نے اپنی جان دے دی۔

گریٹا گاربو کا واقعہ ایک انتہائی انداز کا واقعہ ہے۔ مگر کم و بیش یہی واقعہ ہر ایک کے ساتھ پیش آ رہا ہے۔ ہر آدمی خدا کو چھوڑے ہوئے ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی غیر خدا کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ رہا ہے۔ مگر جب وہ اس کو پالیتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی طلب کا جواب نہ تھا۔ اس نے غلط فہمی میں ایک ایسی چیز کو اپنا مقصود و مطلوب بنا لیا جو حقیقۃً اس کا مقصود و مطلوب نہ تھا۔

ہر آدمی اس حوصلہ کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر شروع کرتا ہے کہ وہ اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ مگر جب منزل آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ منزل نہ تھی بلکہ ایک کھڈ تھا جس میں وہ اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو لیے ہوئے جا گرا۔

خدا کا شعور آدمی کے پورے وجود میں پیوست ہے، اس لیے ہر آدمی عین اپنے اندرونی تقاضے کے تحت خدا کا طالب رہتا ہے۔ مگر اکثر انسان دھوکے کی بنا پر کسی غیر خدا کو اپنا معبود بنا لیتے ہیں، وہ سراب کو پانی سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔

تاہم جو سچا طالب ہے وہ کبھی نامراد نہیں ہوتا۔ سچا طالب کبھی راستوں میں بھٹکتا نہیں۔ وہ غیر خدا کو خدا سمجھنے کی غلطی نہیں کرتا۔ اس کی سنجیدگی اور اس کی سچی طلب اس بات کی ضامن بن جاتی ہے کہ وہ راستوں کے پیچ و خم میں بھٹکے بغیر اپنے حقیقی خدا تک پہنچ جائے۔

کائنات کا نظام

کائنات پورے معنی میں ایک بامعنی کائنات ہے۔ اس کی ہر کارکردگی اپنے اندر مقصدیت لیے ہوئے ہے۔ کائنات کو آپ جس رخ سے بھی دیکھیں، وہ ایک منظم منصوبہ معلوم ہوگی نہ کہ الل ٹپ چیزوں کا کوئی بے ترتیب ڈھیر۔

مثال کے طور پر درخت کی ہری پتیوں میں ایک مادہ ہوتا ہے جس کا نام علم نباتات کی زبان میں کلوروفل (chlorophyll) ہے۔ قدرتی قانون کے تحت اس ہرے مادہ کے اندر ایک عمل واقع ہوتا ہے جس کو فوٹو سنتھیسس (photosynthesis) کہا جاتا ہے۔ یہ مادہ (کلوروفل) لائٹ انرجی کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لائٹ انرجی کی مدد سے وہ فضا میں پھیلی ہوئی لاکھوں ٹن کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنے اندر جذب کرتا ہے جو انسان کے لیے مضر ہے۔ اور پھر ایک نہایت پیچیدہ عمل کے ذریعہ اتنی ہی مقدار میں آکسیجن نکال کر باہر فضا میں پھیلا دیتا ہے جو انسان اور دوسرے جانداروں کی زندگی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ (۱۵/۲۹۰)

اسی طرح سورج میں اور بالائی فضا میں حکمت کے بے شمار پہلو ہیں۔ مثلاً سورج ایک بہت بڑا دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ وہ ہر ایک سکنڈ میں جو حرارت خارج کرتا ہے، اس حرارت کی مقدار دس لاکھ ایٹم بم سے بھی زیادہ ہے۔ یہ تمام حرارت اگر براہ راست زمین پر پہنچ جائے تو انسان اور تمام ذی حیات مخلوق مر جائے۔ مگر زمین کے اوپر اس کے چاروں طرف ہوا (مرکب گیسوں) کا غلاف ایک بے حد اہم کام کرتا ہے۔ وہ اس بے پناہ حرارت کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور اس حرارت کی اتنی ہی مقدار زمین تک پہنچنے دیتا ہے جو زندہ اشیاء کی بقا کے لیے ضروری ہو۔

کائنات کے نظام میں اس طرح کی اَن گنت حکمتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ انتہا حکمتیں بتاتی ہیں کہ یہ کائنات مختلف چیزوں کا کوئی الل ٹپ ڈھیر نہیں۔ وہ ایک انتہائی منظم کارخانہ ہے۔ یہ واقعہ خالق کے وجود کا ناقابل انکار ثبوت ہے۔

کسی مجموعہ میں نظم اور معنویت کا پایا جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہے۔ ناظم کے بغیر نظم اور معنویت کا پایا جانا ممکن نہیں۔

سائنس کے نام پر موجودہ زمانہ میں کچھ لوگوں نے خدا کا انکار کیا۔ مگر بڑے بڑے سائنس دانوں میں تقریباً تمام سائنس داں کسی نہ کسی طور پر خدا کے وجود کو مانتے تھے۔

رابرٹ بائل (Robert Boyle) مشہور سائنس داں ہے۔ وہ ۱۶۲۷ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۶۹۱ میں لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے سائنس کے مطالعہ کو اپنا موضوع بنایا۔ مگر سائنس کے مطالعہ نے اس کو مذہب سے دور نہیں کیا۔ بلکہ اور قریب کر دیا۔ آخر میں وہ پختہ قسم کا پروٹسٹنٹ عیسائی بن گیا۔ اس نے شادی نہیں کی اور اپنی تمام کمائی مسیحی مذہب کی تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔

رابرٹ بائل خدا کے وجود کو مانتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق، فطرت کا نظام ایک گھڑی کی مانند ہے۔ خدا نے اس کو پیدا کیا اور اس کو ابتدائی طور پر چلا دیا۔ اب وہ ثانوی قانون کے تحت عمل کر رہی ہے۔ جس کا سائنس کے ذریعہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

In his view of divine providence, nature was a clocklike mechanism that had been made and set in motion by the Creator at the beginning and now functioned according to secondary laws, which could be studied by science (3/97).

یہ بیسویں صدی سے پہلے کی سائنس تھی۔ اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات میں یکسانیت (uniformity) ہے۔ کائنات کے تمام اجزا یکساں قوانین کے تحت چل رہے ہیں۔ مگر بیسویں صدی میں پہونچ کر یہ نظریہ باقی نہ رہ سکا۔

کائنات کبیر (macrocosm) کے مطالعہ میں بظاہر یہ دکھائی دیا تھا کہ کائنات میں یکسانیت کی کارفرمائی ہے۔ مگر کائنات صغیر (microcosm) کے مطالعہ نے اس مفروضہ کو رد کر دیا۔ شمسی نظام کی سطح پر انسان کو جو یکسانیت نظر آتی تھی وہ ایٹم کی سطح پر پہونچ کر ٹوٹ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کو خدا ہی نے اپنے حکم سے بنایا ہے۔ اور وہی اپنے حکم سے اس کو چلا رہا ہے۔ نہ کائنات کو بنانے میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ کائنات کو چلانے میں کوئی اس کا شریک۔ ایک خدا کو چھوڑ کر جو نظریہ بھی کائنات کی توجیہہ کے لیے بنایا جاتا ہے وہ بالآخر ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ایک خدا کی توجیہہ ہی صحیح توجیہہ ہے۔ اس کے سوا ہر دوسری توجیہہ صرف انسان کا ذہنی مفروضہ ہے، اس کے باہر اس کا کوئی وجود نہیں۔

سب سے بڑی بدبختی

الاستاذ خوزی الرفاعی (حلب، سوریا) ایک سفر کے تحت اندلس گئے۔ وہاں انھوں نے غرناطہ میں الحمراء نامی محل دیکھا جو مسلم دورِ حکومت میں نہایت اہتمام کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں انھوں نے جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے :

هناك قصة منقوشة على الجدار۔ تس وی ان ساکا میکسیکیا یدعی (آر ی ایکاسا) جاء وزوجته لزيارة الحمراء وبينما كان يطوف مستغرقا فى دهشته مما يرى من مفاتن، رأى سائلا اعمى يتقدم من زوجته يطلب صدقة فقال لزوجته : اجزلى له العطاء يا امرأة فانه ليس فى الحياة اقسى من ان يكون المرء اعمى فى غرناطة (الدراسات الاسلامية، اسلام آباد، ۱۴۱۲ھ، صفحہ ۴۴۲)

وہاں ایک دیوار پر ایک قصہ لکھا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میکسیکو کا ایک سیاح جس کا نام آر ی ایکاسا تھا، وہ اپنی بیوی کے ساتھ الحمراء کو دیکھنے کے لیے یہاں آیا۔ اور جب کہ وہ اس کی کشش سے غیر معمولی متاثر ہو کر اس کو دیکھنے میں محو تھا، اس نے ایک اندھے فقیر کو دیکھا جو اس کی بیوی کے قریب ہو کر اس سے صدقہ مانگ رہا تھا۔ سیاح نے اپنی بیوی سے کہا کہ اے خاتون، اس کو خوب زیادہ دے دو۔ کیوں کہ دنیا میں اس سے بڑی بدبختی اور کوئی نہیں کہ آدمی غرناطہ میں اندھا ہو۔

مذکورہ سیاح کو یہ بات سب سے زیادہ بدبختی کی بات نظر آئی کہ ایک شخص الحمراء کے سامنے کھڑا ہو مگر وہ آنکھوں سے محروم ہونے کی بنا پر اس خوب صورت محل کو نہ دیکھ سکے۔ مگر ایک اور بدبختی ہے جو اس قسم کی تمام بدبختیوں سے زیادہ سخت ہے۔ اور یہ بدبختی وہ ہے جو آخرت میں پیش آئے گی۔ اس بدبختی کا ذکر قرآن کی ایک آیت میں اس طرح کیا گیا ہے :

ومن كان فى هذه اعمى فهو فى الآخرة اعمى واضل سبيلا (الاسراء ۷۲)

اور جو شخص اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا اور وہ بہت دور پڑا ہوگا راستہ سے۔

آخرت وہ عالم ہے جہاں اللہ رب العالمین اپنے تمام جمال و کمال کے ساتھ ظہور فرمائے گا۔ وہاں آدمی رب کائنات کو اسی طرح دیکھے گا جس طرح وہ موجودہ دنیا میں بدر کے چاند کو دیکھتا ہے۔ ایسی

حالت میں وہ شخص کتنا زیادہ بدبخت ہوگا جو اس ہستی کو دیکھنے سے محروم رہے جو ہر قسم کے جمال و کمال کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ امام احمد، امام مسلم اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے :

قال، اذا دخل اهل الجنةِ الجنةَ و اهل النارِ النارَ نادیٰ منادٍ : یا اهلَ الجنة إن لکم عند الله موعداً یرید ان ینجزکموه۔ فیقولون۔ وما هو۔ الم یثقل موازیننا، الم یبیض وجوهنا، و یدخلنا الجنة و یجرنا من النار۔ قال۔ فیکشف لهم الحجاب فینظرون الیه۔ فو الله ما اعطاهم الله شیئاً احب الیهم من النظر الیه ولا اقر لاعینهم۔
(تفسیر ابن کثیر ۲/۴۱۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکے ہوں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ اے اہل جنت، تمہارے لیے اللہ کا ایک وعدہ ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کو تمہارے لیے پورا کرے۔ اہل جنت کہیں گے کہ وہ کیا ہے۔ کیا ہمارے پلڑے بھاری نہیں کر دیے گئے۔ کیا ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا گیا۔ اور اللہ نے ہم کو جنت میں داخل کر دیا اور ہم کو آگ سے بچا لیا۔ اس کے بعد ان کے اوپر سے پردہ کھول دیا جائے گا، پھر وہ اپنے رب کو دیکھنے لگیں گے۔ پس خدا کی قسم، کوئی نعمت جو اللہ نے انھیں دی ہے وہ ان کے لیے اللہ کو دیکھنے سے زیادہ محبوب نہ ہوگی اور نہ اس سے زیادہ ان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے والی۔

آخرت میں دیدار الٰہی کی نعمت بلا شبہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ اللہ کو دیکھنا ایک ایسا اعلیٰ و ارفع تجربہ ہے جس کے مثل کوئی دوسرا تجربہ نہیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آخرت میں اس نعمت کبریٰ سے سرفراز کیے جائیں۔ اور کتنے بدبخت ہیں وہ لوگ جو آخرت میں اس حال میں پہنچیں کہ وہاں انھیں یہ خبر ملے کہ دیدار الٰہی کی نعمت سے بہرہ مند ہونا ان کے لیے مقدر نہیں۔

اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہوگی کہ آدمی خالق کائنات کو دیکھنے کے لیے اندھا ہو جائے۔

لامتناہی سفر

ایک ہندستانی سائنس داں ڈاکٹر جینت نارلیکر (Jayant V. Narlikar) نے ایک مضمون شائع کیا ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ سائنس کا علم ایک ایسا علم ہے جس میں اضافہ اور ترقی کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ اس کی خاص وجہ علما، سائنس کا سائنسی نقطۂ نظر (scientific outlook) ہے۔

سائنسی نقطۂ نظر میں ساری توجہ کائنات پر ہوتی ہے نہ کہ کسی خاص سائنس داں پر۔ کسی سائنس داں نے کیا کہا ہے، یہ سائنس میں ایک اضافی چیز ہے۔ اصل یہ ہے کہ مطالعہ کے ذریعہ کائنات کے بارہ میں کیا چیز دریافت ہوئی ہے۔ سائنس میں اگر سائنس داں معیار ہوتے تو سائنس کا علم ایک مقام پر رک جاتا۔ کیوں کہ سائنس داں ایک انسان ہے، اور انسان کا علم محدود ہوتا ہے۔ مگر جب سائنس دانوں نے کائنات کو معیار بنایا جو اتھاہ حقیقتوں کا مجموعہ ہے تو ان کی کھوج جاری رہی اور اسی کے ساتھ نئی دریافتوں کا سلسلہ بھی۔

ڈاکٹر نارلیکر لکھتے ہیں کہ اس طرح کوئی مانا ہوا سائنسی نظریہ اگر غلط ثابت ہو جائے تو یہ سائنس داں کے لیے بے حد جوش آفریں واقعہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت نے انسان کو اس لائق سمجھا کہ وہ اس کے رازوں میں سے ایک اور راز کو سمجھ سکے:

Thus the disproof of a well-established scientific theory is regarded as a very exciting event by the scientist. It means that Nature has considered man to have matured enough to appreciate yet one more of her bag of secrets.

اس معاملہ میں اگر آپ سائنس داں کا تقابل آج کے مذہبی انسان سے کریں تو آپ دونوں میں بنیادی فرق پائیں گے۔ سائنس داں کے فکر میں اضافہ ہو رہا ہے اور مذہبی انسان صرف فکری جمود میں مبتلا ہے۔ چنانچہ سائنسی علم ہر روز ترقی پر ہے، مذہبی علم یکساں حالت میں پڑا ہوا ہے۔ سائنس میں تخلیقیت ہے اور مذہب میں صرف تقلید۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس داں کے سامنے وسیع کائنات ہے جو ہر روز اس پر نئی حقیقت کا انکشاف کر رہی ہے۔ اس کے سامنے اپنے جیسے سائنسداں نہیں جن کا سرمایہ علم ہمیشہ محدود ہوتا ہے۔

مذہبی انسان کا مرکز توجہ اگر خدا ہوتا تو اس پر بھی مسلسل نئی حقیقتوں کا انکشاف ہوتا رہتا۔ کیونکہ خدا اپنی ذات میں ایک اتھاہ وجود ہے۔ خدا کے بارہ میں فکری سفر کی کوئی حد نہیں۔ آدمی خدا کے بارہ میں جتنا زیادہ سوچے گا اتنا ہی زیادہ اس پر تجلیات الٰہی کا انکشاف ہوگا۔

سائنس مخلوقات میں غور وفکر کا علم ہے، اور اس علم میں اتنا زیادہ ارتقائی امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ پھر مذہب تو خالق کے بارہ میں غور وفکر کا علم ہے۔ ایسی حالت میں علم خداوندی کے ارتقائی امکانات تو لامحدود درجہ تک اس سے زیادہ ہونے چاہئیں۔

اس کے باوجود مذہبی علم میں ترقی کیوں نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ مذہبی انسان کا مرکز توجہ خدا ہے ہی نہیں۔ موجودہ مذہبی انسان کا مرکز توجہ صرف اس کے اکابر ہیں۔ اس نے خود اپنے مزعومات کے تحت اپنے کچھ افراد کو اکابر کا درجہ دے دیا ہے۔ خدا کی کتاب اب ان کے یہاں محض لفظی تلاوت کے لیے ہے۔ اپنے اکابر کے ملفوظات اور ارشادات کے سوا اسے کسی اور چیز کی خبر ہی نہیں۔ یہ لوگ محدود انسان میں اٹک گئے ہیں، پھر لامحدود خدا کا فیض کس طرح انھیں حاصل ہوسکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ مذہبی انسان کا دین خدا پرستی نہیں ہے بلکہ اکابر پرستی ہے۔ اور یہی اس طبقہ کی فکری پس ماندگی کا اصل سبب ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان ایک اضافہ پذیر چیز ہے (الانفال ۲) ایک انسان جب اللہ پر ایمان لاتا ہے تو اس کا ایمان ایک حالت پر ٹھہرا ہوا نہیں رہتا، وہ برابر بڑھتا ہے۔ وہ ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے۔

ایمان کیا ہے۔ ایمان اللہ کی معرفت ہے۔ اللہ ایک لامحدود ہستی ہے۔ اس کے جلوے اور اس کے کمالات کی کوئی حد نہیں۔ انسان اپنی محدودیت کی بنا پر صرف جزئی طور پر ہی اللہ کا ادراک کر پاتا ہے۔ مگر انسان جب اللہ کا اقرار کرکے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتا ہے تو اللہ اپنی رحمتوں سے ایک کے بعد ایک اس پر اپنے جلوؤں کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح آدمی کی معرفت الٰہی بڑھتی رہتی ہے۔ وہ نئی نئی دریافتوں کے ایک لامتناہی سفر کا مسافر بن بن جاتا ہے۔

سجدۂ فطرت

اس صفحہ کے نیچے ایک تصویر دی جا رہی ہے۔ اس میں ایک آدمی "سجدہ" کی حالت میں نظر آتا ہے۔ مگر یہ مسجد کا یا نماز کا سجدہ نہیں ہے بلکہ فطرت کا سجدہ ہے۔ یہ ہندستانی پارلیمنٹ کے نئے ممبر سباش چندر نایک ہیں۔ ۹ جولائی ۱۹۹۱ کو جب وہ پہلی بار پارلیمنٹ ہاؤس پہنچے تو اس کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ان کے اندر غیر معمولی طور پر احترام کا جذبہ ابھرا۔ وہ بے تابانہ طور پر پارلیمنٹ کے سامنے سجدہ کی مانند گر پڑے۔

سجدہ کی حالت آخری سپردگی کی حالت ہے۔ انسان کے اندر جب کسی چیز کے لئے تسلیم و سپردگی کا جذبہ کامل طور پر پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس چیز کے آگے ڈال دینا چاہتا ہے، اس وقت اس کا جسمانی وجود جس آخری حالت میں ڈھل جاتا ہے وہی سجدہ ہے۔ سجدہ کی حالت سپردگی کی آخری حالت ہے۔ اس کے بعد عملی سپردگی کا اور کوئی درجہ نہیں۔ سجدہ کی حالت میں اپنے آپ کو پہنچا کر انسان اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو آخری حد تک حوالہ کیے جانے والے کے حوالہ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی انسان کے اندر کامل سپردگی کی خواہش ابھرتی ہے تو وہ فوراً سجدہ

Mr Subash Chandra Nayak, Congress MP from Orissa, a first timer in the Lok Sabha, kneels down in symbolic respect to Parliament House, on Tuesday. —TOI

کی حالت میں گر جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ ہے۔

مطبوعہ تصویر ٹائمس آف انڈیا (۱۰ جولائی ۱۹۹۱) کے فوٹو گرافر نے دسویں لوک سبھا کی حلف برداری کی تقریب کے موقع پر کھینچی تھی۔ اس دن اسپیکر کی جانب سے نو منتخب ممبران کو حلف دلاکر دسویں لوک سبھا کی باضابطہ تشکیل کی گئی تھی۔ لوک سبھا میں ۵۰۷ منتخب شدہ ممبر ہیں۔ ان میں سے آدھے ممبران نئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک مسٹر سباش چندر نایک ہیں۔ وہ جب نئی دہلی کے پرعظمت پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے پہنچے اور اس میں داخل ہونے لگے تو وہ واقعہ گزرا جس کو اخباری رپورٹر کے کیمرہ نے ریکارڈ کرلیا۔ پارلی منٹ کے عظمت و تقدس کا احساس ان پر اس طرح طاری ہوا کہ وہ اس کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

"سجدہ" انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ انسان کا پورا وجود اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ کسی کے آگے سجدہ میں گر جانا چاہتا ہے۔ آدمی کے اندر فطری طور پر یہ احساس چھپا ہوا موجود ہے کہ "تو بڑا ہے، میں چھوٹا ہوں" یہ اندرونی احساس جب شدت اختیار کرکے ظاہری ہیئت میں ڈھل جائے تو اسی کا نام سجدہ ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ میں نے جن اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے بنایا ہے (الذاریات ۵۶) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر عبادت اور سجدہ گزاری کا جو جذبہ چھپا ہوا ہے وہ اصلاً خالق کے لئے ہے۔ اس کا صحیح استعمال یہ ہے کہ آدمی خداوند رب العالمین کا ساجد بن جائے۔ مگر جو لوگ خدا کو پائے ہوئے نہ ہوں وہ اپنی بے خبری کی بنا پر کسی غیر خدا کے سجدہ گزار بن جاتے ہیں۔

اس واقعہ سے مزید یہ بات معلوم ہوئی کہ توحید کی دعوت ایک ایسی دعوت ہے جس کا آدھا مرحلہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔ انسان اپنی پیدائشی فطرت کے تحت پیشگی طور پر اپنے اندر یہ آمادگی لئے ہوئے ہے کہ وہ کسی برتر ہستی کے آگے اپنے آپ کو جھکادے۔ اب داعیان حق کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ انسان کو یہ بتادیں کہ تمہاری فطرت جس ہستی کے آگے جھکنا چاہتی تھی وہ ہستی دراصل تمہارا خالق ہے۔

اس معاملے میں فارسی شاعر کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے کہ جنگل کے تمام ہرن اپنا سر ہتھیلی پر لئے ہوئے اس انتظار میں ہیں کہ تو آئے اور ان کا شکار کرے:

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف   بہ امید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

سائنس کی واپسی

ایک درخت جس کی جڑ کٹی ہوئی ہو، اس کو زمین میں لگائیں تو پہلے دن وہ بظاہر ہرا بھرا دکھائی دے گا۔ مگر اگلے ہی دن اس کی پتیاں مرجھانا شروع ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ وہ سوکھ کر ختم ہو جائے گا۔ یہی حال موجودہ زمانہ میں الحاد اور انکار مذہب کا ہوا ہے۔ ابتدا میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مذہب کا دور ختم ہو گیا، اور اب انسانی تاریخ ہمیشہ کے لیے لامذہبیت کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ مگر جلد ہی یہ تمام خیالات بکھر گئے۔ مذہب نئی طاقت کے ساتھ دوبارہ انسانی زندگی میں لوٹ آیا۔

انیسویں صدی کے آخر تک علمی دنیا میں اس چیز کا زور تھا جس کو پرجوش طور پر علمی الحاد (Scientific atheism) کہا جاتا ہے۔ مگر بیسویں صدی میں سائنس میں جو نئی تحقیقات ہوئیں، انھوں نے علمی الحاد کو بے زمین کرنا شروع کر دیا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں سر جیمز جینز نے اعلان کیا تھا کہ جدید سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے، وہ مشینی توجیہہ (Mechanical interpretation) کو قبول کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ اب اس صدی کے آخر میں نظریاتی طبیعیات دانوں (Theoretical physicists) کی بڑی تعداد ایسی پیدا ہو گئی ہے جو کائنات کی تشریح ایسے انداز میں کر رہی ہے جس کے مطابق، خدا کو مانے بغیر کائنات کی توجیہہ ممکن نہیں۔

اس سلسلہ میں ۱۹۸۸ میں ایک قابل ذکر کتاب چھپی ہے۔ یہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا نام اور مصنف کا نام حسب ذیل ہے:

Stephen W. Hawking, *A Brief History of Time*

بگ بینگ (Big bang) نظریہ کہتا ہے کہ کائنات اپنے آغاز سے اب تک ایک خاص رفتار سے مسلسل پھیل رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اسٹیفن ہاکنگ نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ کائنات کے پھیلنے کا یہ عمل نہایت سوچا سمجھا (Well-calculated) ہے۔

رفتار توسیع کی ابتدائی شرح حد درجہ صحت کے ساتھ مقرر کی گئی ہے۔ کیوں کہ رفتار توسیع کی یہ شرح اس نازک شرح (critical rate) کے انتہائی قریب ہے جو کائنات کو دوبارہ انہدام (Recollapse)

سے بچانے کے لیے ضروری ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گرم بگ بینگ کا ماڈل درست ہے اور اسی سے وقت کا آغاز ہوا ہے تو کائنات کی ابتدائی حالت حد درجہ احتیاط کے ساتھ منتخب کی گئی ہو گی ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک کائنات پھٹ کر ختم ہو چکی ہوتی ۔

اس مظہر کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی جب تک یہ نہ مانا جائے کہ کائنات کی توسیع کی شرح رفتار (Rate of expansion) حد درجہ احتیاط کے ساتھ منتخب کی گئی ہے ۔

اسٹیفن ہاکنگ نے اس قسم کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ کائنات کیوں ٹھیک اس انداز پر شروع ہوئی ، اس کا جواب دینا انتہائی مشکل ہوگا سوا اس کے کہ یہ مانا جائے کہ یہ خدا کا عمل ہے جس نے چاہا کہ وہ ہمارے جیسی مخلوق کو یہاں پیدا کرے :

It would be very difficult to explain why the universe should have begun in just this way, except as the act of a God who intended to create beings like us (p. 134).

کائنات کی ایک حیرت ناک صفت یہ ہے کہ وہ خدائی تعبیر کے سوا کسی اور تعبیر کو قبول نہیں کرتی ۔ کائنات ایک معلوم اور مشہود واقعہ ہے ۔ اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں بہترین دماغ اس کی تشریح و تعبیر میں مصروف رہے ہیں ۔

کسی نے کہا کہ کائنات ہمیشہ سے اسی طرح ہے ۔ کسی نے کہا کہ وہ اپنے آپ ہی اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے ۔ کسی نے کہا کہ اسباب و علل کا ایک سلسلہ ہے جس نے کائنات کی تمام چیزوں کو وجود دیا ہے ۔ کسی نے اصول ارتقاء کو کائنات کا خالق ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ وغیرہ

مگر خود انسانی معلومات ان تمام تشریحات و توجیہات کو رد کرتی رہیں ۔ کائنات کے نظام کے بارہ میں انسان جتنا زیادہ واقفیت حاصل کرتا ہے ۔ اتنا ہی زیادہ یہ بات بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک ایک خدائے ذوالجلال کے سوا کوئی اور ہو ۔

کائنات اپنے وجود کے ساتھ یہ گواہی دیتی ہے کہ اس کا خالق خدا ہے ۔ خدا کے سوا کسی اور کو خالق کائنات بتانا صرف ایک بے بنیاد دعویٰ ہے ۔ جس کے حق میں کوئی حقیقی ثبوت موجود نہیں ۔ اس سلسلہ میں جتنے دعوے یا مخالفانہ نظریے پیش کیے گیے ، وہ خود علم انسانی کی روشنی میں غلط اور بے بنیاد ثابت ہو گئے ۔

فطرت کا تقاضا

موجودہ زمانہ میں جن مغربی محققین نے مذہب کا علمی مطالعہ کیا، انھوں نے عام طور پر یہ خیال قائم کرلیا کہ مذہب پہلے شرک کی صورت میں پیدا ہوا، اس کے بعد توحید کا عقیدہ آیا۔ اس مفروضہ کا سبب تاریخ کے بارہ میں ارتقائی تصور تھا۔ اپنے ارتقائی ذہن کے تحت انھوں نے سوچا کہ مذہب نے ارتقار کے انداز میں سفر کیا ہوگا۔ پھر اس "ہوگا" کو "ہے" مان کر انھوں نے کہدیا کہ مذہب کا سفر ارتقائی انداز میں ہوا ہے۔ کائناتی مظاہر میں تعدد کو دیکھ کر ابتدائی انسان نے سمجھ لیا کہ خدائی میں بھی تعدد ہے۔ پھر جب علم بڑھا تو تعدد نے توحید کی صورت اختیار کرلی۔

مگر بعد کی زیادہ گہری تحقیقات نے اس نظریہ کی غلطی واضح کردی۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے توحید (Monotheism) کے زیر عنوان لکھا ہے کہ یہ فرض کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ مذہب کی تاریخ میں کئی خداؤں کا تصور پہلے آیا اور ایک خدا کا تصور بعد کو پیدا ہوا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی تاریخی مواد موجود نہیں ہے کہ ایک نظام عقائد دوسرے نظام عقائد کے مقابلہ میں زیادہ پرانا ہے، اگرچہ بہت سے اہل علم یہ مانتے ہیں کہ توحید مذہب کی اعلیٰ صورت ہے اور اس لیے بعد کو ظہور میں آئی، یہ فرض کرتے ہوئے کہ جو اعلیٰ ہے اسے بعد کو آنا چاہیے:

> There is no valid reason to assume that monotheism is a later development in the history of religions than polytheism. There exists no historical material to prove that one system of belief is older than the other, although many scholars hold that monotheism is a higher form of religion and, therefore, must be a later development, assuming that what is higher came later (12/381).

صحیح یہ ہے کہ توحید مذہب کی اصلی صورت ہے اور شرک مذہب کی بگڑی ہوئی صورت۔ لیکن مغربی علمار نے اپنے ارتقائی مفروضہ کے تحت یہ سمجھ لیا کہ شرک مذہب کی ابتدائی صورت ہے، اور توحید اس کی تکمیلی صورت۔ اس غلط مفروضہ کی بنا پر ان کا پورا نظریۂ مذہب غلط ہوگیا۔

توحید کو اصل اور شرک کو بگاڑ سمجھئے تو مذہب کی ایک شکل بنتی ہے، اور اگر توحید کو تکمیل اور شرک کو آغاز سمجھئے تو اس سے بالکل مختلف دوسری شکل۔

قرآن نیز حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور مذہب کا عقیدہ انسان کے لیے کوئی خارجی چیز نہیں۔ وہ عین فطرت انسانی کی آواز ہے۔ وہ پیدائشی طور پر انسانی فطرت میں اس طرح پیوست ہے کہ انسانی فطرت کو کسی بھی طرح مذہبی عقیدہ سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

تاہم قدیم زمانہ میں یہ بات خالص علمی اعتبار سے ثابت شدہ نہیں بنی تھی۔ کیوں کہ قدیم زمانہ میں تمام انسان کسی نہ کسی طور پر خدا اور مذہب کو مانتے تھے۔ اس زمانہ میں ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے درمیان اختلافات ضرور پیدا ہوئے۔ مگر پوری قدیم تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی گروہ یہ دعویٰ لے کر اٹھے کہ خدا اور مذہب کا عقیدہ بے بنیاد عقیدہ ہے اور اس کے اس دعویٰ کو انسان کی کوئی جماعت تسلیم کر لے۔

یہ صرف انیسویں صدی عیسوی کی بات ہے کہ دنیا میں ایسے مفکرین اٹھے جو اس بات کے مدعی تھے کہ خدا اور مذہب کا عقیدہ ایک بے بنیاد عقیدہ ہے۔ وہ انسان کی ضرورت نہیں۔ اور انسان کی فطرت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ دراصل ماحول کا اثر ہے جو کسی کو مذہبی انسان بنا دیتا ہے نہ کہ اندرونی فطرت کا تقاضا۔

اس نظریہ کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ "آزاد دنیا" میں اس کو فکری طور پر اور اشتراکی دنیا میں اس کو عملی طور پر اختیار کر لیا گیا۔ جن ملکوں میں اشتراکی نظام قائم ہوا وہاں باقاعدہ سرکاری جبر کے تحت مذہب کا خاتمہ کر دیا گیا۔ مذہبی لٹریچر کی اشاعت پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی اور پورا تعلیمی نظام اس طرح بنایا گیا جس میں خدا اور مذہب کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ حتیٰ کہ ایک پورا محکمہ صرف اس مقصد کے لیے قائم کیا گیا کہ وہ تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے مذہب کے خلاف پروپیگنڈا کرے۔

سوویت روس اس معاملہ میں سب سے زیادہ آگے تھا۔ مگر ستر برس سے زیادہ مدت تک حکومت کی مشینری مذہب کے خلاف استعمال کرنے کے باوجود وہاں مذہب کا خاتمہ نہ ہوسکا۔ حکومت کی پالیسی اس حد تک بدل چکی ہے کہ جہاں اسلام کی کتاب پڑھنا بھی ممنوع تھا وہاں اب خود سرکاری ذرائع کے تحت اسلام کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ مکہ کے العالم الاسلامی (۲۷ دسمبر ۱۹۹۳) کی ایک خبر کے مطابق، ماسکو ریڈیو ہر روز دو گھنٹہ تک اسلامی پروگرام نشر کرتا ہے۔

کون کنٹرول کرے

سر جولین ہکسلے کی ۲۰۰ صفحہ کی ایک کتاب ہے جس کا نام "مذہب بغیر الہام" ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مذہب (بمعنی انسانی طریقہ) الہام خداوندی کی بنیاد پر قائم کرنے کا دور ختم ہو گیا۔ اب انسان خود اپنا مذہب بنا رہا ہے۔ اس مذہب کی بنیاد عقل (ریزن) پر ہے۔ اور اس کا نام ہیومنزم ہے۔

مصنف کے نقطۂ نظر کا خلاصہ اس کے ان الفاظ میں ہے کہ ——— موجودہ زمانہ میں انسان نے بڑی حد تک خارجی فطرت کی طاقتوں کو جاننے، ان کو کنٹرول کرنے اور ان کو استعمال کرنے کی بابت سیکھ لیا ہے۔ اب اس کو خود اپنی فطرت کی طاقتوں کو جاننے اور ان کو کنٹرول کرنے اور ان کو استعمال کرنے کی بابت سیکھنا ہے :

Man has learnt in large measure to understand, control and utilize the forces of external nature: he must now learn to understand, control and utilize the forces of his own nature (p. 170).

Sir Julian Sorell Huxley (1887-1975)
Religion Without Revelation,
Pitman Publishing Limited, London, 1979

یہی موجودہ زمانہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ملحدین کا عام نظریہ ہے۔ مگر یہ لفظی تک بندی کے سوا اور کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خارجی مادہ کو کنٹرول کرنا جتنا ممکن تھا، اتنا ہی یہ ناممکن ہے کہ انسان خود اپنی فطرت کو کنٹرول کرے۔

مادہ خود اپنے آپ کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ اسی طرح انسان بھی خود اپنے آپ کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ انسان کے لیے مادہ کو کنٹرول کرنا اس لیے ممکن ہوا کہ انسان کو اپنے دماغ کی بنا پر مادہ کے اوپر بالاتری حاصل تھی۔ اسی طرح انسان کو وہ ہستی کنٹرول کر سکتی ہے جس کو انسان کے اوپر بالاتری حاصل ہو۔ کوئی برابر اپنے برابر کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔

انسان کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک برتر خدا کا عقیدہ درکار ہے۔ برتر خدائی عقیدہ کے سوا کوئی چیز نہیں جو انسان کو قابو میں رکھ سکے۔

برتر خدا کا عقیدہ کس طرح انسان کو کنٹرول کرتا ہے، اس کا راز ایک لفظ میں خداشناسی ہے۔ انسان جب خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ جب خدا کے مقابلہ میں اس کو اپنی عبدیت کا ادراک ہوتا ہے تو اس کے بعد اس کے اندر وہ حقیقت پسندی پیدا ہوتی ہے جو اپنے آپ اس کو سنجیدہ بنا دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس کو اپنی ضرورت سمجھنے لگتا ہے کہ وہ خدا کی عظمت کا اعتراف کرے اور اس کا فرماں بردار بن کر دنیا میں زندگی گزارے۔

زمین و آسمان کو ہر آدمی دیکھتا ہے۔ مگر جب خداشناس آدمی زمین و آسمان کو دیکھتا ہے تو اس کا مشاہدہ اس کے لیے نصیحت کی عظیم کتاب بن جاتی ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے آپ اپنے کو دور خلا میں لے جائیے اور چشم تصور سے اس زمین کو دیکھئے جس پر آپ رہتے ہیں، اور جس کے اوپر آپ اپنی صبح و شام گزارتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک بہت بڑا گولا جس کی جسامت ۲۵ ہزار میل ہے، وہ انتہائی نظم اور پابندی کے ساتھ بیک وقت دو قسم کی گردش میں مصروف ہے۔ ایک طرف وہ اپنے محور پر لٹو کی طرح گھوم رہا ہے، اور اسی کے ساتھ وہ سورج کے گرد مداری گردش کر رہا ہے۔ پہلی گردش ۲۴ گھنٹہ میں پوری ہوتی ہے اور دوسری گردش ایک سال میں۔ یہ دونوں گردشیں اتنی زیادہ منظم ہیں کہ ہزاروں سال کے بعد بھی ان میں ایک سکنڈ کا فرق واقع نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص پوری سنجیدگی کے ساتھ اس خلائی واقعہ کا ادراک کرے تو اس کی زندگی میں اچانک زبردست انقلاب آجائے گا، وہ سوچے گا کہ جس زمین کے اوپر انسان کھڑا ہوا ہے وہ زمین آخری حد تک خدا کے اوپر منحصر ہے، پھر انسان اس زمین کے اوپر کیسے آزاد ہو سکتا ہے۔

جس زمین پر آدمی اپنے بارہ میں غلط فہمی میں پڑ کر خدا کا باغی بنتا ہے وہ زمین خود آخری حد تک خدا کی مطیع بنی ہوئی ہے۔ جس زمین پر آدمی اپنے کو محفوظ سمجھتا ہے وہ زمین خود آخری حد تک غیر محفوظ حالت میں ہے۔ جس زمین پر آدمی اپنی خودمختاری کا اعلان کرتا ہے وہ زمین خود سراپا عاجزی اور بے اختیاری کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ جس زمین پر آدمی اپنے لیے یقینی مستقبل کی بات کرتا ہے اس زمین کا حال یہ ہے کہ اس کا مستقبل ایک لمحہ کے لیے بھی یقینی نہیں۔

ایک اور آواز

جب ایک انسان بول رہا ہو اور آپ اس کی بات سن رہے ہوں تو یہ کوئی سادہ واقعہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک انتہائی انوکھا واقعہ ہوتا ہے جو ہماری زمین پر پیش آتا ہے۔ ایک شخص کا بولنا اور دوسرے شخص کا سننا اپنے اندر اتنی زیادہ نشانیاں رکھتا ہے کہ آدمی اگر اس پر سوچے تو وہ حیرت کے سمندر میں غرق ہو جائے۔

ایسا عجیب واقعہ کیوں ہوتا ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے تاکہ انسان ایک عظیم تر حقیقت کو محسوس کر سکے۔ وہ انسانی کلام کے ذریعہ خدائی کلام کو اپنے تصور میں لائے۔

جس طرح ایک انسان بولتا ہے اور آپ سنتے ہیں۔ اسی طرح خدا بھی بول رہا ہے۔ وہ بھی انسانوں سے ہم کلام ہے۔ جو شخص انسان کی بات سنے مگر وہ خدا کی بات نہ سنے وہ بہرا ہے۔ آدمی کو کان اس لیے دیئے گئے تھے کہ وہ خدا کی بات سننے والا بنے۔ مگر اس کا حال یہ ہوا کہ انسانوں کی بات اس کو سنائی دی، مگر خدا کی بات اس کو سنائی نہ دی۔ ایسا شخص یقیناً بہرا ہے، اس کے بہرا ہونے میں کوئی شک نہیں۔ خواہ بظاہر وہ کان والا کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

انسان کی ہر چیز خدا کے لیے ہے۔ اس کو کان اس لیے دیئے گئے تھے کہ وہ خدا کی بات سنے۔ کان کے اندر دوسری آوازوں کو سننے کی صلاحیت صرف اس لیے دی گئی تھی کہ اس کو قریبی تجربہ سے معلوم ہو جائے کہ وہ " سننے " کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر جو چیز صرف ابتدائی تجربہ کے لیے تھی۔ اسی کو اس نے آخری تجربہ سمجھ لیا۔ وہ راستہ میں اٹک کر رہ گیا، وہ اصل منزل تک نہیں پہونچا۔

انسان کی بات کو سننا اور خدا کی بات کو نہ سننا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص پھل کا چھلکا کھائے اور اس کا مغز پھینک دے۔ وہ دئے کی روشنی کو روشنی سمجھے، مگر سورج کی روشنی کا روشنی ہونا اس کے لیے لامعلوم بنا رہے۔

ایسا آدمی بلاشبہ اندھا ہے، خواہ اس کے سر پر دو آنکھیں موجود ہوں۔ خواہ دنیا کے رجسٹر میں اس کا نام دیکھنے والوں کی فہرست میں لکھا ہوا ہو۔

عظمتِ قرآن

ارشاداتِ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ بہت مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ انصاف کے دن کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا۔ ان کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا، اور نہ ان لوگوں کا راستہ جو راستہ سے بھٹک گئے (الفاتحہ)

لوگو، عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تم کو اور تم سے قبل والوں کو پیدا کیا تاکہ تم بچ جاؤ۔ وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنا دیا۔ اور اوپر سے پانی برسایا۔ پھر تمہاری غذا کے لیے ہر طرح کی پیدا وار نکالی۔ پس تم کسی کو اللہ کا برابر نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو (البقرہ ۲۱-۲۲)

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کو تھامے ہوئے ہے۔ اس کو نہ اونگھ لگتی اور نہ نیند آتی۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے سب کا اسے علم ہے۔ اس کے علم کے کسی گوشہ پر بھی کوئی شخص حاوی نہیں ہو سکتا مگر وہ جو چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین پر چھایا ہوا ہے۔ ان کی نگہبانی اس کے لیے تھکا دینے والا کام نہیں۔ وہی سب سے اوپر ہے، وہی سب سے بڑا (البقرہ ۲۵۵)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا ہے۔ اور تم کو ہماری طرف پلٹنا نہیں ہوگا۔ پس برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی، کوئی اس کے سوا معبود نہیں۔ وہ مالک ہے عرش عظیم کا۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے تو اس کے پاس اس کے لیے کوئی دلیل نہیں۔ اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ ایسے منکر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اور کہو کہ اے ہمارے رب، ہماری مغفرت فرما اور ہم پر رحم کر تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (المومنون ۱۱۵- ۱۱۸)

اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے الجھیں تو وہ کہہ دیتے ہیں تم کو سلام۔ اور جو اپنے رب کے حضور سجدہ اور قیام میں رات گزارتے ہیں۔ اور جو

کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا لے، اس کا عذاب تو لپٹ جانے والا ہے۔ وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے اور برا مقام۔ اور جو خرچ کرتے ہیں تو وہ نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔ اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اور وہ اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ وہ زنا کرتے ہیں۔ اور جو کوئی یہ کام کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ قیامت کے دن اس کو دہرا عذاب دیا جائے گا اور اس میں وہ ہمیشہ ذلّت کے ساتھ رہے گا، اِلّا یہ کہ کوئی توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل صالح کرے، تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل کرے تو وہ اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنا چاہیے۔ اور وہ لوگ جو جھوٹ کی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ کسی لغو چیز پر گزرتے ہیں تو شرافت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ اور جنھیں اگر ان کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جائے تو وہ اس پر اندھے بہرے کی طرح نہیں گرتے۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم کو اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیز گاروں کا امام بنا۔ یہی لوگ بالا خانوں میں جگہ پائیں گے کیونکہ انھوں نے صبر کیا اور اس میں ان کا استقبال تحیت اور سلام کے ساتھ ہوگا۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ ٹھکانا اور کیا ہی اچھا ہے وہ مقام (الفرقان ۶۳ - ۷۶)

اپنے رب کے راستہ کی طرف پکارو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔ اور لوگوں سے بحث کرو ایسے طریقہ سے جو بہتر ہو۔ تمہارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون سیدھے راستہ پر ہے۔ اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اتنا ہی لو جتنا کہ تم پر زیادتی کی گئی ہے۔ اور اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔ اور صبر سے کام لو، تمہارا صبر اللہ ہی کے لیے ہے۔ اور ان پر غم نہ کرو اور ان کی کارروائیوں پر دل تنگ نہ ہو۔ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس سے ڈریں اور جو نیک عمل کرتے ہیں (النحل ۱۲۵ - ۱۲۸)

کامیاب ہوگیا وہ جس نے اپنے کو پاک کیا۔ اور اپنے رب کا نام لیا۔ پھر نماز ادا کی۔ بلکہ تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو۔ اور آخرت بہتر ہے اور پائدار ہے۔ یہی اگلے صحیفوں میں بھی ہے، اور ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی (الاعلیٰ ۱۴ - ۱۹)

قرآنی افکار

دنیا میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں وہ عام طور پر دو قسم کی ہیں۔ ایک قسم کی چیزیں وہ ہیں جن کی ایک مثال گھر ہے۔ دوسری قسم کی چیزیں وہ ہیں جن کی ایک مثال درخت ہے۔

گھر کیا ہے۔ گھر متفرق اجزاء کا ایک مجموعہ ہے۔ اینٹ، سمنٹ، لوہا، لکڑی، اس قسم کی مختلف چیزوں کو مخصوص ترتیب سے اکٹھا کیا جاتا ہے تو ایک گھر بن کر تیار ہو جاتا ہے۔ گھر کا ہر جزء دوسرے جزء سے الگ ہے۔ ان الگ الگ اجزاء میں جو چیز وحدت پیدا کرتی ہے وہ صرف ان کی ترتیب ہے۔

درخت کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ درخت ایک وحدت کے متفرق ظہور کا نام ہے۔ درخت کی اصل ایک زندہ حقیقت ہے جس کو بیج کہا جاتا ہے۔ یہ زندہ حقیقت جب اپنی توسیعی صورت میں ظاہر ہو کر تنہ، شاخ، پتی، پھول، پھل کی صورت میں کھڑی ہو جائے تو اس کو درخت کہا جاتا ہے۔

قرآن میں کہا گیا ہے: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے، اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر موقع پر اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے۔ اور اللہ لوگوں کے لیے مثال بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں (ابراہیم ۲۴-۲۵)

قرآن کی ان آیتوں میں ایک مثال کے ذریعہ ایمان و اسلام کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ اس کے مطابق، اللہ پر ایمان ایک توسیع پذیر حقیقت ہے جس طرح بیج ایک توسیع پذیر حقیقت ہوتا ہے۔ درخت جب اپنی مطلوبہ زمین میں متمکن ہو جائے تو وہ بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنے اطراف کی پوری دنیا سے اپنی خوراک لیتے ہوئے بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ مکمل درخت بن جاتا ہے۔

اسی طرح ایمان جب ایک انسان کے سینہ میں جگہ پاتا ہے تو اس کے بعد وہ فوراً بڑھنے لگتا ہے۔ خدا کی پوری کائنات اس کے لیے "رزق خیر" کا دستر خوان بن جاتی ہے۔ حیات انسانی کے تمام پہلوؤں میں اس کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ سرسبز و شاداب ربانی درخت

بن کر کھڑا ہو جاتا ہے جس کا دوسرا نام مومن ہے۔

جس طرح درخت تنہ اور شاخ اور پھول اور پھل وغیرہ کی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اس طرح ایمان بھی ایک فرد کی زندگی میں مختلف اور متنوع صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ باایمان فرد ایک ایسی شخصیت بن جاتا ہے جو اپنے توسیعی پہلو سے زمین و آسمان کی وسعتوں میں پھیلا ہوا ہو، ایمان کا یہ توسیعی اضافہ جن مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اس کو الگ الگ ممیز کرنے کے لیے ان کو شکر، خشوع، تواضع، توکل، عبادت، صبر، اخلاق، حسن معاملہ، ایفاء عہد، عدل، امانتداری، ادائیگی حقوق، امر بالمعروف، دعوت الی اللہ وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ ایمان سب سے پہلے یہ کرتا ہے کہ وہ آدمی کی مردہ شخصیت کو ایک زندہ شخصیت بنا دیتا ہے۔ وہ اللہ کی معرفت میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس کو ہر وقت اللہ کی یادوں کا رزق ملتا رہتا ہے۔ دنیا کی محدودیت سے نکل کر وہ آخرت کی لامحدود وسعتوں میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ حیاتِ عارضی سے گزر کر حیاتِ ابدی کے جلوؤں کو پالیتا ہے۔ اس کو وہ بھرپور زندگی حاصل ہو جاتی ہے جس کو قرآن میں حیاتِ طیبہ کہا گیا ہے۔

ایمان جب اس طرح کسی آدمی کی اندرونی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے تو وہ زندگی کے خارجی پہلوؤں میں بھی حسب حالات ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ دوسروں سے بات چیت میں، دوسروں سے لین دین میں، دوسروں سے معاملہ کرنے میں اس کا حال وہ ہو جاتا ہے جس کا نقشہ قرآن کے ان لفظوں میں کھینچا گیا ہے: وہ شخص جو مُردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندگی دے دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے (الانعام ۱۲۳)

اسی کے ساتھ اس فرد مومن میں اصلاح کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس جذبۂ اصلاح کا ایک ظہور وہ ہے جو مومنوں کی جماعت کے درمیان ہوتا ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جس کا ظہور غیر مسلموں کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ پہلے گروہ کے درمیان مومن کے اس اصلاحی کام کا عنوان، قرآن کے الفاظ میں، امر بالمعروف والنہی عن المنکر ہے، اور غیر مسلموں کے درمیان اس اصلاحی کام کا عنوان دعوت الی اللہ۔ اس قسم کے افراد جب قابل لحاظ تعداد میں اکٹھا ہو جائیں تو ان کے لیے اس اجتماعی نصرت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے جس کو تمکین فی الارض کہا گیا ہے۔

تدوین وحفاظت

قرآن کے لغوی معنی ہیں ——— وہ چیز جو پڑھی جائے۔ قرآن یا القرآن اب اس مقدس کتاب کا نام ہے جو خدا کی آخری اور محفوظ کتاب ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کتاب کا پہلا حصہ ۶۱۰ء میں مکہ میں فرشتہ جبریل کی معرفت اتارا گیا۔ اور اس کا آخری حصہ ۶۳۲ء میں مدینہ میں نازل ہوا۔ ہجری کیلنڈر کے اعتبار سے ۲۳ سال میں اس کے نزول کی تکمیل ہوئی۔

تمام الہامی کتابوں میں قرآن کی یہ استثنائی صفت ہے کہ اس کا متن تاریخی اعتبار سے ایک مکمل طور پر محفوظ متن ہے۔ مثال کے طور پر تورات اور انجیل اسرائیلی پیغمبروں کے ظہور کے کئی نسلوں کے بعد محض یادداشت سے لکھی گئیں اور پھر سیکڑوں سال تک ان کے علما ان کتابوں کی غلطیوں کی بطور خود تصحیح کرتے رہے۔ مگر قرآن کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ مکمل طور پر خود پیغمبر اسلام ؐ کے زمانہ میں لکھا گیا۔ پورے علمی استناد کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیغمبر نے جو الفاظ لکھوائے عین وہی الفاظ آج بھی قرآن کی صورت میں لکھے ہوئے ہمارے پاس موجود ہیں۔

قرآن کے متن کی حفاظت کا یہ انتظام کیا گیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر وقت کچھ ایسے اصحاب رہتے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ جیسے ہی قرآن کا کوئی حصہ اترتا آپ فوراً ان کاتبوں میں سے کسی کاتب کو بلاتے اور بطریق املا نازل شدہ آیتوں کو لکھوا دیتے۔ اسی کے ساتھ آپ کے تمام اصحاب قرآن کو زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔ اس طرح قرآن کی حفاظت کے لیے وہ دہرا انتظام کیا گیا جس کو ایک مستشرق نے دہرا چیکنگ (double-checking) کا نظام کہا ہے۔ اس دہرا نظام کا مقصد یہ تھا کہ لکھے ہوئے کو یادداشت سے جانچا جائے، اور یادداشت کو لکھے ہوئے سے جانچا جائے۔ تاکہ کلام کی صحت میں کوئی شبہہ باقی نہ رہے۔

قرآن کی حفاظت کا یہ دہرا نظم پورے اہتمام کے ساتھ برابر قائم رہا۔ ایک دن کے لیے بھی اس میں فرق واقع نہیں ہوا۔ ساری مسلم دنیا میں نسل در نسل لاکھوں لوگ ہر صبح و شام اس دہرا نظام حفاظت کو قائم رکھنے میں مشغول رہے۔ یہ عمل ہزار سال سے بھی زیادہ مدت تک

مسلسل جاری رہا، یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی میں پریس کا دور آگیا۔ پریس کا دور آجانے کے بعد قرآن میں تحریف یا تبدیلی کا امکان ہی سرے سے ختم ہوگیا۔ آج اگر کوئی شخص دنیا میں گھومے اور ہر شہر سے قرآن کا ایک چھپا ہوا نسخہ حاصل کرے۔ پھر وہ ان ہزاروں نسخوں کا تقابل کرے تو وہ ایک نسخہ اور دوسرے نسخہ میں کسی بھی قسم کا کوئی لفظی فرق نہیں پائے گا۔

قرآن کی صرف کتابت محفوظ نہیں ہے، بلکہ اس کا طرز ادا بھی محفوظ ہے۔ آج ایک مسلمان جب قرآن کو کھول کر پڑھتا ہے تو آواز کے اعتبار سے وہ اسی طرز ادا کا اتباع کرتا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا جس کی تلقین آپ نے فرمائی تھی۔ آج کے ایک قاریٔ قرآن کے طرز ادا میں اور زمانۂ نبوت کے طرز ادا میں حقیقی اعتبار سے کوئی صوتی فرق نہیں۔

مثال کے طور پر سورہ القیامۃ میں ایک آیت ہے جو اس طرح لکھی جاتی ہے : وقیل مَن راق۔ عربی گرامر کے لحاظ سے اس آیت کو ایک جملہ کے طور پر مسلسل پڑھنا چاہیے۔ مگر قرآن کا ہر قاری جب اس کو پڑھتا ہے تو وہ مَن پر سکتہ کرتا ہے۔ یعنی وقیلَ مَن کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھہرتا ہے، اس کے بعد وہ کہتا ہے : راق۔ قواعد زبان کے اعتبار سے اس طرز ادا کا کوئی سبب نہیں ہے۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ راویوں نے یہ بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت پڑھی تو آپ مَن کہہ کر ایک لمحہ کے لیے رک گئے اور پھر اگلا لفظ ادا فرمایا۔ یہی معاملہ سارے قرآن کی تلاوت کا ہے۔

الفاظ قرآن کی ادائیگی میں نبوت کا یہ اتباع انتہائی کامل صورت میں آج تک قائم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح قرآن کو پڑھتے تھے، اس کو آپ کے اصحاب نے آپ سے سنا اور ٹھیک اسی طرح اس کو دہرایا۔ پھر تابعین نے صحابہ سے سنا اور عین اسی طرح اس کو دہرایا۔ اس کے بعد تبع تابعین نے تابعین سے سنا اور اس کو ویسا ہی دہرایا۔ اس طرح نسل در نسل نبوت کی تلاوت ٹھیک اسی طرح دہرائی جاتی رہی۔ پچھلے لوگ اپنے اگلے لوگوں کو اسے سناتے رہے۔ یہ سلسلہ زمانۂ نبوت سے لے کر اب تک مسلسل بلا انقطاع جاری ہے۔ یہاں تک کہ آج ایک عرب عالم جب قرآن پڑھتا ہے تو گویا کہ وہ ایک زندہ ٹیپ کی مانند عین اسی تلاوت کو دہرارہا ہوتا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے فرمائی تھی۔

قرآن خدا کی کتاب

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اُس کی بابت یہ اعلان کیا تھا کہ ـــــ جن لوگوں نے نصیحت کی اس کتاب کا انکار کیا جب کہ وہ ان کے پاس آگئی، اور بے شک یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ اس میں باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ حکیم وحمید کی طرف سے اتاری گئی ہے (حٰم السجدہ ۴۱-۴۲)

تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب قرآن اترا، اس وقت ان الفاظ کی حیثیت ایک پیشین گوئی کی تھی۔ آج یہ پیشین گوئی ایک تاریخی واقعہ بن چکی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک استثنائی نوعیت کی کتاب ہے۔ وہ ایک ایسے خدا کی طرف سے بھیجی گئی ہے جو تمام طاقتوں سے زیادہ بڑی طاقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کے مخالفانہ حالات کے باوجود یہ ممکن نہ ہو سکا کہ اس میں کوئی دخل اندازی یا بگاڑ واقع ہو، نہ براہِ راست اور نہ بالواسطہ۔

یہ کوئی سادہ سی بات نہیں، یہ ایک انتہائی غیر معمولی بات ہے۔ اس قسم کے ایک واقعہ کو اسباب کی دنیا میں ظہور میں لانے کے لیے کائناتی طاقتیں درکار ہیں۔ اس کو صرف خداوند عالم ہی ظہور میں لا سکتا ہے۔ اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خداوندِ عالم کی کتاب ہے۔

اس پیشین گوئی کو عالم اسباب میں واقعہ بننے کے لیے ضروری تھا کہ ایک طاقتور انسانی گروہ مستقل طور پر اس کی پشت پر موجود رہے۔ پچھلے نبیوں کی تعلیمات اور اس کی تعلیمات میں غیر مطابقت پیدا نہ ہو۔ کوئی ادیب یا مفکر قرآن کا جواب لکھنے پر قادر نہ ہو۔ کوئی نئی نبوت نبوتِ محمدی کی حریف بن کر نہ ابھر سکے۔ علومِ انسانی کا ارتقا اس کی کسی بات کو کبھی غلط ثابت نہ کرے۔ تاریخ کا اتار چڑھاؤ کبھی اس پر اثر انداز نہ ہونے پائے۔ قرآن کی زبان (عربی) ہمیشہ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے باقی رہے۔ وغیرہ

قرآن کے نزول کے بعد سے اب تک کی لمبی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تمام اسباب حیرت انگیز طور پر اس کے حق میں جمع رہے ہیں۔ قرآن کے سوا کوئی بھی دوسری کتاب ایسی نہیں جس کے حق میں یہ غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہو۔

قرآن کا یہ استثنائی معاملہ اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے، وہ کسی جن یا کسی انسان کی تصنیف نہیں۔

دور اول میں مکہ میں قرآن اور حاملین قرآن انتہائی کمزور تھے۔ مکہ کے طاقت ور مخالفین اگر اپنے منصوبہ میں کامیاب ہو جاتے تو قرآن کی کہانی مکہ سے شروع ہو کر مکہ ہی میں ختم ہو جاتی۔ مگر اس کے بعد معجزاتی طور پر اہل مدینہ (انصار) اس کی حمایت پر کھڑے ہو گئے اور قرآن کی تاریخ آگے بڑھ گئی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دوبارہ قرآن اور حاملین قرآن کی حالت، حضرت عائشہ کے الفاظ میں، ایسی ہو گئی جیسے سردیوں کی بارش میں بھیگی ہوئی بکری۔ مگر اس کے بعد اعاجم (بیرون عرب کی قومیں) بہت بڑی تعداد میں قرآن کے دین پر ایمان لائیں اور اس کی تاریخ کا سفر دوبارہ مزید تیزی کے ساتھ جاری ہو گیا۔

اس کے بعد مختلف سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان کے درمیان باہمی طور پر سخت اختلافات رہے۔ حتی کہ بعض اوقات ایک مسلم گروہ دوسرے مسلم گروہ کا جانی دشمن ہو گیا۔ مگر جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس کی حفاظت اور اس کے احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہر جماعت اور ہر حکمراں اس کو اپنے لیے فخر سمجھتا رہا کہ وہ قرآن کا خادم اور محافظ بنا رہے۔

عباسی سلطنت کے بعد وحشی منگول عالم اسلام پر چھا گئے۔ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ تاریخ کو الٹی سمت میں چلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مگر پچاس سال کے اندر یہ معجزہ پیش آیا کہ خود قرآن نے ان فاتحین کو مسخر کر لیا۔ ان کی اکثریت قرآن کے دین میں داخل ہو کر قرآن کی خادم بن گئی۔

اس کے جلد ہی بعد ترک ابھرے۔ انھوں نے عظیم عثمانی خلافت قائم کی جو یورپ سے ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان میں بہت سی کمزوریاں تھیں۔ علم کے اعتبار سے بھی وہ بہت پیچھے تھے۔ مگر جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، وہ آخری حد تک قرآن کے وفادار بنے رہے، قرآن کی خدمت اور حفاظت میں وہ ہمیشہ پوری طاقت کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔

بیسویں صدی میں جدید صنعتی انقلاب نے حاملین قرآن کو اتنے پیچھے دھکیل دیا کہ وہ کسی بھی موثر کارروائی کے قابل نہ رہے۔ مگر عین اس وقت "پٹرول" کی طاقت ظاہر ہوئی۔ صنعتی نظام کا ایندھن پٹرول تھا اور اس پٹرول کا ۸۵ فیصد حصہ حاملین قرآن کے قدموں کے نیچے جمع ہو گیا۔ اس طرح موجودہ زمانہ میں پٹرول کی قدرتی نعمت قرآن کی حامی بن کر کھڑی ہو گئی۔ قرآن دوبارہ اس قابل ہو گیا کہ وہ تاریخ میں اپنی پیش قدمی کو بدستور جاری رکھ سکے۔

سچائی کو پانے والا

معانی کی دنیا خدا کے جلووں کی دنیا ہے۔ کون ہے جو خدا کے جلووں کو انسانی زبان میں بیان کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم جب کسی معنی کو بیان کرتے ہیں تو ہم اس کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو کچھ گھٹا دیتے ہیں۔ اس کے اوپر ایک لفظی پردہ ڈال دیتے ہیں۔

کسی بامعنی حقیقت کو کوئی شخص محض اس کے الفاظ سے سمجھ نہیں سکتا۔ ایک اندھا شخص کسی کے بتانے سے یہ نہیں جان سکتا کہ پھول کیا ہے۔ اسی طرح ایک شخص جس نے معنوی حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ جگائی ہو وہ معنوی حقائق سے باخبر نہیں ہو سکتا۔ خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کے سامنے دہرا دیئے جائیں، خواہ قاموس المعانی کی تمام جلدوں کو اسے پڑھا دیا جائے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس کتاب سے ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اپنے اندر تقویٰ کی صفت رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچائی اس کو ملتی ہے جس کے دل میں سچائی کی کھٹک موجود ہو۔ جو شخص سچائی کی تلاش میں ہو، سچائی جس کی ضرورت بن گئی ہو، جو سچائی کو پانے کے لئے اتنا بے قرار ہو کہ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہو اور اسی کی یاد لیکر جاگتا ہو، جو آدمی اس طرح سچائی کا طالب ہو، قرآن اسی کے لئے ہدایت بنتا ہے۔

ایسا شخص گویا ہدایت کا نصف راستہ طے کر چکا ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے عہد الست کی خدائی آوازوں کو سن رہا ہے۔ وہ اپنے اندر اس صلاحیت کو بیدار کر چکا ہے جو معانی کی زبان کو سمجھتی ہے۔ ایسا شخص مادی دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے عالم حقائق سے اتنا قریب آجاتا ہے کہ وہ فرشتوں کی سرگوشیوں کو سننے لگتا ہے۔

نبوت کا علم ملنے سے پہلے یہ تمام تجربات آدمی کے اندر مبہم اور مجہول انداز میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب قرآن کی آواز اس کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب فطرت کی تفسیر بن جاتی ہے وہ اپنے اندر چھپے ہوئے غیر ملفوظ اشارات کو ملفوظ زبان میں پالیتا ہے۔ اب قرآن اور قرآن کو پڑھنے والا دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ بن جاتے ہیں۔ قرآن وہ بن جاتا ہے اور وہ قرآن۔

قرآن کی اہم ترین صفت یہ ہے کہ وہ ہدایت کی کتاب ہے۔ قرآن سچائی کا دروازہ ہے۔ قرآن کے ذریعہ آدمی سچائی کی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ ہمارے پاس آنکھ ہے۔ مگر جب تک کوئی روشنی اندھیرے کو نہ ہٹائے ہم باہر کی چیزوں کو دیکھ نہیں سکتے۔ قرآن یہی روشنی ہے۔ وہ ہماری بصارت کو بصیرت کی نعمت عطا کرتا ہے۔

قدیم عرب میں بہت سے لوگ تھے جن کو حنفاء کہا جاتا تھا۔ آج کل کی زبان میں وہ سچائی کے متلاشی تھے۔ ان کی اندرونی طلب ایک چیز کو چاہتی تھی۔ مگر ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ مگر جب قرآن اترا اور انھوں نے اس کو پڑھا تو قرآن کی باتیں ان کو اپنے دل کی آواز معلوم ہوئیں۔ انھوں نے بڑھ کر اس کو قبول کر لیا۔ قرآن ان کے ذہن کے لیے اطمینان اور ان کے دل کے لیے تسکین کا ذریعہ بن گیا۔

ٹھیک اسی طرح آج بھی بے شمار لوگ ہیں جو حق کے متلاشی ہیں۔ مگر ان کو نہیں معلوم کہ وہ حق کیا ہے اور کہاں ہے۔ ان میں سے کسی شخص کو جب قرآن پڑھنے کو ملتا ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے کہ قرآن ہی وہ ہدایت نامہ ہے جس کی تلاش اس کی روح کر رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر قرآن کے دین کو اختیار کر لیتا ہے۔ وہ قرآن کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔

آدمی ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے جہاں سورج روشنی بکھیر رہا ہے مگر وہ نہیں بتاتا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ ہوائیں اس کو آکسیجن سپلائی کرتی ہیں مگر وہ نہیں بتاتیں کہ وہ کس منصوبہ کے تحت ایسا کر رہی ہیں۔ یہاں ہر طرف صحت بخش پانی موجود ہے مگر وہ بھی اس کی خبر نہیں دیتا کہ وہ کس سرچشمۂ رحمت کے فیض سے ایسا کر رہا ہے۔ زمین کی سطح پر جگہ جگہ اونچے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں مگر کسی پہاڑ پر ایسا کوئی بورڈ نہیں لگا ہوا ہے جس پر ان کائناتی سوالات کا جواب لکھا ہوا ہو۔

قرآن اسی کمی کو پورا کرتا ہے۔ قرآن حقائق فطرت کا اعلان ہے۔ قرآن ہم کو زندگی اور کائنات کے رازوں سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ انسان کے آغاز اور اس کے انجام کی اطلاع دیتا ہے۔ قرآن ہر آدمی کے لیے گائڈ بک ہے جس کی رہنمائی میں وہ اپنے سفر حیات کو طے کر سکے۔

قرآن ایک استثنائی کتاب

عبداللہ بن المقفع عباسی دور کا ایک ادیب ہے۔ ۱۴۲ھ (۷۵۶ء) میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے ایک فارسی کتاب (پنج تنتر) کا ترجمہ عربی میں کیا تھا جس کا نام کلیلہ و دمنہ ہے۔ یہ کتاب اولاً سنسکرت میں قدیم بھارت میں لکھی گئی تھی۔ مگر اب اس کا سنسکرت نسخہ معدوم ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے ترجمے دنیا کی اکثر زبانوں میں ہوئے۔ مگر وہ سب اس کے فارسی ترجمہ یا عربی ترجمہ سے کیے گئے ہیں۔

محمد بن موسیٰ الخوارزمی (م ۸۴۹ء) بھی دور عباسی کا ایک مشہور عالم ہے۔ اس نے علم حساب میں ایک کتاب لکھی جس کا نام الجامع والتفریق بحساب الہند ہے۔ علم ہندسہ پر یہ کتاب بیحد اہم سمجھی جاتی ہے۔ مگر اب اس کا اصل عربی نسخہ معدوم ہو چکا ہے۔ اس کا قدیم ترین نسخہ صرف لاطینی ترجمہ کی صورت میں محفوظ ہے:

His work on Hindu-Arabic numerals is preserved only in a Latin trnaslation. (V/797)

دورِ پریس سے پہلے لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا یہی حال ہے۔ وہ یا تو سرے سے معدوم ہو چکی ہیں۔ مثلاً ابومسلم اصفہانی کی تفسیر قرآن۔ یا اصل کتاب معدوم ہوگئی اور اب صرف اس کا ترجمہ دنیا میں پایا جاتا ہے، جیسے کہ مذکورہ دونوں کتابیں۔ اس میں مقدس کتابوں کا بھی استثناء نہیں۔ مثلاً انجیل کا قدیم ترین نسخہ یونانی میں ہے۔ یہ ابتدائی انجیل کا ترجمہ ہے۔ وہ حضرت مسیح کے زمانہ کی انجیل نہیں۔ کیوں کہ یونانی زبان حضرت مسیح کی زبان ہی نہ تھی۔ حتیٰ کہ دورِ پریس سے پہلے کی جن کتابوں کا قدیم نسخہ موجود ہے، ان میں بھی دستی کتابت کی وجہ سے اتنا فرق ہے کہ ان کا کوئی بھی دو نسخہ بالکل یکساں نہیں۔

اس عموم میں صرف ایک استثناء ہے، اور وہ قرآن کا ہے۔ قرآن کا زمانۂ نزول ۶۳۲-۶۱۰ء ہے۔ وہ مکمل طور پر دورِ پریس سے پہلے کے زمانہ میں آیا۔ مگر حفاظت کے کامل اہتمام کے ساتھ وہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دورِ پریس میں پہنچ گیا، جس کے بعد کسی قسم کی تحریف یا تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

یہ اس بات کا ایک تاریخی ثبوت ہے کہ قرآن ایک استثنائی کتاب ہے۔ پھر یہ استثناء کوئی سادہ استثناء نہیں۔ وہ اتنا نادر ہے کہ انسانی اصطلاحوں میں اس کی کوئی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ اس غیر معمولی

استثنا کی قابل فہم توجیہہ صرف ایک ہو سکتی ہے، اور وہ یہ کہ اس کو خدائی معاملہ سمجھا جائے۔ یہ خدا تھا جس نے تاریخ میں مداخلت کر کے اس استثنا کو ممکن بنایا۔

قدیم یونان میں جو کتابیں یونانی زبان میں لکھی گئیں، ان میں دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ایک ایلیڈ (Illiad) اور دوسرے اوڈیسی (Odyssey) ایلیڈ ایک مفروضہ جنگ کی کہانی بیان کرتی ہے اور اوڈیسی ایک مفروضہ سفر کی داستان ہے۔ لٹریری اہمیت کی بنا پر ان کتابوں کے ان گنت ترجمے کیے گئے ہیں۔ مگر دونوں کتابوں کے بارے میں عجیب بات یہ ہے کہ ان کے مصنف کا نام قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کتابوں کا مصنف ہومر ہے جس کا زمانہ غالباً نویں صدی یا آٹھویں صدی قبل مسیح تھا۔ تاہم ہومر کے بارہ میں تاریخی معلومات تقریباً نہیں کے برابر ہیں:

Virtually nothing is known about the life of Homer (Vol. V, p. 103).

محققین نے اس مفروضہ پر بھی زبردست اعتراضات کیے ہیں کہ یہ کتابیں فی الواقع ہومر کی تصنیف ہیں۔ مثلاً سموئل بٹلر (۱۹۰۲-۱۸۳۵) کا خیال ہے کہ اوڈیسی ایک عورت کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی طرح ایلیڈ کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ کئی مرحلوں میں مختلف افراد کی کوششوں سے مرتب ہوئی (EB-8/1017) قدیم زمانہ کی کتابوں کا عام طور پر یہی حال ہے۔ ان کے بارے میں معلومات اتنی کم ہیں کہ ان کے ذریعہ ان کی کوئی واضح تاریخی تصویر نہیں بنتی۔

دور قدیم کی کتابوں میں قرآن واحد کتاب ہے جس کی ہر بات معلوم اور مسلّم ہے۔ جس کی واقعیت تاریخ کے ہر معیار پر پوری اترتی ہے۔ جو مکمل طور پر ایک تاریخی کتاب ہے ——— قرآن کب اترنا شروع ہوا، ۶۱۰ء میں۔ کس کے اوپر اترا، محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب کے اوپر۔ وہ کہاں پیدا ہوئے اور کہاں وفات پائی، ۵۷۱ء میں مکہ میں پیدا ہوئے اور ۶۳۲ء میں مدینہ میں وفات پائی۔ قرآن کی زبان کیا تھی، عربی زبان۔ شروع میں قرآن کے کاتب کون لوگ تھے، ابو بکر بن ابی قحافہ، عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، زبیر بن العوام، زید بن ثابت، عامر بن فہیرہ، ابوایوب انصاری، ابی بن کعب، معاویہ بن ابی سفیان، عبد اللہ بن مسعود، وغیرہ۔

اسی طرح قرآن اور صاحب قرآن کے بارہ میں جو بھی تاریخی سوال کیا جائے، اس کا واضح جواب یقینی طور پر موجود ہو گا۔ جب کہ دور قدیم کی کسی بھی دوسری کتاب کو یہ خصوصیت حاصل نہیں۔

علمی تصدیق

ستمبر ۱۹۹۲ میں ایک عالمی سفر کے تحت میں انگلینڈ میں تھا۔ برطانیہ کے وقت اور انڈیا کے وقت میں ساڑھے چار گھنٹہ کا فرق ہے۔ یعنی ہر روز برطانیہ کی گھڑی چار گھنٹہ آگے ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں انڈیا کی گھڑی ساڑھے چار گھنٹہ پیچھے۔

ایک روز میں نے برمنگھم میں عشاء کی نماز پڑھی۔ اچانک خیال آیا کہ عین اس وقت اگر میں انڈیا پہنچ جاؤں تو وہاں منظر بالکل دوسرا ہوگا۔ جس وقت میں نے برمنگھم میں عشاء کی نماز پڑھی ہے، اُس وقت انڈیا کی مسجدوں میں عصر کی نماز کی تیاری ہو رہی ہوگی۔ یعنی جس وقت برمنگھم میں رات ہے، اس وقت دہلی میں دن ہے۔ اور جس وقت دہلی میں دن نظر آرہا ہے اُس وقت برمنگھم میں رات ہو چکی ہے۔

اس فرق پر میں غور کر رہا تھا تو مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آگئی جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ مشرقوں اور مغربوں کا مالک ہے (فلا اقسم برب المشارق والمغارب انا لقادرون) المعارج ۴۰

قرآن کے نزول کے وقت انسان کی زبان میں مشرق اور مغرب کے الفاظ صرف واحد کے صیغہ کے ساتھ استعمال ہوتے تھے، وہ جمع کے صیغہ کے طور پر استعمال نہیں کیے جاتے تھے۔ یعنی اس وقت کا انسان ایک مشرق یا ایک مغرب کو جانتا تھا، وہ کئی مشرق اور کئی مغرب کے تصور سے ناواقف تھا۔ مگر قرآن نے عمومی رواج کے خلاف ان الفاظ کو جمع کے طور پر استعمال کیا۔ اس طرح گویا اعلان کیا کہ یہاں مشرق بھی کئی ہیں اور مغرب بھی کئی ہیں۔ آج قرآن میں بتائی ہوئی یہ بات ایک آفاقی واقعہ بن کر ساری دنیا میں ثابت شدہ بن چکی ہے۔

قدیم زمانہ کا انسان صرف مقامی دائرہ میں سوچتا تھا۔ اس کو اس بات کی خبر نہ تھی کہ جس وقت وہ اپنے مقامی افق پر سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اس وقت دوسرے مقامات پر دوسری آفتابی حالت ہوگی۔ یا یہ کہ جس وقت وہ اپنے افق پر سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے اُس وقت دوسرے مقامات پر اس کے علاوہ دوسرا آفتابی منظر ہوگا۔ مگر آج یہ بات عمومی طور پر معلوم بات بن چکی ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن کی یہ آیت قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا ایک علمی ثبوت ہے۔ کیوں کہ چودہ سو سال پہلے جب کہ انسان تعدد مشارق اور تعدد مغارب کی حقیقت سے بے خبر تھا، یہ صرف ایک برتر ہستی ہی کے لیے ممکن تھا کہ وہ اس کائناتی حقیقت کو جانے اور اس کے بارہ میں نہایت صحیح بیان دے۔

قرآن کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جس میں کائناتی مظاہر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ستاروں کی گردش، زمین پر صبح و شام کا ہونا، ماں کے پیٹ میں بچہ کی پرورش، نباتات اور حیوانات کے معاملات، ہواؤں کے تصرفات، وغیرہ۔

قرآن میں یہ حوالے چودہ سو سال پہلے دیے گئے تھے۔ اس وقت انسانی تاریخ ابھی روایتی دور میں تھی۔ کائناتی مظاہر کے بارہ میں اس وقت جو خیالات دنیا میں پھیلے ہوئے تھے وہ سب توہمات اور مفروضات پر مبنی تھے۔ مگر قرآن کے ان حصوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قرآنی بیانات پر مروجہ اوہام کا کوئی عکس نہیں۔ زمانی خیالات کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے قرآن میں ایسے اشارے کیے گئے جو بعد کی علمی دریافتوں کے عین مطابق تھے۔

مثلاً قرآن میں اعلان کیا گیا کہ تمام زندہ چیزیں پانی سے بنائی گئی ہیں (الانبیاء ۳۰) اس آیت کے نزول کے وقت کوئی بھی متعین طور پر نہیں جانتا تھا کہ پانی اور زندہ چیزوں کے درمیان کس قسم کا ربط ہے۔ یہ بہت بعد کی تحقیقات ہیں جن کے بعد سائنس کی کتابوں میں لکھا گیا کہ نباتات، حیوانات اور انسان سب کے لیے پانی بالکل لازمی ضرورت ہے۔ نباتات اور حیوانات کے جسم میں جتنے بھی عمل ہوتے ہیں ان سب میں پانی کا حصہ ہوتا ہے:

Water is essential to terrestrial life, participating in virtually every process that occurs in plant and animal organism. (X/565)

پانی کی یہ اہمیت قدیم زمانہ میں متعین طور پر معلوم نہ تھی۔ اس وقت قرآن میں مذکورہ واقعہ کا اعلان کیا گیا، اور وہ اعلان بعد کی علمی دریافتوں کے عین مطابق ثابت ہوا۔ قرآن کا یہ پہلو اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ قرآن ایک لامحدود ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔ کوئی محدود ذہن ایسا ابدی کلام پیش کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔

قرآنی انقلاب

جسٹس امیر علی (۱۹۲۸-۱۸۴۹) کی کتابوں میں اسپرٹ آف اسلام (The Spirit of Islam) بہت مشہور ہے۔ وہ پہلی بار ۱۸۹۱ میں لندن سے شائع ہوئی۔ مصنف نے اس کتاب میں صفحہ ۳۹۵ پر پروفیسر جانسن (Johnson) کا ایک اقتباس نقل کیا ہے، یہ اقتباس قرآن کے بارہ میں ہے۔ پروفیسر جانسن لکھتے ہیں :

"If it is not poetry, — and it is hard to say whether it be or not, — it is more than poetry. It is not history, nor biography. It is not anthology, like the Sermon on the Mount; nor metaphysical dialectics, like the Buddhist Sutras; nor sublime homiletics like Plato's conferences of the wise and foolish teachers. It is a prophet's cry, Semitic to the core, yet of a meaning so universal and so timely that all the voices of the age take it up, willing or unwilling, and it echoes over palaces and deserts, over cities and empires, first kindling its chosen hearts to world-conquest, then gathering itself up into a reconstructive force that all the creative light of Greece and Asia might penetrate the heavy gloom of Christian Europe, when Christianity was but the Queen of Night."

قرآن اگر شاعری نہیں ہے، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ شاعری ہے یا نہیں ہے، تب بھی وہ شاعری سے زیادہ ہے۔ وہ تاریخ نہیں ہے اور نہ وہ سوانح عمری ہے۔ وہ انجیل کے پہاڑی کے وعظ کی طرح مجموعۂ امثال نہیں ہے، وہ مابعد الطبیعاتی مکالمہ نہیں ہے جیسا کہ بدھا کے سوتر میں پایا جاتا ہے۔ وہ موعظت بھی نہیں ہے جیسا کہ افلاطون کے یہاں عاقل اور نادان کی مجلسوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ ایک پیغمبر کی پکار ہے۔ وہ آخری حد تک سامی اور عربی ہے، اس کے باوجود اس میں ایسی معنویت ہے جو انتہائی آفاقی ہے اور وہ اتنا مطابق وقت ہے کہ ہر زمانہ کی آوازیں اس کو ماننے پر مجبور ہیں، خواہ وہ اس کو چاہیں یا نہ چاہیں۔ اس کی آواز کی بازگشت محلوں اور صحراؤں میں، شہروں اور بادشاہتوں میں سنائی دیتی ہے۔ پہلے وہ اپنے منتخب دلوں میں عالمی فتح کی آگ سلگاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک ایسی تعمیری طاقت بن جاتا ہے جیسے کہ یونان اور ایشیا کی تمام تخلیقی روشنی مسیحی یورپ کی گہری تاریکیوں میں داخل ہو جائے، اس وقت جب کہ مسیحیت صرف رات کی ملکہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

قرون وسطیٰ میں یورپ کا طریقہ، اساتذہ کی کتابوں کو پڑھنا اور انھیں کی رایوں کو دہرانا تھا۔ اس کے مقابلہ میں عربوں نے تجربہ و مشاہدہ پر مبنی طریق تحقیق کو رواج دیا۔ تحقیقات علمی کے لیے تجرباتی طریقہ کو کچھ لوگ غلط طور پر راجر بیکن کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طریقہ کے موجد عرب تھے۔ گستاؤلیبان نے اعتراف کیا ہے کہ یہ دراصل عرب تھے جنھوں نے علمی تحقیقات میں تجربہ کو داخل کیا (تمدن عرب)

ڈریپر نے لکھا ہے کہ "عربوں کی عقل سلیم نے یہ بات انھیں سمجھا دی تھی کہ سائنس کی ترقی محض تخیل سے نہیں ہو سکتی۔ اس کا صحیح اور یقینی ذریعہ صحیفہ فطرت کا عینی مطالعہ ہے۔ وہ حکمت نظری پر حکمت عملی کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کے علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر تھی۔ فن ہندسہ اور ریاضیات کو وہ استدلال و استنباط کے آلات تصور کرتے تھے۔ علم ہیئت میں انھوں نے غیر معمولی ترقیاں کیں۔

موسیو تاتاں نے "جنرل ہسٹری آف سائنس" میں لکھا ہے کہ عربوں نے دنیا میں علمی ذوق کو نئے سرے سے بیدار کیا۔ وہ رصدگاہ، جر ثقیل اور علم کیمیا کے حیرت انگیز آلات کے موجد تھے۔ انھوں نے تاریخ میں پہلی بار اسپتال قائم کیا جہاں نہ صرف مریضوں کا علاج ہوتا تھا، بلکہ طبیبوں کی ٹریننگ اور طبی تحقیقات کا کام بھی انجام دیا جاتا تھا۔

عربوں میں یہ علمی ذوق کیسے پیدا ہوا۔ جواب یہ ہے کہ قرآن کے ذریعہ۔ قرآن میں بار بار نہایت طاقت ور انداز میں کائنات کے مطالعہ پر زور دیا گیا ہے۔ کائناتی مطالعہ پر یہ زور اگرچہ اثبات توحید اور اضافۂ ایمان کے مقصد کے تحت دیا گیا تھا۔ مگر جب کائنات کے مطالعہ کا ذہن پیدا ہو گیا تو قانون فطرت کے مطابق وہ ایک حد پر نہیں رکا۔ وہ مزید آگے بڑھا۔ اس ذہن کے دوسرے فائدے بھی نکلے۔ ان میں سے ایک فائدہ مذکورہ سائنسی ذوق کا پیدا ہونا تھا۔

صحیح ذہن اور صالح مزاج پیدا کرنے کی مہم چلائی جائے تو ابتدائی طور پر خواہ اس کا مقصد صرف ایک ہو، مگر جب وہ ظہور میں آتا ہے تو اس سے بے شمار دوسرے فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں۔

خلل سے پاک

قرآن نے اپنے بارہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ بے شک یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ اس میں باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ حکیم وحمید کی طرف سے اتاری گئی ہے (وانہ لکتاب عزیز۔ لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید) حم السجدہ ۴۱-۴۲

"باطل نہ اس کتاب کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کتاب کے پیچھے سے" یہ ایک جامع بیان ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ اندر اور باہر دونوں طرف سے محفوظ ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ داخلی اعتبار سے اس کے ماننے والے اس کے متن میں کوئی تبدیلی لاسکیں اور نہ باہر کی کوئی طاقت ایسا کر سکتی ہے کہ وہ اس میں کوئی خرابی پیدا کر دے۔

یہ ایک چیلنج بھی ہے اور ایک پیشین گوئی بھی۔ اور صدیوں پر صدیاں گزرتی جارہی ہیں مگر نہ قرآن کے اس چیلنج کو کوئی رد کر سکا اور نہ اس پیشین گوئی میں کوئی فرق واقع ہوا۔ جب کہ دور قدیم کی تمام کتابیں اس کا شکار ہو کر اپنی اعتباریت کھو چکی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں معلوم ہے کہ ان کے ہاتھ میں یہ صفت دی گئی تھی کہ جب وہ اس کو اپنی بغل میں ڈال کر اسے نکالتے تو ان کا ہاتھ سفید چمک دار ہو جاتا تھا۔ یہ واقعہ بائبل میں ان الفاظ میں درج ہے :

"پھر خداوند نے موسیٰ سے یہ بھی کہا کہ تو اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لے۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔ اس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ پھر اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لے۔ اس نے پھر اسے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لیا۔ جب اس نے اسے سینہ پر سے باہر نکال کر دیکھا تو وہ پھر اس کے باقی جسم کی مانند ہو گیا (خروج ۴ : ۶ - ۸)

اس عبارت میں "کوڑھ سے" کے الفاظ کسی یہودی عالم کا اضافہ ہیں۔ اس نے خود سے تشریح کے طور پر متن کے ساتھ یہ الفاظ لکھ دیے اور ایک عرصہ کے بعد وہ مقدس بن کر اصل متن

کا جزء بن گئے۔ یہ مثال اس بات کی ہے کہ اندر کی طرف سے کتاب میں باطل کے داخل ہونے کا کیا مطلب ہے۔
اسی طرح بیرونی حکمراں بار بار یہودی اور مسیحی مراکز پر حملہ کرکے ان کی مقدس کتابوں کے نسخے تباہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آج ان کتابوں کا کوئی بھی قدیم مستند نسخہ موجود نہیں۔ مثال کے طور پر سینٹ میتھو (Matthew) نے اپنی انجیل ابتداءً آرامی زبان میں لکھی تھی، مگر وہ ضائع ہوگئی۔ اب اس کتاب کا قدیم ترین نسخہ صرف وہ ہے جو یونانی زبان میں پایا جاتا ہے (VI/697)
قرآن کے ساتھ ایسے مختلف اسباب جمع ہوئے جنھوں نے متن قرآن میں اس قسم کے الحاق کو ناممکن بنا دیا۔ قرآن کے "حاشیہ" میں مسلمانوں نے ہر دور میں خود ساختہ اضافے کیے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ مگر کسی بھی مسلم شخصیت کے لیے یہ ممکن نہیں ہوا کہ وہ قرآن کے "متن" میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کر دے۔
مسلمانوں کا ایک گروہ جس نے علیؓ کی افضلیت کو سب سے بڑا مسئلہ بتایا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ قرآن میں علیًّا کبیرا (النساء ۳۴) کی جو آیت ہے اس میں علیًّا سے مراد خلیفہ چہارم علیؓ ہیں۔ اگر قرآن کا معاملہ دوسری کتابوں جیسا ہوتا تو قرآن میں ہم علیًّا کے ساتھ "ابن ابی طالب" بھی لکھا ہوا پاتے۔ دور عباسی میں خلق قرآن کا فتنہ اتنے بڑے پیمانہ پر پیدا ہوا جیسے یہی قرآنی عقیدہ کا سب سے بڑا مسئلہ ہو۔ مگر یہاں بھی یہی ہوا کہ سارے نزاعات باہر باہر رہے۔ اگر قرآن محفوظ کتاب نہ ہوتا تو یقینی طور پر قرآن میں یا تو مخلوق کا لفظ بڑھا دیا گیا ہوتا یا غیر مخلوق کا لفظ۔
جس زمانہ میں کمیونزم کی دھوم تھی، کچھ لوگوں نے دعویٰ کیا کہ ان الارض للہ (الاعراف ۱۲۸) کا مطلب یہ ہے کہ زمین اسٹیٹ کی ہے۔ تاہم اشتراکیت کے ان پرجوش مبلغین کے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ قرآن میں اضافہ کرکے یہ لکھ دیں کہ زمین اللہ کی ہے اور ریاست کی۔
موجودہ زمانہ میں کچھ مسلم دانشوروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ دنیا میں اسلام کی حکومت قائم کرے۔ مگر دوبارہ یہ لوگ صرف تفسیر قرآن میں یہ بات لکھ سکے، وہ متن قرآن میں ایسی بات داخل کرنے پر قادر نہیں ہوئے۔ اگر قرآن کا خصوصی معاملہ نہ ہوتا تو ہم قرآن میں اسی طرح سیاست کی ایک آیت لکھی ہوئی پاتے جس طرح انجیل میں بعد کے نسخوں میں تثلیث کی آیت لکھی ہوئی ملتی ہے :
The First Epistle General of JOHN, 5:7

قرآن کی طاقت

ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۹۶۹ - ۱۸۹۷) جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے معماروں میں سے تھے۔ آخر عمر میں وہ ہندستان کے صدر جمہوریہ بنائے گیے اور اسی عہدے پر رہتے ہوئے انتقال کیا۔ انھوں نے ریڈیو پر بہت سی تقریریں کی تھیں۔ ایک تقریر میں انھوں نے اپنے ایک ابتدائی استاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا :

" خدا بخشے علی گڑھ کے مشہور استاد مولوی عباس حسین صاحب کو۔ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی، قرأتِ قرآن کا فن ختم ہوگیا۔ میرے اپنے استاد مرحوم (جن سے میں نے قرأت سیکھی) وہ اس کے آخری جاننے والوں میں تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر " ق " کا صحیح تلفظ مٹکے کے اندر کردوں تو مٹکا پھٹ جائے " (بچوں کی تربیت، نیا کتاب گھر لاہور، صفحہ ۹۵)

کیسی عجیب بات ہے کہ وہ قرآن جس کے اندر پہاڑوں کو ہلا دینے کی طاقت تھی (الحشر ۲۱) جس کو سن کر کتنے لوگوں کے سینے شق ہوگیے (مثلاً عمر فاروق) وہ بالآخر ایک ایسے فن تک جا پہونچا جو بس مٹی کا ایک " مٹکا " توڑ سکتا تھا۔ اور اب یہ حال ہے کہ وہ کاغذ کے صفحات میں چھپا ہوا پڑا ہے، اور اس کے اندر کسی بھی چیز کو توڑنے کی صلاحیت نہیں۔ حتی کہ اغیار یہ کہنے لگے ہیں کہ قرآن اب ایک ختم شدہ طاقت (Spent force) ہے، اب وہ کوئی کارنامہ انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور نہ اس کے ذریعہ سے دنیا میں کوئی انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔

یہ حالت اس لیے نہیں ہے کہ خدانخواستہ قرآن میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے۔ قرآن میں آج بھی تسخیری قوت ہے۔ آج بھی وہ انھیں طاقتوں کا خزانہ اپنے اندر لیے ہوئے ہے جس کا اظہار اس کے نزول کے ابتدائی زمانہ میں ہوا تھا۔ البتہ قرآن کے حاملین اس محفوظ خزانہ کو حاصل کرکے اس کو باہر کی دنیا میں لانے کے قابل نہ رہے۔

قرآن کی لفظی قرأت اگر مٹکا توڑ سکتی ہے تو اس کا معنوی اظہار دلوں اور دماغوں میں زلزلہ پیدا کرسکتا ہے۔ مگر اصل کمی یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں قرآن کے معنوی اظہار کے لیے کوئی حقیقی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ موجودہ زمانہ میں قرآن کا یہ پہلو ابھی تک غیر اظہار شدہ پڑا ہوا ہے۔

قرآن کی وہ معنوی طاقت کس طرح ظاہر ہوتی ہے جو دلوں پر ضرب لگائے اور سینوں میں ہلچل پیدا کر دے۔ وہ اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن کے معانی کو کھولا جائے۔ اس کو لوگوں کے لیے قابل فہم بنایا جائے۔ اس کو لوگوں کے شعور میں اتارا جائے۔

جو لوگ عربی زبان جانتے ہیں وہ براہ راست عربی متن سے یہ تاثر حاصل کریں گے۔ اور جو لوگ عربی نہیں جانتے وہ بھی جب قرآن کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو وہ اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔

انسان فطری طور پر ایک "معبود" کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ شک اور یقین کے درمیان ہوتا ہے کہ اس کے کان میں قرآن کی یہ مرعوب کن آواز آتی ہے: افی اللہ شک فاطر السماوات والارض (کیا تم کو شک ہے اللہ کے بارہ میں جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا) اور وہ حیرانی کے ساتھ کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا، تو ہی زمین و آسمان کا خالق ہے۔ میں تیرے آگے جھک کر تیرا اقرار کرتا ہوں۔

انسان تردد میں ہوتا ہے کہ اس کائنات کا خدا ایک ہے یا اس کے کئی خدا ہیں۔ پھر وہ قرآن میں ان پُر اثر الفاظ کو پڑھتا ہے: قل ھو اللہ احد (کہہ دو کہ وہ خدا ایک ہے) اسی طرح وہ قرآن میں پڑھتا ہے کہ لو کان فیہما آلھۃ الا اللہ لفسدتا (اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو یقیناً دونوں درہم برہم ہو جاتے) اور پھر انسان کے ذہن کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ بے شک خدا صرف ایک ہے، اس کے سوا کوئی خدا یا معبود اس کائنات میں نہیں۔

انسان اس گمان میں رہتا ہے کہ زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ یہاں بس پیدا ہونا ہے اور پھر مر جانا ہے۔ اس کے بعد وہ قرآن میں پڑھتا ہے: افحسبتم انما خلقناکم عبثاً وانکم الینا لا ترجعون (المومنون ۱۱۵)

اس کے بعد وہ بے تابانہ پکار اٹھتا ہے: ربنا ما خلقت ھذا باطلا (خدایا تو نے اس کو عبث نہیں پیدا کیا) وہ حیات اور کائنات کی حقیقت سے باخبر ہو کر رب العالمین کے سامنے جھک جاتا ہے۔ اس کی بے معنی زندگی اچانک بامعنی زندگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ایک تقابل

الکزینڈر توسپکو (Aleksandr Tosipko) سوویت روس کے ایک مشہور فلسفی ہیں۔ ان کی عمر ۵۰ سال کے قریب ہے۔ وہ ماسکو کے انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اکونومک اینڈ پولیٹکل اسٹڈیز میں پروفیسر ہیں۔ نیویارک کے ہفتہ وار میگزین نیوز ویک کے نمائندہ نے ان سے ماسکو میں ملاقات کی اور ایک خصوصی انٹرویو لیا جو نیوز ویک کے شمارہ ۲۳ جولائی ۱۹۹۰ میں چھپا ہے۔ ایک سوال وجواب یہ ہے :

Q. How did your views of Marxism evolve? What was most important in your personal development?

A. When you read 'Das Kapital' it's all crystal clear by the time you reach page three. Only an idiot can really believe in Marxism.

نیوز ویک کے نمائندہ نے پوچھا کہ مارکسزم کے بارہ میں آپ کے خیالات کا ارتقا کس طرح ہوا۔ آپ کے ذاتی ارتقا میں سب سے زیادہ اہم کیا چیز تھی۔ روسی پروفیسر نے جواب دیا: جب آپ مارکس کی کتاب داس کیپٹال کو پڑھیں تو اس کے تیسرے صفحہ تک پہنچتے ہی بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ کوئی دیوانہ ہی حقیقۃً مارکسزم کی صداقت پر یقین کر سکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ اقتصادیات کے بارہ میں مارکس نے اپنی کتاب داس کیپٹال جرمن زبان میں لکھی تھی۔ وہ پہلی بار ۱۸۶۷ء میں چھپی۔ اشتراکی حضرات کا کہنا تھا کہ یہ دور جدید کا قرآن ہے۔ اب انسان کو بائبل یا قرآن کی ضرورت نہیں، اب داس کیپٹال انسان کے لیے رہنما کتاب ہے۔ مگر صرف ایک صدی کے اندر اس کا طلسم ٹوٹ گیا۔ حتیٰ کہ اب خود اشتراکی دنیا میں اس کتاب کو دیوانگی کی کتاب کہا جا رہا ہے۔

اس کے برعکس قرآن اپنی اہمیت کو چودہ سو سال سے مسلسل برقرار رکھے ہوئے ہے۔ قرآن اور صاحب قرآن کے خلاف اب تک اس قسم کی کوئی بات ثابت نہ کی جا سکی۔ قرآن آج بھی "کتاب لاریب" بنا ہوا ہے۔ یہ قرآن کی ابدی صداقت کا ایک ناقابل انکار ثبوت ہے۔

انسانی کتابوں کا حال یہ ہے کہ وہ "تیسرے صفحہ" تک پہنچتے ہی اپنی غلطی کو واضح کر دیتی ہیں۔ اس کے برعکس قرآن اپنے "آخری صفحہ" تک ایک بے خطا کتاب ہے۔ یہ علمی واقعہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے نہ کہ کوئی انسانی کتاب۔

قرآن میں اعلان کیا گیا کہ کائنات کا خالق صرف ایک ہے۔ ایک ہی عظیم ہستی ہے جس نے پوری کائنات کو تخلیق کیا ہے اور وہی تنہا اس کو چلا رہا ہے۔ مگر مشرکین نے اس کی تردید کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں بہت سی مختلف اور متضاد چیزیں ہیں۔ اسی کے ساتھ بظاہر اس میں جدا جدا نظام بھی نظر آتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق بھی متعدد ہیں اور اس کو چلانے والے بھی متعدد۔

جدید سائنس کے ظہور سے پہلے بظاہر یہ استدلال وزنی معلوم ہوتا تھا۔ مگر جدید سائنسی تحقیقات نے بتایا کہ بظاہر تنوع کے باوجود پوری کائنات ایک ہی قسم کے اجزاء سے ترکیب پاکر بنی ہے، اور وہ ایٹم ہے۔ اسی طرح مزید تحقیق نے بتایا کہ پوری کائنات ایک ہی محکم قانون کے تحت چل رہی ہے۔ اس میں کئی الگ الگ قوانین کی کارفرمائی نہیں۔ اس طرح شرک کا مفروضہ بے بنیاد ثابت ہوگیا اور توحید کا عقیدہ ایک علمی حقیقت کے طور پر ثابت شدہ بن گیا۔

قرآن میں کہا گیا کہ کائنات ابتداءً حالتِ رتق میں تھی، پھر اس کا فتق کیا گیا (الانبیاء ۳۰) نزول قرآن کے وقت یہ انوکھی بات تھی۔ مزید یہ کہ وہ ایک پرخطر پیشین گوئی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کیوں کہ اگر وہ علمی مشاہدہ میں صحیح ثابت نہ ہوتو اس کے بعد پورا قرآن مشتبہ ہو جاتا۔ مگر بیسویں صدی کے نصف ثانی میں پہنچ کر خالص سائنسی طور پر ثابت ہوگیا کہ یہ عین مطابق واقعہ بیان تھا۔ آج قرآن کی یہ پیشین گوئی بگ بینگ نظریہ کی حیثیت سے سائنس کا ایک مسلّمہ بن چکی ہے۔

قرآن میں اعلان کیا گیا کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں جو فرعون تھا، سمندر میں غرق ہونے کے بعد اس کا جسم محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ بعد والوں کے لیے نشانی کا کام دے (یونس ۹۲) جس وقت یہ اعلان کیا گیا اس وقت فرعون کے جسم کے بارہ میں دنیا کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ یہ تاریخ کے بارہ میں ایک نہایت پرخطر بیان تھا۔ مگر انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں حیرت انگیز طور پر فرعونِ موسیٰ کا مومیائی کیا ہوا جسم مصر کے ایک اہرام سے برآمد ہوگیا اور آج وہ قاہرہ کے قومی میوزیم میں مشاہدۂ عام کے لیے موجود ہے۔

اس طرح قرآن ہر دور میں اپنی صداقت کو مزید اضافہ کے ساتھ مسلّم کرتا جا رہا ہے۔ بعد کی علمی اور تاریخی دریافتیں قرآن کی تصدیق کر رہی ہیں، وہ اس کی تردید کرنے والی نہیں بنیں۔

صوتی اعجاز

۱-۶ فروری ۱۹۷۶ کو لیبیا کی راجدھانی طرابلس میں عیسائی علما، اور مسلم علما، کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا نام اسلامی مسیحی ڈائیلاگ (Islamic-Christian Dialogue) تھا۔ اس کانفرنس کو ویٹیکن اور حکومت لیبیا نے اسپانسر کیا تھا۔ اس میں شرکتوں کے تقریباً ۵۰۰ علما، اور دانشور شریک ہوئے۔

اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ مسیحی اہل علم اور مسلم اہل علم براہ راست گفت گو کرکے دونوں کے درمیان نزاعات کو ختم کریں اور باہمی طور پر امن و محبت کی فضا پیدا کریں۔ اس کانفرنس میں تین زبانوں (عربی، فرانسیسی، انگریزی) میں بولنے کا انتظام تھا۔ اس دو طرفہ بات چیت کے لیے جو موضوعات مقرر کیے گئے تھے وہ یہ تھے:

1. Can religion be an ideology for this life?
2. Social justice is the result of believing in God.
3. The common principles of faith in the two religions and points of encounter in the fields of life.
4. How to remove past and wrong judgments and lack of confidence which still separate us.

۶ فروری کی شام کو اس کانفرنس کا آخری اجلاس تھا۔ متفقہ طور پر یہ طے ہوا کہ حسن انجام کی علامت کے طور پر کانفرنس کا خاتمہ قرآن اور انجیل کی تلاوت پر ہو۔ اس کام کے لیے ایک مسیحی عالم کا انتخاب ہوا۔ طے ہوا کہ وہی قرآن کے ایک حصہ کی تلاوت کریں اور وہی انجیل کا ایک حصہ منتخب کرکے پڑھیں۔

یہ مسیحی عالم لبنان میں پیدا ہوئے۔ وہ عربی زبان بخوبی جانتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے قاہرہ میں قیام کرکے باقاعدہ طور پر تجوید سیکھی۔ اس طرح وہ ایک اچھے قاری تھے۔ ان کی انھیں خصوصیات کی بنا پر انھیں مذکورہ خدمت کے لیے سب سے زیادہ موزوں سمجھا گیا۔

پروگرام کے مطابق، مذکورہ مسیحی عالم ہی نے دونوں تلاوتیں کیں۔ انھوں نے عربی انجیل سے متی باب ۲۵ کا انتخاب کیا۔ وہ خوش الحان بھی تھے اور فن تجوید سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے بالکل مصری قاری کی طرح اس کو پڑھا۔ اس کو بہتر بنانے کے لیے انھوں نے اپنی ساری کوشش صرف کر ڈالی۔

اس کے بعد اسی مسیحی عالم نے خود اپنے انتخاب کے مطابق، قرآن سے سورہ البقرہ کا آخری رکوع اور سورہ العلق کی کچھ آیات پڑھیں۔ دونوں تلاوت میں انھوں نے تجوید اور قرأت کے اصولوں کا

پورا اہتمام کیا۔ قرآن کو انھوں نے حسب قاعدہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا، اور تلاوت کے خاتمہ پر آخر میں صدق اللہ العظیم کہا۔

یہ میری زندگی کا ایک انوکھا تجربہ تھا اور غالباً ان ایک ہزار سامعین کے لیے بھی نیا اور انوکھا تھا جو اس وقت طرابلس کے مسرح التحریر میں موجود تھے۔ اصل انجیل ایک خدائی کتاب تھی۔ مگر ظاہر ہے کہ اس کا موجودہ عربی ترجمہ عملاً ایک انسانی کلام ہے۔ اس کے برعکس قرآن کی زبان مکمل طور پر الہامی زبان ہے۔ جب دونوں کتابوں کے حصے بیک وقت لوگوں کے سامنے آئے تو دونوں کا فرق ایک کھلی ہوئی حقیقت بن کر لوگوں کے سامنے آگیا۔ یہ دو طرفہ تلاوت گویا ایک خاموش اعلان تھی کہ یہ انسانی کلام ہے اور وہ خدائی کلام۔

انجیل کی قرأت میں ساری کوشش کے باوجود کوئی شکوہ پیدا نہ ہوسکا۔ مگر انجیل کی تلاوت کے بعد جب لاؤڈ اسپیکر پر قرآن کی تلاوت کی گئی تو قرآن حیرت انگیز طور پر ایک برتر کلام کی مانند ہال کے اندر گونجنے لگا۔ اس کی مجرد سماعت ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ یہ ایک بلند تر خدائی کلام ہے نہ کہ کوئی عام انسانی کلام۔ مسیحی عالم نے انجیل کے بعد جب قرآن کی تلاوت کی تو ایسا محسوس ہوا جیسے قرآن کی آواز نے انجیل کی آواز کو نگل لیا ہو۔ اس وقت بالکل وہی منظر دکھائی دینے لگا جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: فإذا هي تلقف ما يأفكون (الاعراف ۱۱۷)

کانفرنس کی کارروائی ختم ہونے کے بعد تمام لوگ ایک بڑے ہال میں چائے پینے کے لیے جمع ہوئے۔ میں جس میز پر بیٹھا اس کے دوسرے جانب ایک نوجوان پادری تھے جو ویٹیکن سے آئے تھے۔ ان کا نام اینٹونی شولیکل (Dr Antony Shollikal) تھا۔ کانفرنس کے آخری پروگرام کا اثر ابھی سب کے ذہنوں پر باقی تھا جبکہ انجیل کی آواز پر قرآن کی آواز اس طرح چھا گئی جیسے کہ قرآن نے اس کو نگل لیا ہو۔

اس پس منظر میں چائے کی میز پر ہم دونوں کی بات شروع ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر شولیکل سے کہا: آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا قرآن خدا کی کتاب ہے۔ ڈاکٹر شولیکل سمیت تمام پادری اگرچہ کانفرنس ہال میں قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی تردید کر چکے تھے۔ مگر مذکورہ تقابلی قرأت کے زیر تاثر ان کی زبان سے نکلا ہاں۔ لیکن جلد ہی بعد انھیں محسوس ہوا کہ انھوں نے اپنے عقیدہ کے خلاف ایک بات کہہ دی۔ چنانچہ اگلے لمحہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا: مگر وہ صرف قدیم عربوں کے لیے تھا نہ کہ تمام انسانوں کے لیے۔

اندھیرے میں اجالا

سید امیر علی (۱۹۲۸-۱۸۴۹) کی مشہور انگریزی کتاب ہے جس کا نام روحِ اسلام (The Spirit of Islam) ہے۔ اس کتاب کے نویں باب میں انھوں نے ایک جرمن مستشرق کا اقتباس ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

> It was the Koran — "a book by the aid of which the Arabs conquered a world greater than that of Alexander the Great, greater than that of Rome, and in as many tens of years as the latter had wanted hundreds to accomplish her conquests; by the aid of which they alone of all the Shemites came to Europe as kings, whither the Phoenicians had come as tradesmen, and the Jews as fugitives or captives; came to Europe to hold up, together with these fugitives, the light to humanity; — they alone, while darkness lay around, to raise up the wisdom and knowledge of Hellas from the dead, to teach philosophy, medicine, astronomy, and the golden art of song to the West as to the East, to stand at the cradle of modern science, and to cause us late epigoni for ever to weep over the day when Granada fell" (p. 394).

قرآن ہی وہ کتاب ہے جس کی مدد سے عربوں نے ایک ایسی دنیا کو فتح کیا جو سکندر اعظم سے بھی زیادہ بڑی تھی، جو روم کی سلطنت سے بھی زیادہ وسیع تھی۔ اور وہ بھی چند دہے میں جس کو پورا کرنے میں موخر الذکر کو کئی سو سال لگ گیے۔ قرآن ہی کی مدد سے ایسا ہوا کہ تمام سامی اقوام میں وہ تنہا لوگ تھے جو یورپ میں حکمراں کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ جہاں فینیقی تاجر کی حیثیت سے آئے تھے، اور یہودی پناہ گیر یا قیدی کی حیثیت سے۔ وہ یورپ آئے تاکہ ان پناہ گیروں کے ساتھ انسانیت کو روشنی دکھائیں۔ جب کہ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ انھوں نے یونان کے علم وحکمت کو دوبارہ زندہ کیا۔ انھوں نے مغرب کو فلسفہ، طب، فلکیات، اور موسیقی کا زرّیں فن سکھایا جیسا کہ انھوں نے مشرق کو سکھایا تھا۔ وہ جدید سائنس کا گہوارہ بن کر کھڑے ہوے۔ اور انھوں نے ہم بعد میں آنے والوں کو اس کا ماتم کرایا جب کہ غرناطہ ان کے قبضہ سے نکل گیا۔

پچھلے زمانہ کے مسلمانوں کے لیے قرآن ایک تسخیری طاقت ثابت ہوا تھا۔ آج کے مسلمانوں کے لیے قرآن کوئی تسخیری طاقت نہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ آج کے مسلمانوں نے قرآن کی طاقت کو استعمال ہی نہیں کیا۔

دور اول میں قرآن نے اس طرح لوگوں کو متحرک کیا کہ وہ دنیا سے اندھیروں کو ختم کرنے والے اور ہر طرف اجالا پھیلانے والے بن گئے۔ ان سے لوگوں کو رہنمائی ملی، جب کہ اس سے پہلے لوگ گمراہی میں بھٹک رہے تھے۔

ایسا کیوں کر ہوا۔ وہ اس طرح ہوا کہ انھوں نے قرآن کو پڑھ کر اس میں عظیم ترین سچائی کو پایا۔ قرآن ان کے لیے حقیقتِ اعلیٰ کی دریافت کا ذریعہ بن گیا۔ قرآن نے ان کے ذہن کے بند دروازوں کو کھول دیا۔ قرآن نے ان کے سینہ میں حوصلے کے چشمے جاری کر دیے۔ قرآن نے ان کی سوچ کی سطح کو بلند کیا اور اسی کے ساتھ ان کے کردار و عمل کے معیار کو بھی اونچا کر دیا۔

انسان کو سب سے زیادہ جو چیز متحرک کرتی ہے وہ یہ کہ وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی اعلیٰ مقصد پالے۔ قرآن نے دور اول کے اہل ایمان کو یہی اعلیٰ مقصدِ حیات دیا۔ یہ مقصد اتنا بلند تھا کہ اس کی حد کہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کی ذات سے ایسے اعمال ظاہر ہوئے جو کسی حد پر رکنا نہیں جانتے تھے۔

قرآن نے ان کے شک کو یقین میں بدلا۔ قرآن نے ان کو ذاتی مفاد کے دائرہ سے اٹھا کر آفاقی مفاد کے دائرہ میں پہنچا دیا۔ قرآن نے ان کے ذہن کو جگا کر اس کے اندر سوچ کی بے پناہ طاقت بھر دی۔ قرآن نے انھیں ہر عسر میں یسر کو دیکھنے والی نگاہ عطا کر دی۔

جو لوگ اس طرح کی خصوصیات کے حامل بن جائیں وہ پہاڑ سے زیادہ طاقت ور اور سمندر سے زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ، ایک مستشرق کے الفاظ میں، ان میں سے ایک ایک شخص ہیرو بن گیا۔ حتیٰ کہ نزول قرآن کی سرزمین کا یہ حال ہوا گویا کہ وہ ہیروؤں کی نرسری بن گئی ہو۔

انسان کے اندر فطری طور پر غیر معمولی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں۔ یہ صلاحیتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کو جگانے کے لیے کسی طاقت ور فکری بھونچال کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن آدمی کے اندر یہی فکری بھونچال پیدا کرتا ہے۔ قرآن آدمی کی فطری طاقتوں کو جگا کر اسے بے پناہ بنا دیتا ہے۔ قرآن آدمی کے اندر انقلاب پیدا کر کے اس کو ایک نیا انسان بنا دیتا ہے۔ وہ انسان سے اوپر اٹھ کر سپر انسان بن جاتا ہے۔

قرآن نے فتح کیا

سر آرتھر کیتھ (Arthur Keith) ایک انگریز محقق ہے۔ وہ ۱۸۶۶ میں پیدا ہوا، اور ۱۹۵۵ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے انسانی ارتقار کے موضوع پر خصوصی ریسرچ کی ہے۔ ۱۹۴۸ میں اس کی ایک کتاب شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا ـــــ انسانی ارتقاء کے بارہ میں ایک نیا نظریہ :

A New Theory of Human Evolution

آرتھر کیتھ نے اپنی اس کتاب میں مصر کی قدیم تاریخ کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے لکھا ہے کہ اسلامی دور میں مصریوں کو مسلمانوں کی تلوار نے فتح نہیں کیا کہ بلکہ اس کو مسلمانوں کے قرآن نے فتح کیا :

The Egyptians were conquered not by the sword,
but by the Koran. (p.303, ed. 1950)

مصر کی تاریخ دنیا کی قدیم ترین تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہاں لمبی لمبی مدت تک یونانیوں، ایرانیوں اور رومیوں کا غلبہ رہا ہے۔ اسلام سے پہلے یہاں مسلسل چار سو سال تک مسیحی شہنشاہ کی حکومت قائم تھی۔ مگر ان حکومتوں کے لمبے غلبہ کے باوجود مصر کے مذہب اور تہذیب میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آسکی۔ ان میں سے ہر ایک کا غلبہ زیادہ تر سیاسی غلبہ تھا جو سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہوگیا۔

لیکن ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کا مصر میں داخلہ سراسر دوسری نوعیت کا تھا، اس نے مصریوں کی ہر چیز کو بدل دیا۔ اس سے پہلے مصریوں کی زبان قبطی تھی، اب ان کی زبان عربی ہوگئی۔ اس سے پہلے ان میں مشرکانہ تہذیب کا رواج تھا، اب ان میں موحدانہ تہذیب کا رواج ہوگیا۔ اس سے پہلے بت پرستی ان کا مذہب بنا ہوا تھا۔ اب دین اسلام ان کا مذہب بن گیا۔ اسلام نے مصریوں کے پورے فکری، اعتقادی، دینی اور تہذیبی ڈھانچہ کو بدل کر کچھ سے کچھ کر دیا۔

اتنی گہری اور اتنی دور رس تبدیلی کبھی تلوار کے ذریعہ نہیں ہوسکتی، اور نہ کبھی ایسی تبدیلی تلوار کے ذریعہ ہوئی۔ یہ تبدیلی دراصل قرآن کے نتیجہ میں تھی۔ مصریوں نے جب عربی سیکھنے کے بعد قرآن کو پڑھا تو اس نے ان کو شدت کے ساتھ متاثر کیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے تمام رواجوں کو چھوڑ کر قرآنی مذہب کے پیرو بن گئے۔

قرآن سے پہلے مصر کے لوگ انسانوں کو غریب اور امیر، چھوٹے اور بڑے، رعایا اور بادشاہ کے خانوں میں بانٹے ہوئے تھے۔ عام آدمی خاص لوگوں کے مقابلہ میں اپنے کو حقیر سمجھتا تھا۔ خاص لوگ عام لوگوں کے مقابلہ میں اپنے کو اونچا فرض کیے ہوئے تھے۔ اس طرح ایک انسان اور دوسرے انسان میں طرح طرح کے فرق و امتیاز قائم ہو گئے تھے۔

قرآن نے انسانی برابری کا اعلان کیا تو مصریوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان کو معلوم ہوا کہ وہ مفروضوں میں اور مصنوعی خیالات میں جی رہے تھے۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ اب تک اندھیرے میں پڑے ہوئے تھے اور اب خدا کی کتاب انھیں روشنی کا تعارف کرا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے۔

قرآن سے پہلے مصر کے لوگ خدا کے بارہ میں توہم پرستانہ عقیدوں میں مبتلا تھے۔ مثلاً وہ دریائے نیل کو ایک خدائی مظہر سمجھتے تھے اور ہر سال اپنی ایک لڑکی کو عمدہ کپڑے پہنا کر اس کی موجوں میں بھینٹ کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نیل دیوی اس طرح ان سے خوش رہے گی اور ان کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرنے کے لیے اپنا پانی بھیجتی رہے گی۔

قرآن نے خالص توحید کا اعلان کیا۔ قرآن نے بتایا کہ خدا ایک ہے۔ ساری کائنات اور تمام دریا اور پہاڑ اسی کی مخلوق ہیں۔ سارا اختیار صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ آدمی کو اسی سے ڈرنا چاہیے اور اسی سے اپنی حاجتوں کو مانگنا چاہیے۔

قرآن کی یہ بات مصریوں کے دل کی بات بن گئی۔ ان کی فطرت ایک خالق کا تقاضا کر رہی تھی، مگر توہماتی خداؤں میں ان کی روح کو سچی تسکین نہیں ملتی تھی۔ یہ عقیدے انھیں اپنی فطرت کے مطابق نظر نہیں آتے تھے۔ وہ رواجی طور پر ان کو پوجتے تھے مگر ان کا دل ان کی صداقت پر پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا تھا۔

قرآن نے جب خدا کا بے آمیز تصور پیش کیا تو وہ انھیں اپنے دل کی آواز معلوم ہوا۔ وہ اس میں اپنی روح کی تسکین پانے لگے۔ انھیں محسوس ہوا کہ یہی وہ حقیقت ہے جس کی تلاش ان کی فطرت میں چھپی ہوئی تھی۔ انھوں نے دوڑ کر قرآن کے دین کو اختیار کر لیا۔ یہی معاملہ ساری دنیا میں پیش آتا رہا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد ایک بلین تک پہنچ گئی۔

حق کی یافت

بیکی ہاپکنس ایک امریکی خاتون ہیں، وہ عیسائی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن کا مطالعہ کیا اور اتنا متاثر ہوئیں کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کا ایک مفصل خط ایک امریکی میگزین میں چھپا ہے۔ اس کا کچھ حصہ ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں :

جن سوالوں کا جواب میں اپنی پوری زندگی میں تلاش کرتی رہی ہوں، ان کا جواب پانا میرے لیے کتنا زیادہ تسکین کا باعث ہے اس کو لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھا ہو اور پھر اچانک وہ سچائی کو دیکھنے لگے اور ایسی روشنی کو پالے جس کو اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ میں اس خوشی کو کیوں کر بیان کر سکتی ہوں جو صرف سچائی کو پانے سے حاصل ہوتی ہے۔

میں چاہتی ہوں کہ میں نے جو چیز پائی ہے اس کو میں ساری دنیا کے سامنے گاؤں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر شخص جس کو میں نے کبھی جانا ہو وہ اس میں میرا حصہ دار بنے۔ اور جو دروازہ میرے لیے کھلا ہے اس پر جشن منانے میں وہ میرا شریک ہو۔

اور سب سے زیادہ بڑی اور سب سے زیادہ عجیب چیز جو مجھے دکھائی گئی وہ قرآن تھا۔

How can I put into words the overwhelming relief that I feel upon having discovered the answer to the questions I've been searching for all my life? It's like being blind and then suddenly given sight to a truth and a brightness never seen before. How can I tell of the joys that only finding the truth can bring? I want to sing it to the world. I want everyone I have ever known to share this with me and celebrate the door that has been opened to me. And the most wonderful and awesome thing shown to me was the glorious Qur'an. How I love and cherish my Qur'an! How I read it every chance I get! I cannot put it down! Even in English the words can bring joy to my heart and tears to my eyes! There've been many times when I held Allah's words in my hands and wept at the revelation. How could I have been such a fool all of my life? I shudder to think of my life without Islam. If I could climb to the highest mountain and be heard by everyone who is blind to Islam, I would shout all that has been shown to me. My questions have been answered. I now know the truth. If every person in the world thanked Allah for bringing me the truth, one hundred times a day for one hundred years, that still would not express my gratitude. (Becky Hopkins)

Islamic Horizons, December 1987, Bridgeview, Illinios, USA

کتنا زیادہ میں اپنے قرآن سے محبت کرتی ہوں۔ جب بھی مجھے موقع ملتا ہے تو میں اس کو پڑھتی ہوں۔ میں اس کو اپنے سے الگ نہیں رکھ سکتی۔ حتیٰ کہ انگریزی ترجمہ میں بھی اس کے الفاظ میرے دل کو مسرت دیتے ہیں اور میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

کتنی ہی بار ایسا لمحہ آیا ہے جب کہ میں نے خدا کی کتاب کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور اس کے بارہ میں سوچ کر میں روئی ہوں۔ اس کے بغیر میری ساری زندگی کتنی احمقانہ زندگی ہوتی۔ اسلام کے بغیر میری زندگی کیسی ہوتی، اس کو سوچ کر میں کانپ اٹھتی ہوں۔

اگر میں سب سے زیادہ اونچے پہاڑ پر چڑھ سکتی اور میری آواز ہر اس آدمی تک پہنچ سکتی جو اسلام سے بے خبر ہے تو میں چلا کر ان کو وہ بتاتی جو مجھے بتایا گیا ہے۔ میرے سوالات کا جواب مجھے مل گیا۔ اب میں جانتی ہوں کہ سچائی کیا ہے۔ ہر آدمی جو دنیا میں ہے، وہ مجھ کو سچائی ملنے پر اگر اللہ کا شکر ادا کرے، اور وہ ایک سو سال تک ہر روز ایک سو بار ایسا ہی کرتا رہے تب بھی اس احسان پر شکر کا حق ادا نہیں ہوگا (بیکی ہاپکنس)

مذکورہ امریکی خاتون کے لیے قرآن اتنی حیرت انگیز دریافت کیوں بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسان کی تلاش کا جواب ہے۔ اس خاتون نے، بہت سے دوسرے مردوں اور عورتوں کی طرح، اس میں اپنی تلاش فطرت کا جواب پالیا۔ اور اپنی تلاش کا جواب پانے سے زیادہ بڑی خوشی انسان کے لیے اور کوئی نہیں۔

قرآن روح انسانی کا ثنی ہے۔ انسان عین اپنی پیدائش کے اعتبار سے سچائی کا طالب ہے۔ اسی فطری اور عالم گیر سچائی کو بتانے کے لیے تمام پیغمبر آئے، تمام پیغمبروں نے ایک ہی سچائی کا اعلان کیا۔ مگر پچھلے پیغمبروں کی بتائی ہوئی تعلیمات اپنی اصل حالت میں محفوظ نہ رہ سکیں۔

مگر آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی کتاب (قرآن) آج بھی اپنی اصل اور ابتدائی حالت میں کامل طور پر محفوظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ دوسری مقدس کتابوں نے تبدیلیوں کے نتیجہ میں انسانی فطرت کے ساتھ اپنی مطابقت کھو دی ہے، جب کہ قرآن اپنی اس مطابقت کو پوری طرح باقی رکھے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن آج تمام انسانوں کے لیے سچائی کا واحد ماخذ بن گیا ہے۔

معجزاتی کلام

محمد مارماڈیوک پکتھال (۱۹۳۶-۱۸۷۵) ایک انگریز نومسلم تھے۔ انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ کیا ہے جو کافی مشہور ہے۔ انھوں نے اپنے ترجمہ قرآن کے ساتھ ایک دیباچہ لکھا ہے۔ اس دیباچہ میں وہ قرآن کے ترجمہ کے مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس ترجمہ میں متن کے مطابق موزوں زبان اختیار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ عربی قرآن کی جگہ انگریزی قرآن تیار ہو گیا ہو۔ عربی قرآن ایک ناقابل تقلید نغمگی کا مجموعہ ہے۔ اس کی مجرد آواز ہی آدمی کے اندر ارتعاش پیدا کر کے اس کو رلا دیتی ہے۔ اور اس پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہے:

Every effort has been made to choose befitting language. But the result is not the Glorious Qur'an, that inimitable symphony, the very sounds of which move men to tears and ecstasy.

وہ چیز جس کو فنی اصطلاح میں ساؤنڈ آرٹ کہا جاتا ہے، وہ قرآن کی زبان میں بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ ایک قاری جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کا صوتی آہنگ اتنا شاندار ہوتا ہے کہ نہ سمجھنے والے لوگ بھی اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔

ساؤنڈ آرٹ یا صوتی آہنگ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ذوقی چیز ہے۔ اس کے بعض ظاہری پہلوؤں کو اشاراتی طور پر بیان کیا جا سکتا ہے مگر اس کی مکمل لفظی تشریح ممکن نہیں۔ یہاں اس کی وضاحت کے لیے ایک سادہ مثال درج کی جاتی ہے۔ قرآن کی ایک آیت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ (آل عمران ۱۴۶)

اس آیت میں رِبّیون کی جگہ رَبّانیون بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے معنی بالکل ایک ہیں۔ لیکن اگر اس آیت میں موجودہ لفظ بدل کر رَبّانیون رکھ دیا جائے تو آیت کا سارا صوتی آہنگ بگڑ جائے گا۔ یہی ہم آہنگ نغمگی پورے قرآن میں اپنے کمال درجہ میں پائی جاتی ہے۔

قرآن ایک معجزہ ہے اپنے معنی کے لحاظ سے بھی اور اپنے الفاظ کے لحاظ سے بھی۔ ایک شخص عربی زبان جانتا ہو اور وہ قرآن میں غور وفکر کرے تو وہ اس کے اندر معانی کے اعتبار سے خدائی عظمت کا ادراک کرے گا۔ لیکن اگر ایک شخص اس کے معانی پر دھیان نہ دے، وہ صرف اس کی آواز سنے تب بھی وہ اس سے غیر معمولی نوعیت کا گہرا تاثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تاریخ میں دونوں قسم کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ پہلی نوعیت کی بھی اور دوسری نوعیت کی بھی۔ فرانس کے پروفیسر موریس بکائی (Maurice Bucaille) قرآن کی معنوی عظمت سے متاثر ہوئے اور انھوں نے قرآن کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ کتاب لکھی جو حسب ذیل نام سے عمومی شہرت حاصل کر چکی ہے:

The Bible, The Qur'an and Science

انگلستان کے پروفیسر آربری (Arthur J Arberry) ایک بار تیونس میں مقیم ہوئے۔ ان کے پڑوس میں ایک مسلمان کا مکان تھا۔ ایک روز مسلمان ریڈیو پر قرآن کی قرأت سن رہا تھا۔ یہ آواز پروفیسر آربری کے کان میں پہونچی۔ وہ اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن کا مطالعہ شروع کیا، ان کی دلچسپی یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے قرآن کا مکمل ترجمہ انگریزی زبان میں کر ڈالا۔ یہ ترجمہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے حسب ذیل نام کے تحت شائع ہوا ہے:

The Koran Interpreted

قرآن کی یہ معجزاتی تاثیر ہر دور میں ظاہر ہوتی رہی ہے۔ دور اول میں مکہ اور مدینہ اور باہر کے قبائل میں جو لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے وہ سب قرآن کو سن کر اور پڑھ کر اسلام میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد پوری تاریخ میں قرآن اسلام کا سب سے زیادہ طاقت ور ہتھیار ثابت ہوا ہے۔ ہر زمانہ میں قرآن کا غیر معمولی اسلوب اور اس کا آسمانی خطاب افراد اور قوموں کو مفتوح کرتا رہا ہے۔

قرآن ایک ایسا کلام ہے جو اپنے اندر بے پناہ تسخیری قوت رکھتا ہے۔ اپنی خاموش معنویت کے اعتبار سے بھی، اور اپنی غیر معمولی ربانی آواز کے اعتبار سے بھی۔

قرآن اور عربی زبان

رومن امپائر کے زمانہ میں امپائر کی عام زبان لاتینی تھی۔ تاہم مختلف علاقوں میں لہجوں کا فرق تھا۔ زبان ایک تھی مگر لہجہ کے اعتبار سے وہ الگ الگ انداز میں بولی جاتی تھی۔ چوں کہ لہجہ کے اس فرق کو کسی ایک وحدت میں باندھے رکھنے کا ان کے پاس کوئی طاقتور ادبی معیار موجود نہ تھا، یہ فرق بڑھتا رہا، یہاں تک کہ لہجوں کا فرق بالآخر زبانوں کا فرق بن گیا اور وہ مختلف زبانیں وجود میں آئیں جن کو اب رومی زبانیں (Romance languages) کہا جاتا ہے۔

یہی مختلف زبانیں ہیں جن کو موجودہ زمانہ میں فرانسیسی، اسپینی، اطالوی، پرتگالی، رومانی زبانیں کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ یورپ کی بہت سی چھوٹی چھوٹی زبانیں مثلاً سارڈی نین وغیرہ (Occitan, Catalan, Sardinian, Rhaetian, Creoles) بھی اسی قدیم اصل کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ اس طرح ایک زبان کچھ صدیوں کے بعد ایک درجن زبان بن گئی۔

ایک زبان سے کئی زبان بننے کا یہی واقعہ عربی زبان کے ساتھ بھی پیش آسکتا تھا۔ قدیم زمانہ میں مختلف عرب قبائل کے لہجوں میں زبردست فرق پایا جاتا تھا۔ آج بھی لہجوں کا یہ فرق مختلف عرب علاقوں میں بدستور موجود ہے۔ ایک لہجہ کا آدمی دوسرے لہجہ کے آدمی کی بات کو بمشکل سمجھ سکتا ہے۔

اس واضح فرق کے باوجود تمام عرب علاقوں کی تحریری زبان ایک رہی۔ وہ کئی زبان نہ بن سکی۔ عربی زبان کی وحدت براہ راست قرآن کا کرشمہ ہے۔ یہ تمام تر قرآن کا تاثیری کارنامہ ہے کہ اس نے عربی زبان کو ایک تحریری صورت پر باقی رکھا، اس نے عربی کو باعتبار تحریر، کئی زبان بننے نہیں دیا۔ بولنے کے وقت آدمی اپنے قبیلے کے لہجہ کی پیروی کرتا تھا، مگر لکھنے کے وقت وہ قرآن کی پیروی کرنے پر مجبور تھا۔ اس طرح قرآن کا طاقت ور ادبی معیار ان کے لہجاتی فرق پر اس طرح چھایا رہا کہ اس نے ان کو الگ الگ ہونے سے روک دیا۔

قرآن سے پہلے عرب میں زیادہ تر صرف شاعری کا رواج تھا۔ لوگ اشعار کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اہل عرب کے نزدیک، قرآن سب سے پہلا کلام ہے

جو نثر کی صورت میں سامنے آیا (ان القرآن اول ظاهرة نثرية فنية عند العرب ، جوزیف الہاشم، المفید فی الادب العربی)

پروفیسر ہٹی نے قرآن کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن کی ادبی تاثیر کا اندازہ اس وقت ہوجاتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ یہ صرف قرآن ہی تھا جس کی وجہ سے ایسا ہوا کہ عربوں کی مختلف بولیاں الگ الگ زبان کی صورت اختیار نہ کرسکیں، جیسا کہ رومی زبانوں کے ساتھ پیش آیا۔ آج ایک عراقی اگرچہ ایک مراکشی کی گفت گو کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتا ہے، مگر وہ اس کی تحریری زبان کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتا۔ کیوں کہ عراق اور مراکش، اور اسی طرح شام، عرب، مصر، ہر جگہ کلاسیکی زبان کی حیثیت سے وہی عربی زبان رائج ہے جس کا ماڈل قرآن نے تیار کردیا ہے۔ محمدؐ کے وقت عربی نثر کی کوئی باقاعدہ کتاب موجود نہ تھی۔ اس بنا پر قرآن سب سے قدیم نثری کتاب ہے اور یہی کتاب اول روز سے عربی نثر کا ماڈل بنی ہوئی ہے۔ اس کی زبان میں نغمہ ہے مگر وہ شعر نہیں۔ اس کی پُرنغمہ نثر نے ایک ایسا معیار قائم کردیا ہے کہ تقریباً ہر قدامت پسند عرب ادیب آج تک اہتمام کے ساتھ اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, London 1970, p. 127

قرآن نے عربی زبان پر بیک وقت دو ایسے اثرات ڈالے ہیں جس کی مثال کسی بھی دوسری زبان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک یہ کہ قرآن نے عربی کو نظم سے نثر کی طرف موڑ دیا۔ قرآن سے پہلے عربی دورِ شعر میں تھی، قرآن کے بعد وہ دورِ نثر میں داخل ہوگئی۔

دوسرا بے مثال اثر یہ ہے کہ قرآن نے عربی زبان کو ایک ایسا اعلیٰ اور آخری ماڈل دیدیا جو گویا عربی زبان کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ قرآن کی یہی خصوصی دین ہے جس کی وجہ سے عربی زبان آج بھی اپنی سابقہ صورت میں زندہ ہے۔ اس کے بغیر عربی کا وہی انجام ہوتا جو دوسری تمام زبانوں کے ساتھ بلا استثناء پیش آیا ہے۔ قرآن نے جب یہ اعلان کیا کہ وہ ابدی ہدایت نامہ ہے تو اس میں یہ چیز شامل تھی کہ اس کی زبان ہمیشہ ایک زندہ زبان کی حیثیت سے باقی رہے گی۔ اور تاریخ ثابت کرتی ہے کہ قرآن کا اعلان اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ پورا ہوکر رہا۔

بادشاہ جھک گیا

ابن الاثیر نے اپنی کتاب الکامل فی التاریخ میں ۳۶۶ ھ کے حالات کے تحت لکھا ہے کہ اس سال ذوالقعدہ کے مہینہ میں قاضی منذر بن سعید البلوطی کی وفات ہوئی۔ وہ اندلس کے قاضیوں کے قاضی (چیف جسٹس) تھے۔ وہ فقیہہ، خطیب، شاعر، فصیح اور نہایت دین دار تھے۔

ایک دن وہ اندلس کے سلطان عبدالرحمٰن الناصر کے یہاں آئے۔ اس وقت سلطان زہرا محل کی تعمیر سے فارغ ہوا تھا۔ اس وقت وہ ایک گنبد کے اندر بیٹھا تھا جس کو سونے سے سجایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر ایسی نادر تھی کہ سابق میں اس کی کوئی مثال موجود نہ تھی۔

سلطان کے پاس بڑے بڑے لوگ جمع تھے۔ عبدالرحمٰن الناصر نے کہا۔ کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ کبھی کسی نے اس طرح کی عمارت بنائی ہے۔ تمام لوگوں نے کہا کہ ہم نے نہ کبھی ایسا دیکھا اور نہ ایسا سنا۔ انھوں نے تعریف کی اور تعریف میں مبالغہ کیا۔

قاضی منذر سر جھکائے ہوئے تھے۔ عبدالرحمٰن ان کی طرف مخاطب ہوا اور ان سے پوچھا کہ آپ اپنی رائے بتائیں۔ قاضی منذر رونے لگے۔ ان کے آنسو ان کی داڑھی تک پہنچ گئے۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم، مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ شیطان، خدا اس کو رسوا کرے، تم کو اس حد تک پہنچا دے گا۔ اور تمہارے اوپر اتنا زیادہ قابو پالے گا حالانکہ اللہ نے تم کو بہت کچھ دیا ہے اور تمہارے اوپر فضل کیا ہے۔ اس کے باوجود شیطان تم کو کافروں کے درجہ میں پہنچا دے گا۔

عبدالرحمٰن الناصر نے کہا کہ دیکھئے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیسے شیطان نے مجھ کو کافروں کے درجہ میں پہنچا دیا۔ قاضی منذر نے اس کے جواب میں قرآن کی یہ آیتیں پڑھیں :

ولولا ان یکون الناس امة واحدة لجعلنا لمن یکفر بالرحمٰن لبیوتهم سقفا من فضة ومعارج علیها یظهرون۔ ولبیوتهم ابوابا	اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ ایک ہی طریقہ کے ہو جائیں گے تو جو لوگ رحمٰن کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور زینے بھی جن

وسرراً عليها يتكئون - وزخرفا وان كل ذلك لما متاع الحياة الدنيا والآخرة عند ربك للمتقين (الزخرف ۳۲ - ۳۵)

پر وہ چڑھتے ہیں۔ اور ان کے گھروں کے کواڑ بھی اور تخت بھی جن پر وہ تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں اور سونے کے بھی۔ اور یہ چیزیں تو صرف دنیا کی زندگی کا سامان ہیں اور آخرت تیرے رب کے پاس متقیوں کے لیے ہے۔

قاضی منذر بن سعید البلوطی کی حیثیت حکومت کے ایک ملازم کی تھی۔ اور عبد الرحمٰن الناصر کی حیثیت اندلس کے سلطان کی۔ مگر جب قاضی منذر نے قرآن کی مذکورہ آیتیں پڑھیں تو اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا :

فوجم عبد الرحمٰن وبكى وقال : جزاك الله خيراً واكثر في المسلمين مثلك (۸/۴، ٦)

اس کے بعد عبد الرحمٰن غم میں پڑ گیا اور اپنا سر جھکا کر رونے لگا۔ اس نے کہا کہ اللہ آپ کو اس کا اجر دے اور آپ جیسے بہت سے لوگ مسلمانوں میں پیدا کرے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی صورت میں کیسی عظیم چیز اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے۔ قرآن براہ راست اللہ کا کلام ہے۔ وہ کسی بھی قسم کی آمیزش کے بغیر مکمل طور پر اصل حالت میں موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔ اس کی پشت پر تاریخ کی وہ تمام عظمتیں جمع ہو چکی ہیں جو کتاب خداوندی کے شایان شان ہیں۔ ان چیزوں نے قرآن کو عظمت و جبروت والی ایک کتاب بنا دیا ہے جس طرح قرآن کو اتارنے والا خدا عظمت و جبروت والا خدا ہے۔

قرآن کی اس عظمت کا یہ نتیجہ ہے کہ جب اس کا حوالہ دیا جائے تو بادشاہ بھی اس کا انکار کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ قرآن کی بنیاد پر ایک کمزور آدمی ایک طاقت ور کو ایسی اعلیٰ سطح سے مخاطب کر سکتا ہے کہ بڑا آدمی اپنی بڑائی کو بھول جائے اور اس کے آگے ایک عاجز کی طرح ڈھ پڑے۔

قرآن بذات خود ایک طاقت ہے، خواہ اس کے ساتھ کوئی اور طاقت موجود نہ ہو۔

قرآن کا کرشمہ

اسلام سے پہلے عرب میں تعلیم بہت کم تھی۔ ۸ھ میں جو اثنا (بحرین، الحسار) جیسے بڑے مقام پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک تبلیغی خط بھیجا۔ راوی کہتے ہیں کہ سارے علاقے اور قبیلہ میں ایک شخص بھی نہ تھا جو خط کو پڑھ سکے۔ لوگ تلاش کرتے رہے یہاں تک کہ ایک نوجوان ملا جس نے خط کو پڑھ کر سنایا۔ تقریباً اسی زمانہ کا واقعہ ہے، النمر بن تولب مسلمان ہوئے۔ وہ ایک بڑے قبیلہ کے سردار تھے اور اتنے بڑے شاعر تھے کہ ان کے اشعار کا ایک دیوان تیار ہوا ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے انھیں ان کے قبیلۂ عکل (یمن) کا سردار مقرر کر کے ایک تحریری پروانہ عطا کیا۔ مگر وہ اس کو پڑھ نہیں سکتے تھے۔ بازار میں آکر پوچھنے لگے "کیا آپ لوگوں میں کسی کو پڑھنا آتا ہے جو یہ خط پڑھ مجھ کو سنا دے"

کہا جاتا ہے کہ بعثتِ نبویؐ کے وقت شہر مکہ میں مشکل سے چند درجن آدمی ایسے مل سکتے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔ مدینہ میں اس سے بھی کم عرب یہ فن جانتے تھے۔ لیکن دوسری صدی ہجری ہی میں عربی زبان علمی نقطۂ نظر سے دنیا کی متمول ترین زبان بن گئی۔ عربوں میں لسانی ترقی کا زمانہ اتنا مختصر ہے کہ دنیا کی پرانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

عربوں کی تیز رفتار علمی اور لسانی ترقی کا یہ واقعہ کیوں کر پیش آیا۔ یہ حیرت انگیز واقعہ براہ راست قرآن کا کرشمہ تھا۔ قرآن ایک کتاب دعوت ہے۔ جو شخص قرآن سے متاثر ہوتا ہے اور اس پر ایمان لاکر اسے پڑھتا ہے، اس کو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ قرآن نے اس کو داعی بنا دیا ہے۔ اس کا دل و دماغ داعی کا دل و دماغ بن جاتا ہے۔ اس کے اندر یہ سیلاب امنڈ پڑتا ہے کہ اس نے جس ابدی صداقت کو خدا کی کتاب کے ذریعہ پایا ہے، اس کو وہ تمام انسانوں تک پہنچا دے۔

یہ دعوتی جذبہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ زبانوں کو سیکھے۔ وہ ہر طرح کی واقفیت حاصل کرے۔ وہ اپنے آپ کو علمی اعتبار سے مسلح کرے۔ پہلے اگر وہ بے زبان تھا تو اب وہ بازبان بن جاتا ہے۔ پہلے اگر وہ بے علم تھا تو اب وہ باعلم ہو جاتا ہے۔ دعوت اپنی عین فطرت کے اعتبار سے آدمی کو صاحبِ علم اور صاحبِ شعور بنا دیتی ہے۔ دعوت کے ساتھ بے علمی اور بے شعوری کا جمع ہونا ممکن نہیں۔

قرآن آدمی کو صرف داعی بننے کی نصیحت نہیں کرتا۔ وہ قرآن کی صورت میں آدمی کو ایسا دعوتی ہتھیار دیتا ہے جس کی تسخیری طاقت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

مسٹر سنیل گوپال چندرا سامنتا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو ہیں۔ وہ ایک تجارتی سفر کے تحت احمد آباد سے دہلی آئے اور ۱۲ جون ۱۹۹۱ کو راقم الحروف سے ملے :

Sunil Gopal Samanta, M.B.A., LL.M.
64, Arihant Society, Ahmedabad 300007, Tel. 414281

انھوں نے کہا کہ میں نے قرآن کو ہندی ترجمہ کی مدد سے پڑھا ہے۔ اس کتاب نے میرے اوپر بہت اثر ڈالا۔ اس کو پڑھتے ہوئے دل ہل جاتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان سے قرآن اور اسلام کے بعض پہلوؤں پر گفتگو ہوئی۔ آخر میں انھیں ہندی الرسالہ اور " انسان اپنے آپ کو پہچان " کا ہندی ترجمہ دیا گیا۔

ایک عام مسلمان جو قرآن کو صرف " تلاوت " کی کتاب سمجھتا ہے، اس کو اس بات کا اندازہ نہیں کہ قرآن کتنی زلزلہ خیز کتاب ہے، اور جو شخص اس کو سمجھ کر پڑھتا ہے، اس کو یہ کتاب کس طرح ہلا دیتی ہے۔ مشرق اور مغرب میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے، میں ان کے حالات خاص طور پر پڑھتا ہوں۔ میں نے پایا ہے کہ ان میں سے اکثر کے لیے قرآن کا مطالعہ اسلام کی طرف لانے کا سبب بنا۔

شاہ عبدالقادر صاحب (۱۸۱۴-۱۷۵۴) نے اپنے ترجمہ " موضح القرآن " کے مقدمہ میں اس بارہ میں اپنے مخصوص سادہ انداز میں جو کچھ لکھا ہے وہ یہاں نقل کرنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "بتانے والے بہتیرا بتائیں، جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے، ویسا کوئی نہیں بتا سکتا۔ اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے، کسی کلام میں نہیں"۔

مسلمانوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ قرآن کے پیغام کو تمام دنیا کی قوموں تک پہونچائیں۔ اس پیغام رسانی کی موثر ترین عملی صورت یہ ہے کہ قرآن کا صحیح اور مستند ترجمہ تمام زبانوں میں کیا جائے اور اس کو چھاپ کر ساری دنیا میں پھیلایا جائے۔ خدا منتظر ہے کہ اس کا پیغام اس کے تمام بندوں تک پہونچایا جائے۔ جو لوگ اس کام کے لیے اٹھیں وہ بلاشبہ اپنے رب کے یہاں سب سے بڑے انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔

ناقابلِ اعتبار

تورِن (Turin) اٹلی کا ایک قدیم شہر ہے۔ یہاں کے بڑے مسیحی چرچ (Cathedral) میں ۱۵۷۸ء سے ایک مقدس کپڑا رکھا ہوا ہے۔ یہ ایک پرانا کھدر کا کپڑا ہے۔ اس کے اوپر عکس کے انداز میں ایک انسانی خاکہ (image) نظر آتا ہے۔ اس کو عام طور پر تورِن کا کفن (Shroud of Turin) کہا جاتا ہے۔ یعنی حضرت مسیح کا کفن۔

۱۹۰۲ میں بیالوجی کے دو مسیحی پروفیسر اس کی تحقیق کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ انھوں نے تحقیق کے بعد رپورٹ دی تھی کہ کفن کے اوپر جو تصویری خاکہ ہے وہ رنگا ہوا نہیں ہے بلکہ حقیقۃً وہ انسانی جسم کا نقش ہے اور یہ کہ یہ نقش حضرت مسیح کے جسم کا ہے:

After studying this evidence, two professors of biology presented to the Academie des Sciences in 1902 their conclusions: that the image on the shroud is not a painting, that it is actually the imprint of a human body, and that the image is that of Jesus Christ.
(IX/172)

موجودہ زمانہ میں سائنس دانوں نے اس کپڑے (مزعومہ کفن مسیح) کو تحقیق کا موضوع بنایا۔ کئی سالوں کی سائنسی ریسرچ کے بعد آخر کار ثابت ہوگیا کہ یہ فرضی کفن ہے نہ کہ حقیقی کفن۔ یہ کپڑا اگر حقیقی کفن ہوتا تو اس کی عمر دو ہزار سال ہونی چاہیے تھی۔ مگر کاربن ڈیٹنگ کے ذریعہ جانچ سے معلوم ہوا کہ اس کی عمر صرف چند سو سال ہے۔

روم کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۱۴ جنوری ۱۹۹۱ (صفحہ ۸) میں اس کی بابت ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ یہ پوری خبر ذیل میں درج کی جاتی ہے:

Shroud of Turin Loses Credibility

The Holy Shroud of Turin, regarded by the Roman Catholic Church as having been used to cover the body of Christ after his death, is in danger of losing its historical credibility. The scientists have recently reached new conclusions on the age of the shroud which differs widely from that reached earlier in 1988. These new theories are explained in two books recently published in Italy, The Shroud and Enigma to Test Science by Orazio Petrosiloo and Emanuela Marinelli and Shroud or Not by Pier Lugi Baina Bollone.

تورن کا مقدس کفن جس کے متعلق رومن کیتھولک چرچ کا خیال تھا کہ یہ وہ کپڑا ہے جو حضرت مسیح کی موت کے بعد ان کے جسم کو ڈھانکنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا، اس کو یہ خطرہ درپیش ہے کہ وہ اپنے حق میں تاریخی اعتباریت کھو دے۔ حال میں سائنس داں اس کفن کی عمر کے بارہ میں نئے نتائج تک پہنچے ہیں۔ یہ نتائج اس سے بہت زیادہ مختلف ہیں جہاں وہ ۱۹۸۸ میں پہنچے تھے۔ یہ نئے نظریات دو نئی کتابوں میں بیان کیے گئے ہیں جو حال میں اٹلی میں شائع ہوئی ہیں۔

پچھلے سیکڑوں سال سے مسیحی چرچ کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ وہ کپڑا ہے جس میں مصلوب ہونے کے بعد حضرت مسیح کا جسم رکھا گیا تھا۔ آپ کے جسم کا عکس اس کپڑے میں آگیا۔ ۱۸۹۸ء میں اس کا پہلا فوٹو لیا گیا۔ اس فوٹو کو بغور دیکھا گیا تو لوگوں کو یہاں تک نظر آگیا کہ (نعوذ باللہ) صلیب دیتے ہوئے آپ کے جسم پر جو کیلیں ٹھونکی گئی تھیں، ان کا نشان بھی مفروضہ کفن میں موجود ہے۔

مگر بعد کی زیادہ معتبر سائنسی تحقیقات نے ثابت کیا کہ یہ سارا عقیدہ محض فرضی تھا۔ جس کپڑے کو حضرت مسیح کا کفن سمجھ لیا گیا تھا، وہ حضرت مسیح کا کفن نہ تھا۔ بلکہ حضرت مسیح کے رفع کے ہزار سال بعد کسی شخص نے ایک کپڑا لے کر اس کو خاص انداز میں رنگا اور یہ مشہور کر دیا کہ یہ حضرت مسیح کا کفن ہے۔

دوسرے مذاہب کے بہت سے عقائد اسی طرح موجودہ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں غلط ثابت ہو گئے ہیں۔ مگر اسلام حیرت انگیز طور پر اس سے مستثنیٰ ہے۔ ہر قسم کی جانچ کے باوجود اسلام کی کوئی بات غیر معتبر ثابت نہ ہو سکی، یہ اس بات کا ایک علمی ثبوت ہے کہ اسلام ایک غیر محرف مذہب ہے، اور دوسرے تمام ادیان محرف مذہب۔

مثال کے طور پر قرآن میں حضرت موسیٰ کے زمانہ کے فرعون کا ذکر ہے اور اس کی سرکشی پر اس کی غرقابی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ آج ہم تمہارے بدن کو محفوظ کر دیں گے تاکہ وہ باقی رہے اور آئندہ آنے والوں کے لیے نصیحت بنے (یونس ۹۲) قرآن میں جب یہ آیت اتری، اس وقت یہ حقیقت سراسر غیر معلوم تھی۔ مگر انیسویں صدی کے آخر میں یہ دریافت ہوا کہ مصر کے اہرام کے اندر اس فرعون کی مومیائی کی ہوئی لاش موجود ہے۔ چنانچہ اس پر کاربن ڈیٹنگ کا عمل کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اسی فرعون کی لاش ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں غرق ہوا تھا۔

قرآن محافظ ہے

اللہ تعالیٰ نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے :

یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ و اللہ یعصمک من الناس (مائدہ ۶۷)	اے رسول، جو کچھ تمہارے اوپر اتارا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دو ۔ اور اگر تم نے اس کو نہیں پہنچایا تو تم نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔

اس آیت کے مطابق قرآن (اللہ کی اتاری ہوئی کتاب) حاملین قرآن کے بچاؤ کی ضمانت ہے۔ قرآن کے حامل کو صرف قرآن کا حامل بننا ہے۔ اس کے بعد اس کے تمام مسائل میں خدا اس کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔

قرآن بلا شبہہ اس دنیا میں ہمارا محافظ ہے۔ وہ جن وانس کے تمام فتنوں کے مقابلہ میں ہماری حفاظت کرتا ہے۔ مگر قرآن کو اپنا محافظ بنانے کی ایک لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ ہم قرآن کے ساتھ غیر قرآن کو جمع نہ کریں۔ پانی کے ساتھ اگر آپ راکھ کو جمع کر لیں تو ایسا پانی آپ کی پیاس نہیں بجھاتا۔ کھانے کے ساتھ اگر آپ پتھر کو جمع کر لیں تو ایسا کھانا آپ کو سیر نہیں کرتا۔ پھر جس قرآن کے ساتھ غیر قرآن کو جمع کر لیا گیا ہو وہ حقیقی قرآن کے نتائج کس طرح دکھائے گا۔

قرآن چاہتا ہے کہ ہم اس کو تبلیغ کی کتاب بنائیں۔ اس کے برعکس ہم اس کو برکت کی کتاب بنا کر چھوڑ دیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ ہم دوسری اقوام کو اپنا مدعو سمجھیں، اس کے برعکس ہم ان کو اپنا حریف اور رقیب بنا ڈالیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ ہم اس کو اپنی زندگی کے لئے رہنما کتاب بنائیں۔ اس کے برعکس ہم اس کو قومی فخر کی کتاب بنا ڈالیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ ہم لوگوں کے درمیان خدائی اخلاقیات کے ساتھ رہیں۔ اس کے برعکس ہم ان کے درمیان شیطانی اخلاقیات کے ساتھ رہنے لگیں۔

اس قسم کا ہر عمل قرآن کے ساتھ گویا غیر قرآن کو جمع کرنا ہے۔ اور جو لوگ قرآن کے ساتھ غیر قرآن کو جمع کریں۔ قرآن کبھی ان کا محافظ نہیں بن سکتا۔ یہ اعمال تو قرآن کو چھوڑنے کے ہم معنی ہیں۔ پھر جو لوگ قرآن کو چھوڑ چکے ہوں ان کی زندگی میں قرآن کے وہ نتائج کیسے نکل سکتے ہیں جو قرآن کو اپنے ساتھ لینے کی صورت میں نکلتے ہیں۔

قرآن خاص طور پر دو طرح سے اہل ایمان کا محافظ بنتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اہل ایمان کے دلوں میں آخرت کا خوف پیدا کرتا ہے۔ ان کو ذمہ دار اور با اخلاق زندگی گزارنے کے قابل بناتا ہے۔ وہ ہر انسان کے خیر خواہ بن جاتے ہیں۔ وہ ہر انسان کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرتے ہیں۔ ضد اور تعصب اور نفرت اور سرکشی جیسے جذبات سے ان کا سینہ پاک ہوجاتا ہے۔ وہ لوگوں کو دینے والے بن جاتے ہیں تاکہ خدا انھیں دے۔ وہ لوگوں سے درگزر کرنے لگتے ہیں تاکہ آخرت میں ان کا خدا ان سے درگزر کا معاملہ فرمائے۔

یہ اوصاف جن افراد کے اندر پیدا ہوجائیں وہ اپنے سماج کے اندر محبوب بن جاتے ہیں۔ ہر ایک کے دل میں ایسے لوگوں کی عزت بیٹھ جاتی ہے۔ وہ لوگوں کو اپنے آپ سے بلند دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اور جو لوگ اخلاقی اعتبار سے دوسروں سے بلند ہوجائیں، وہ کبھی دوسروں کے ظلم کا شکار نہیں ہوسکتے۔

قرآن کی حفاظت کا دوسرا ذریعہ وہ ہے جس کو دعوت کہا جاتا ہے۔ اہل ایمان جب قرآن کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں تو دوسروں کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ قرآن تو ان کے لیے سراسر رحمت ہے۔ یہ تو ان کی اپنی چیز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ بڑی تعداد میں قرآن پر ایمان لانے لگتے ہیں۔ لوگ جوق در جوق قرآن کے دین کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو سماجی طاقت کا وزن اپنے آپ اہل ایمان کے حق میں چلا جاتا ہے۔ دین حق کا پھیلاؤ اہل ایمان کے لیے حفاظت کی مضبوط ڈھال بن جاتا ہے۔

اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا یہ انتظام فرمایا کہ اس نے تاریخ انسانی میں ایک عظیم انقلاب پیدا فرما دیا۔ یہ انقلاب دور اول کے مسلمانوں کے ہاتھوں ظہور میں آیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ تمام اسباب ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئے جو قدیم زمانہ میں کسی آسمانی کتاب کو غیر محفوظ بنا دیتے تھے۔

اب خود عالمی حالات قرآن کی حفاظت کے ضامن بن گئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مذہبی آزادی کا مسلّم ہوجانا۔ علمی اور تاریخی ذوق کا رواج۔ جدید پریس کا ظہور۔ سائنسی اور صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں توہماتی ذہن کا خاتمہ۔ اس قسم کے مختلف اسباب ہیں جنھوں نے اس کو ناممکن بنا دیا ہے کہ قرآن کو کوئی غیر محفوظ کتاب بنا سکے۔

خدا سے ڈرو

قرآن ، جیساکہ معلوم ہے، ۲۳ سال میں تھوڑا تھوڑا کرکے اترا۔ اس کا آغاز اقرأ (پڑھ) سے ہوا۔ پیغمبر کے واسطہ سے خدا انسان کو پڑھاتا رہا۔ وہ انسان کو اس کی زندگی کی تعمیر کے بارہ میں وہ تمام باتیں بتاتا رہا جس کو وہ خود سے نہیں جان سکتا تھا۔

اس طرح خدا کتاب ہدایت کے اجزاء بھیجتا رہا۔ یہاں تک کہ خدائی منصوبہ کے مطابق جب کتاب پوری ہوگئی تو اس کی آخری آیت اتری۔ یہ ایک لمبی آیت ہے جو موجودہ قرآن میں سورہ مائدہ کی تیسری آیت کے طور پر شامل ہے۔ اس آیت کا ایک حصہ یہ ہے:

الیوم یئس الذین کفروا من دینکم	آج منکرین تمہارے دین سے ناامید ہو گئے، پس
فلا تخشوھم واخشون الیوم اکملت	ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے
لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت	لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے اوپر
لکم الاسلام دینا (المائدہ ۳)	اپنے انعام کو پورا کر دیا۔

اس آیت سے مسلمانوں نے اپنے لئے فخر کی غذا تو بہت لی ہے مگر اس سے انھوں نے سبق کی غذا نہیں لی۔ ہر مسلمان آپ کو یہ فخر کرتا ہوا ملے گا کہ ہمارا دین کامل ہے۔ مگر ایسے لوگ آپ کو نہیں ملیں گے جو اس سے اس سبق کو لینے کی کوشش کریں جو اس آیت میں ہمارے لئے رکھ دیا گیا ہے۔

"تم اب لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف خدا سے ڈرو" اس سے یہ تعین ہو رہا ہے کہ مسائل میں مسلمانوں کے سوچنے کا انداز کیا ہونا چاہئے۔ وہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمان اپنے مسائل و مشکلات میں انسان کی طرف نہ دیکھیں بلکہ خدا کی طرف دیکھیں۔

انسانوں کی طرف سے معاملہ پیش آئے تب بھی وہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ وہ خدا کے ساتھ اپنے معاملہ کو درست کرکے سمجھیں کہ انسانوں کے ساتھ بھی ان کا معاملہ درست ہو جائے گا۔

پیغمبر اسلام کا لایا ہوا دین چونکہ آخری دین ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اس حد تک محفوظ اور مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ مسلمان اگر اپنے دین پر قائم ہوں تو یہی ان کے استحکام کی یقینی ضمانت بن جائے ۔

قرآن کی اس آیت میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ قرآن کے بعد خدا کا دین خشیتِ انسانی کے دور سے نکل کر خشیتِ خداوندی کے دور میں داخل ہو گیا۔ اب اگر اہل ایمان کو خطرہ ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ خدا کے دین کے معاملہ میں کوتاہی کریں۔

خشیت بشری کے دور کے ختم ہونے کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے ذریعہ انسانی تاریخ میں ایک ایسا انقلاب لایا گیا ہے جو ابدی طور پر اس دین کا محافظ بن گیا ہے۔ اس انقلاب کے مختلف پہلو ہیں :

۱۔ اس انقلاب کے ذریعہ مذہبی تعذیب (religious persecution) کا دور ختم ہوا اور مذہبی آزادی کا دور آ گیا۔ اب یہ ممکن ہو گیا کہ آزادانہ طور پر قرآن کی تعلیمات پر عمل کیا جائے اور اسی کے ساتھ آزادانہ طور پر لوگوں کو اس سے متعارف کیا جائے۔

۲۔ اس انقلاب کے بعد ساری دنیا میں آزادانہ تحقیق (free inquiry) کا دور شروع ہوا۔ اس کے نتیجہ میں خالص علمی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن کے سوا تمام مذہبی کتابیں تاریخی اعتبار سے غیر معتبر ہیں۔ اب معتبر مذہبی کتاب صرف ایک ہے، اور وہ قرآن ہے۔

۳۔ اس انقلاب کے نتیجہ میں دنیا میں سائنسی دور آیا۔ فطرت کے راز دریافت ہوئے۔ اس کی وجہ سے قرآن کے بیانات خالص سائنسی معیار پر ثابت شدہ بن گئے۔ حتی کہ کسی کے لیے اس کا انکار کرنا ناممکن ہو گیا۔

۴۔ اس انقلاب کے بعد پریس کا دور آیا اور جدید ذرائع ابلاغ تک انسان کی رسائی ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں یہ ممکن ہو گیا کہ قرآن کے پیغام کو کسی رکاوٹ کے بغیر ساری دنیا کی قوموں تک پہنچایا جا سکے۔ دین حق کا کلمہ ہر چھوٹے بڑے گھر میں داخل کر دیا جائے۔

۵۔ اس انقلاب کے نتیجہ میں علم کا پھیلاؤ ہوا۔ حتی کہ اس انقلاب نے قرآن اور اسلامی لٹریچر کو تمام دنیا کے ناشرین کتب کی ضرورت بنا دیا۔ تمام تعلیم گاہوں اور یونیورسٹیوں میں قرآن اور دین اسلام کی تعلیم کے شعبے کھل گئے۔ دنیا بھر کی لائبریریوں میں اسلامی لٹریچر فراہم کیا جانے لگا۔

اس معاملہ کی تفصیل راقم الحروف کی دوسری کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سائنس داں کی گواہی

سر جیمس جینس (James Jeans) مشہور انگریز سائنس داں ہیں ۔ وہ ۱۸۷۷ میں لندن میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۶ میں ڈورکنگ میں ان کی وفات ہوئی ۔ طبیعیات ، میتھمیٹکس اور فلکیات میں انھوں نے بہت سی نئی دریافتیں کیں ۔ کیمبرج یونی ورسٹی اور پرنسٹن یونی ورسٹی میں انھوں نے ۱۹۰۵ اور ۱۹۱۲ کے درمیان پروفیسر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں ۔

اس زمانہ میں جب کہ سر جیمس جینس سائنس کے استاد تھے ، ان کے شاگردوں میں ایک ہندستانی نوجوان بھی شامل تھا جو بعد کو علامہ عنایت اللہ مشرقی (۱۹۶۳ - ۱۸۸۸) کے نام سے مشہور ہوا ۔ عنایت اللہ مشرقی انگلینڈ میں زمانۂ قیام کا ایک ذاتی واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں :

" ۱۹۰۹ کا ذکر ہے ۔ اتوار کا دن تھا اور زور کی بارش ہو رہی تھی ۔ میں کسی کام سے باہر نکلا تو کیمبرج یونی ورسٹی کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس پر نظر پڑی جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے ۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا ۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا ۔ دوبارہ سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے : تم کیا چاہتے ہو ۔ میں نے کہا کہ دو باتیں ۔ اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے ۔ سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا کھول لیا ۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرہ آفاق آدمی گرجا میں عبادت کے لیے جا رہا ہے ، یہ کیا ۔

میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز لمحہ بھر کے لیے رک گئے ، اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا : آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو ۔ چنانچہ میں شام کو ان کی رہائش گاہ پہنچا ۔ ٹھیک ۴ بجے لیڈی جیمز باہر آ کر کہنے لگیں : سر جیمز تمہارے منتظر ہیں ۔ اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی ۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے کرسی پر بیٹھے تھے ۔

کہنے لگے : تمہارا سوال کیا تھا ۔ اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق ، ان کے حیرت انگیز نظام ، بے انتہا پہنائیوں اور فاصلوں ، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں ، نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریا و جبروت پر دہلنے لگا ۔

سر جیمز جینس کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے حیرت وخشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں۔ اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے: عنایت اللہ خاں، جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی خدا کے جلال سے لرزنے لگتی ہے۔ اور جب میں چرچ میں خدا کے سامنے جھک کر کہتا ہوں کہ تو بہت بڑا ہے، تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہمنوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ دوسروں کی نسبت مجھ کو عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے۔ کہو عنایت اللہ، کیا تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں چرچ کیوں جاتا ہوں۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کر دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ جناب والا، میں آپ کی روح افروز تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت مجھے یاد آ گئی۔ اگر اجازت ہو تو اس کو پیش کروں۔ انھوں نے کہا کہ ضرور۔ اس کے بعد میں نے یہ آیت پڑھی:

ومن الجبال جُدَدٌ بیضٌ وحُمرٌ مختلف الوانہا وغرابیبُ سود۔ ومن الناس والدوابِّ والانعام مختلفٌ الوانہ کذلک۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (فاطر ۲۷–۲۸)	اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ مختلف رنگوں کے ٹکڑے ہیں، اور گہرے سیاہ بھی۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ کے ہیں۔ اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

اس آیت کو پڑھنے کے بعد علامہ مشرقی نے اس کا انگریزی ترجمہ انھیں سنایا۔ اس کو سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے: کیا کہا۔ اللہ سے صرف علم والے لوگ ڈرتے ہیں، حیرت انگیز، بہت عجیب۔ یہ بات جو مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ ومشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمد کو کس نے بتائی۔ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے۔ اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمد اَن پڑھ تھے۔ ان کو یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی۔ ان کو یقیناً اللہ نے یہ بات بتائی۔ بہت خوب، بہت عجیب۔

علم میں اضافہ اللہ کی معرفت میں اضافہ کرتا ہے۔ آدمی کا علم جتنا بڑھتا ہے اتنا ہی زیادہ اللہ پر اس کا یقین بڑھتا چلا جاتا ہے۔

قرآن کی تاثیر

اے جے آربری (A.J. Arberry) ایک انگریز مصنف ہے۔ اس نے قرآن کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ وہ عربی زبان بخوبی جانتا تھا۔ اس لیے وہ قرآن کو براہ راست اس کی اصل زبان میں سمجھ سکتا تھا۔ آربری نے لکھا ہے کہ جب بھی کسی کی زبان سے میں قرآن کو پڑھتے ہوئے سنتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں موسیقی کو سن رہا ہوں۔ قرآن کے رواں نغمہ میں مسلسل ایک قسم کے نقارہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میرے لیے یہ دل پر ضرب لگانے کی مانند ہے :

Whenever I hear the Qur'an chanted, it is as though I am listening to music. Underneath the flowing melody there is sounding all the time the incessant beat of a drum. It is like the beating of my heart.

قرآن خدا کا کلام ہے۔ اس میں نہ صرف معنوی اعتبار سے غیر معمولی عظمت ہے، بلکہ اس کے لفظی آہنگ میں بھی انتہائی غیر معمولی قسم کا ربانی نغمہ پایا جاتا ہے۔ آدمی سمجھے بغیر بھی قرآن کی آواز سے متاثر ہوتا ہے، اور اگر وہ قرآن کو سمجھتا بھی ہو تو قرآن کا سننا اس کے دل کو ہلا دے گا، وہ اس کی روح میں ایک قسم کے بھونچال کی کیفیت پیدا کر دے گا۔

تربیت و تزکیہ کے لیے سب سے زیادہ کامیاب وسیلہ بلاشبہ قرآن ہے۔ آدمی اگر قرآن کو پڑھے یا اس کی قرأت کو سنے تو وہ اس کے اندر چھپے ہوئے فطرت کے تاروں کو چھیڑتا ہے، وہ اس کو ان روحانی کیفیات سے آشنا کرتا ہے جو خدا کی نسبت سے بندہ کے اندر پیدا ہونا مطلوب ہیں۔

اسی کے ساتھ قرآن سب سے زیادہ موثر دعوتی کتاب ہے۔ اگر قرآن کے ایسے کیسٹ تیار کیے جائیں جن میں کسی اچھے قاری کی قرأت محفوظ کی گئی ہو، اور قرأت کے بعد اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ریکارڈ کیا گیا ہو، اور پھر اس کو جگہ جگہ سنایا جائے، تو وہ اسلام کی اشاعت کا نہایت کارگر ذریعہ ثابت ہوگا۔

قرآن تربیت بھی ہے اور دعوت بھی۔ قرآن زندگی کا رہنما بھی ہے اور ہر قسم کی برکت کا ذریعہ بھی۔ انسان جو کچھ چاہتا ہے، قرآن وہ سب کچھ ہے اور اسی کے ساتھ مزید بہت کچھ بھی۔ مسلمان اگر صرف قرآن کو پکڑ لیں تو وہ تنہا ان کے لیے ہر اعتبار سے کافی ہو جائے۔

عظمتِ رسول

پیغمبر کی اہمیت

فلسفہ اور مذہب کا فکری میدان تقریباً ایک ہی ہے۔ دونوں کا مقصد حقیقت کی دریافت ہے۔ معلوم تاریخ کے مطابق، پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ مدت سے دونوں کی سرگرمیاں جاری ہیں۔

مگر دونوں میں ایک عجیب فرق پایا جاتا ہے۔ فلسفہ لمبی مدت تک بہترین انسانی دماغوں کے ذریعہ غیر معمولی کاوش کرتا رہا۔ اس کے باوجود کوئی انسانی سماج تشکیل دینے میں اسے کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اور نہ فلسفہ کی بنیاد پر کبھی کوئی قابل ذکر ریاست وجود میں آئی۔ حتیٰ کہ فلسفہ کوئی مکمل فکری نظام بنانے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس مذہب کی بنیاد پر بار بار انسانی معاشرہ تشکیل دیا گیا ہے اور ریاست کی تنظیم وجود میں آئی ہے۔ خاص طور پر اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ مذہب اسلام کی بنیاد پر عظیم انسانی سماج بنایا گیا اور نہایت طاقت ور ریاست کی تشکیل ہوئی۔

انجام کے اعتبار سے دونوں کے درمیان اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب فلسفہ کی داخلی فکری کوتاہی ہے۔ فلسفہ جس حقیقت کی تلاش میں ہے اس کو وہ کبھی دریافت نہ کر سکا۔ فلسفہ آج بھی اسی طرح تلاشِ حقیقت کے مرحلہ میں ہے جس طرح وہ اول روز تھا۔ شاعر کا یہ شعر مکمل طور پر فلسفہ کی تاریخ پر صادق آتا ہے:

فلسفی سرِحقیقت نتوانست کشود گشت راز دگر آں راز کہ افشاں می کرد

اصل یہ ہے کہ انسان اپنی محدودیتوں کی وجہ سے حقیقت کو اس کی آخری صورت میں دریافت نہیں کر سکتا۔ جس طرح سورج کو براہ راست انسانی آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں، اسی طرح حقیقت کا براہ راست مشاہدہ بھی انسان کی استطاعت سے باہر ہے۔ سائنس نے انسان کی اس محدودیت کو تسلیم کر لیا۔ اس لیے کم از کم ٹکنکل مفہوم کے اعتبار سے سائنس کو یہ کامیابی ملی کہ وہ انسانی تمدن کی تشکیل کر سکے۔ مگر فلسفہ انسانی محدودیت کو تسلیم کرنے پر راضی نہ تھا۔ اس لیے وہ آخری انجام تک بھی نہیں پہنچا۔ وہ ہمیشہ کھوج کے مرحلہ میں باقی رہا۔

پیغمبر انسان کی اسی کوتاہی کا بدل ہے ۔ پیغمبر انسان کی اسی محدودیت کو مکمل کرتا ہے ۔ پیغمبر انسان کو اس منزل تک لے جاتا ہے جہاں وہ خود اپنی کوشش سے پہنچ نہیں سکتا تھا ۔

پیغمبر اس استثنائی شخص کا نام ہے جس کو خدا اس لیے چُنتا ہے کہ اس کو اپنے فرشتہ کے ذریعہ علم کلی سے آگاہ کرے ، اور پھر یہ پیغمبر دوسرے تمام انسانوں کو اسے بتائے ۔ پیغمبر خدا اور انسان کے درمیان واسطہ کا کام کرتا ہے ۔

خدا کی طرف سے آنے والے تمام پیغمبروں نے یہی خاص وظیفہ انجام دیا ۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی قسم کے ایک پیغمبر تھے ، تاہم آپ میں اور دوسروں میں یہ فرق ہے کہ دوسرے پیغمبروں کی تعلیمات اپنی اصل ابتدائی صورت میں باقی نہیں رہیں ، جب کہ آپ کی تعلیمات پوری طرح محفوظ حالت میں موجود ہیں ۔ اور آپ کی زندگی کے حالات ایک معلوم تاریخی حقیقت کی مانند ہمارے سامنے ہیں ۔ اب محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم ہی دین خدا کو معلوم کرنے کا واحد مستند ذریعہ ہیں ۔

اس اعتبار سے پیغمبر انسان کے لیے انتہائی قیمتی تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ آپ کی مدد سے انسان وہ چیز حاصل کر سکتا ہے جس کو وہ کسی بھی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں کر سکتا یعنی ایک صحیح اور مبنی بر حقیقت فکر ، اور پھر اس کی بنیاد پر مطلوب انسانی معاشرہ کی تشکیل ۔

سائنس تمدن کو ترقی دے سکتی ہے مگر وہ انسانیت کی تشکیل نہیں کر سکتی ۔ انسانی ساخت کے نظام کچھ ظاہری ڈھانچے بنا سکتے ہیں مگر وہ انسان کو امن اور سکون کا تحفہ نہیں دے سکتے ۔ انسانیت کی حقیقی تشکیل اور امن اور سکون کا سچا معاشرہ صرف اسی وقت بن سکتا ہے جب کہ پیغمبر کی رہنمائی کو قبول کر کے اسے انجام دیا جائے ۔

پیغمبر گویا ہمارا راستہ کی روشنی ہے ۔ پیغمبر ہماری عقل کی صحیح رہنمائی کرتا ہے ۔ پیغمبر ان سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جن کو ہم خود اپنی کوشش سے حاصل نہیں کر سکتے تھے ۔ پیغمبر ہمارے لیے بھٹکاؤ سے بچنے کی ضمانت ہے ۔ پیغمبر کی رہنمائی ایسی کامل رہنمائی ہے جس میں بیک وقت ماضی اور حال اور مستقبل کے تمام پہلوؤں کی رعایت شامل ہے ۔

تاریخی پیغمبر

محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو جو چیزیں ملیں، ان میں سے ایک اہم چیز وہ ہے جس کو قرآن میں "مقام محمود" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آپ کے ذریعہ دنیا کو نبوت محمودی (بالفاظ دیگر نبوتِ معترف) حاصل ہوئی۔ یعنی ایسی نبوت جو مانی ہوئی نبوت ہو، جس کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہ رہے۔

قرآن میں جن دو درجن پیغمبروں کا ذکر ہے اور ان کے علاوہ خدا کی طرف سے جو پیغمبر آئے وہ سب سچے پیغمبر تھے۔ ہم ان سب پر یکساں طور پر ایمان رکھتے ہیں (لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ) مگر ایک شخص جو خالص عقلی اور تاریخی اعتبار سے جانچنا چاہے، وہ پیغمبروں کے بارہ میں بہت سی واقعاتی باتیں جاننا چاہے گا۔ مثلاً وہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ کب پیدا ہوئے۔ ان کے والدین کا نام کیا تھا۔ وہ کون سی زبان بولتے تھے۔ کیا ان کے ہم عصر مورخین نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ وغیرہ

اس قسم کے لوگ جب ان پہلوؤں سے پچھلے پیغمبروں کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ پاتے ہیں کہ ان پیغمبروں کے بارہ میں ہر بات، غیر معلوم ہے۔ مثلاً مصر کی تاریخ میں حضرت موسیٰ کا ذکر نہیں۔ حضرت مسیح سے پہلے پیدا ہونے والے یونانی فلسفی اور یونانی سرداروں کا ذکر تاریخ میں موجود ہے مگر حضرت مسیح کا ذکر موجود نہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی ثابت شدہ نہیں کہ حضرت مسیح کون سی زبان بولتے تھے۔ برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے:

Historically, it is quite doubtful whether Christ ever existed at all.

یہی معاملہ دوسرے تمام پیغمبروں کا ہے۔ اہل ایمان بلاشبہ ان کو پیغمبر مانتے ہیں۔ مگر غیر اہل ایمان جو معاملہ کو علمی اور تاریخی طور پر جانچنا چاہتے ہیں، وہ یہاں ایسے واقعات و حقائق نہیں پاتے جن کی روشنی میں وہ اپنے علمی سوالات کا جواب پاسکیں۔ مگر محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا معاملہ استثنائی طور پر مختلف ہے۔ آپ کی پوری زندگی شروع سے آخر تک معلوم اور محفوظ ہے۔ وہی لوگ جو دوسرے پیغمبروں کے تذکرہ کے تحت کہتے ہیں کہ ان کے واقعاتِ زندگی تاریخی طور پر نامعلوم ہیں، وہی جب محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کو لکھنا پڑتا ہے:

Muhammad was born within the full light of history.

اللہ نے خالص علمی اعتبار سے آپ کو اتنا ثابت شدہ بنا دیا ہے کہ کسی شخص کے لیے آپ کو پہچاننا مشکل نہ رہے۔

پیغمبر اسلام ؐ نے انسان کو اس کے حقیقی خدا سے متعارف کرایا۔ تو ہم پرستانہ مذہب کی جگہ سچا خدائی مذہب انسان کو دیا۔ آپ کا ظہور ساری انسانیت کے لیے رحمت اور نعمت تھا۔

خدا کو چھوڑنے کا واحد بدل تو ہم پرستی ہے۔ خدا کو چھوڑنے کے بعد غیر خدا کو خدا بنانا پڑتا ہے۔ مخلوق سے وہ تعلق قائم کرنا پڑتا ہے جو صرف خدا سے قائم کرنا چاہیے۔ قدیم زمانہ میں شرک کے غلبہ کی وجہ سے انسان مسلسل تو ہم پرستی کا شکار رہا۔ غیر خدا کی پرستش کی وجہ سے وہ خدا کی معرفت حاصل نہ کر سکا۔ پیغمبر اسلام کے ذریعہ جو انقلاب لایا گیا اس کا مقصد یہی تھا کہ انسان کے اوپر سے اس تاریک دور کو ختم کیا جائے۔ توحید کے انقلاب (اور اس کے نتیجہ میں آنے والے سائنسی انقلاب) نے انسان کو خدا سے متعارف کر کے توہم پرستی کے دور کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں قرآن میں بتائی گئی ہیں: محمد رسول اللہ وخاتم النّبیین (الاحزاب ۴۰) آپ اسی طرح ایک رسول تھے جس طرح دوسرے تمام رسول خدا کی طرف سے آئے۔ آپ میں اور دوسرے رسولوں میں "رسول" ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا۔ مگر اسی کے ساتھ آپ کی ایک اور حیثیت تھی۔ وہ یہ کہ آپ خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد دوسرا کوئی نبی آنے والا نہیں۔

نبوت انسانی دنیا کے لیے خدا کا اہم ترین مطلوب ہے۔ نبی خدا کے منصوبہ تخلیق کا ایک لازمی جزء ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں مسلسل نبی بھیجے جاتے رہے (المومنون ۴۴) اس لیے ختم نبوت کا فیصلہ لازمی طور پر بدل نبوّت کا تقاضا کرتا ہے۔ نبوت اس کے بغیر ختم نہیں کی جا سکتی کہ دنیا کے لیے اس کا ایک بدل فراہم کر دیا گیا ہو۔

ثابت شدہ دین اسی مقصد کو پورا کرتا ہے۔ تاریخی طور پر مسلّم اور ثابت شدہ دین گویا نبوّت کے بعد نبوّت کا بدل ہے۔ خدا نے جب یہ فیصلہ کیا کہ اب نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا جائے، اسی وقت اس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ دین کو ہمیشہ کے لیے ایک ثابت شدہ حقیقت (Established truth) بنا دیا جائے۔ تاکہ پہلے زندہ پیغمبر کے ذریعہ انسان کو جو رہنمائی دی جا رہی تھی، وہ ہر دور میں انسان کو حاصل ہوتی رہے۔

اسلام کے انقلاب نے انسان کو توہم پرستی کے دور سے نجات دیدی۔ اسی کے ساتھ اس کو ثابت شدہ نبوت کے دور میں پہونچا دیا تاکہ خدا کے پیغمبر کو پہچاننے میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

وَخاتم النبیّین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں : ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین (الاحزاب ۴۰) خاتم کے معنی عربی زبان میں وہی ہیں جس کے لیے انگریزی زبان میں سیل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک چیز ہے طابع یا مہر (Stamp) اور دوسری چیز ہے خاتم یا سیل (Seal) کسی چیز کو مستند قرار دینے کے لیے اس پر جو نشان لگایا جاتا ہے وہ طابع یا اسٹیمپ ہے۔ اور کسی چیز کو آخری اور محفوظ قرار دینے کے لیے اس پر جو ٹھپہ ڈالا جائے، وہ خاتم یا سیل ہے۔

اس آیت کے مطابق، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حیثیت یہ ہے کہ آپ رسول اللہ ہیں، اور دوسری حیثیت یہ ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ رسول اللہ ہونے کے اعتبار سے آپ اسی طرح خدا کے رسول ہیں جس طرح دوسرے تمام رسول۔ مگر اسی کے ساتھ آپ کی ایک امتیازی حیثیت بھی ہے جو کسی اور رسول کو حاصل نہیں۔ وہ یہ کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ آپ پر نبیوں اور رسولوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا (خُتِم بی النبیّون)

خاتم النبیین ہونے کا مطلب سادہ طور پر صرف یہ نہیں کہ آپ فہرست انبیاء کے آخری فرد ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آخری نبی ہونا اپنے ساتھ بہت سے نہایت اہم تقاضے رکھتا ہے۔ یہ تمام تقاضے آپ کے اوپر اپنی کامل ترین صورت میں پورے ہوئے۔

اس کا ایک تقاضا یہ ہے کہ وحی خداوندی پوری طرح محفوظ ہو جائے۔ اس میں کسی بھی قسم کی تحریف یا تبدیلی کا امکان باقی نہ رہے۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نہایت طاقتور انتظام فرمایا ہے۔ چنانچہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اب تک آپ کے لائے ہوئے دین میں کوئی تحریف نہ کی جا سکی۔ قرآن آج بھی اسی طرح محفوظ حالت میں موجود ہے جیسا کہ وہ آپ کے زمانہ میں تھا۔

پیغمبر صرف پیغام رساں نہیں ہوتا، اسی کے ساتھ وہ لوگوں کے لیے نمونہ عمل (Role model) بھی ہوتا ہے جس کو قرآن میں اسوہ (الاحزاب ۲۱) کہا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ ہر قسم کے حالات آپ کے اوپر گزریں تاکہ آپ ہر اعتبار سے ساری انسانیت کے لیے نمونہ بن سکیں۔ چنانچہ سیرت اور حدیث کی کتابیں بتاتی ہیں کہ واقعۃً ایسا ہی ہوا۔ آپ کی زندگی ہر قسم کے واقعات سے بھری ہوئی زندگی ہے۔ ہر صورت حال اور ہر موڑ کے لیے آپ کی زندگی میں نمونہ موجود ہے۔ وغیرہ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں یہ اعلان کہ آپ آخری رسول ہیں، ایک اعتبار سے آپ کی حیثیت نبوت کا اعلان ہے۔ دوسرے اعتبار سے یہ آپ کی نبوت کے حق میں ایک پیشگی دلیل بھی ہے۔ کیوں کہ اس اعلان کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ آئندہ پوری انسانی تاریخ میں آپ کے پیغمبر خدا ہونے کی حیثیت مسلسل طور پر برقرار رہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی رخنہ پیدا نہ ہونے پائے۔

اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ اصولی طور پر نبوت کی اہمیت کبھی ختم نہ ہو۔ انسان ہمیشہ نبوت کا محتاج رہے۔ یہ حقیقت پچھلے چودہ سو سال سے مسلسل برقرار ہے۔ انسان نے متعدد بار یہ دعویٰ کیا کہ وہ نبوت سے مستغنی ہو چکا ہے۔ مگر جلد ہی اس کا دعوی باطل ثابت ہو گیا۔ مثلاً جدید سائنس کے ظہور کے بعد کچھ لوگوں نے اس قسم کا دعویٰ کیا۔ اسی طرح مارکسزم کے ظہور کے بعد اسی قسم کا دعوی کیا گیا۔ مگر سائنس نے جلد ہی اپنی محدودیت کا اقرار کر لیا۔ اور مارکسزم اپنے پہلے ہی تجربہ میں سراسر بے بنیاد ثابت ہو گیا۔

اسی طرح اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ علم انسانی کا ارتقاء کوئی ایسی بات ثابت نہ کر سکے جو آپ کی لائی ہوئی تعلیمات یا اس کے کسی اصول کو رد کرنے والا ہو۔ اس معاملہ میں بھی آپ کی حیثیت کامل طور پر برقرار ہے۔ پچھلی صدیوں میں انسانی علوم نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ مگر اب تک کوئی ایک بات بھی ایسی سامنے نہیں آئی جو آپ کی دی ہوئی ہدایت کی جزئی یا کلی تردید کرنے والی ہو۔

اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ انقلابات کی آندھیاں آپ کی جلائی ہوئی روشنی کو بجھانے پر قادر نہ ہو سکیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو آپ کے ظہور کے بعد مختلف قسم کی آندھیاں اٹھیں۔ مثلاً عباسی دور میں علوم یونانی کی آندھی۔ اس کے بعد تاتاریوں کا طوفان۔ اس کے بعد لمبی مدت تک صلیبی لڑائیاں۔ اس کے بعد سائنسی انقلاب، اس کے بعد اشتراکی ہنگامہ، وغیرہ۔ اس قسم کے مختلف طوفان بار بار آ رہے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی اس پر قادر نہ ہو سکا کہ وہ آپ کے نور ہدایت کو بجھا دے۔

آج ایک بلین انسان آپ کے دین کی پشت پر ساری دنیا میں آباد ہیں۔ سطح ارض کا بہت بڑا حصہ مسلم قوموں کے قبضہ میں ہے۔ مسلم دنیا کے تحت پٹرول اور ہر قسم کے قدرتی ذخائر وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ان چیزوں نے آپ کے دین کو اتنا مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی بھی اس کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

اس قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ آپ کی آخری رسول ہونے کی حیثیت تاریخ میں مسلسل طور پر برقرار ہے۔ اس میں کسی پہلو سے کوئی نقصان پیش نہیں آیا۔ یہ بلاشبہ آپ کے نبیٔ برحق ہونے کی ایک واضح تاریخی دلیل ہے۔

بائبل کی گواہی

حضرت موسیٰ مشہور اسرائیلی پیغمبر ہیں۔ ان کا زمانہ ۱۳-۱۴ ویں صدی قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ اور اسلامی پیغمبر حضرت محمدؐ کا زمانہ ۵-۶ ویں صدی عیسوی ہے۔ یعنی دونوں کے درمیان تقریباً دو ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ حضرت موسیٰ کی کہی ہوئی جو باتیں موجودہ بائبل میں موجود ہیں ان میں سے ایک بات یہ ہے جو انھوں نے اپنے زمانہ کے اسرائیلیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہی :

خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔ اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ جو بات خداوند نے نہیں کہی ہے اسے ہم کیوں کر پہچانیں۔ تو پہچان یہ ہے کہ جب وہ نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور اس کے کہے کے مطابق کچھ واقع یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں بلکہ اس نبی نے وہ بات خود گستاخ بن کر کہی ہے۔ (Deuteronomy 18:15-22)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ کلام واضح طور پر ایک پیشین گوئی ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد میری ہی طرح کا ایک پیغمبر آنے والا ہے۔ حضرت موسیٰ کے بعد کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ صرف ایک ہی پیغمبر ہیں جو کہ مثل موسیٰ تھے۔ اور وہ محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

مسیحی حضرات اس پیشین گوئی کو حضرت مسیح پر چسپاں کرتے ہیں۔ حالاں کہ حضرت مسیح کسی بھی اعتبار سے مثل موسیٰ نہ تھے۔

حضرت موسیٰ ماں باپ کے ذریعہ فطری انداز میں پیدا ہوئے۔ جب کہ حضرت مسیح کی پیدائش فوق الفطری انداز میں ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے ایک خاتون سے نکاح کیا، حضرت مسیح نکاح اور ازدواجی زندگی سے دور رہے۔ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کی قیادت کی، حضرت مسیح کو اپنی قوم کا قائد بننے کا موقع نہیں ملا۔ حضرت موسیٰ پر شرعی قوانین اتارے گئے، حضرت مسیح پر شرعی احکام وقوانین نہیں اترے۔ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے نکالا، حضرت مسیح کی آمد کے باوجود یہودی رومیوں کی ماتحتی ہی میں رہے۔ اس طرح کے مختلف واضح فرق دونوں کے درمیان موجود ہیں۔ اس بنا پر حضرت مسیح کو موسیٰ کی مانند پیغمبر نہیں قرار دیا جاسکتا۔

یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ خود غیر مسلم محققین نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مسیحی عالم جیمس ڈو (Rev. James L. Dow M.A.) نے بائبل کی ڈکشنری لکھی ہے جس کو برطانی پبلیشر ہارپر کالنس (Harper Collins) نے ۶۴۰ صفحات پر شائع کیا ہے۔ میرے پاس اس کا ۱۹۹۲ کا اڈیشن ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ تاریخ کا واحد شخص جو بعید طور پر موسیٰ کی مانند بتایا جاسکتا ہے وہ صرف محمدؐ ہیں :

> The only man of history who can be compared even remotely to him is Mahomet. (p. 403)
> *Dictionary of the Bible*, by Rev. James L. Dow M.A., Harper Collins Publishers, Glasgow, 1992

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تمام پیغمبروں میں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ واحد پیغمبر ہیں جو "مثل موسیٰ" کہے جاسکتے ہیں۔ اس طرح بائبل کا یہ کلام آپ کے حق میں بائبل کی کھلی ہوئی تصدیق ہے۔ مذکورہ حوالہ اس کے اوپر ایک مسیحی عالم کی گواہی کی حیثیت رکھتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ عین یہی بات قرآن میں بھی مکی دور میں نازل ہوئی۔ قرآن میں یہ بات اس طرح کہی گئی ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے، تم پر گواہ بنا کر، جیسا کہ ایک رسول ہم نے فرعون کی طرف بھیجا تھا (المزمل ۱۵) اس آیت میں کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولا کے الفاظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو بائبل میں مذکور ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کا بیان دلائل نبوت میں سے ایک دلیل ہے۔

ثابت شدہ حقیقت

بائبل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "نبی غلبہ" کہا گیا ہے۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: "وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کیے بغیر ماننے والا نہیں، خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اسی نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو ہر دین پر غالب کر دے، خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔" (التوبہ ۳۲-۳۳، الصف ۸-۹)

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ آیت پورے قرآن کی مرکزی آیت ہے، اس کو سمجھنا گویا پورے قرآن کو سمجھنا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ تفصیل کے ساتھ اس پر غور کیا جائے۔

یہاں نورَ اللہ (اللہ کی روشنی) سے مراد وہی چیز ہے جس کو اگلے فقرہ میں ہدایت اور دین حق کہا گیا ہے۔ دنیا میں بہت سے نظامات ہیں جن کو "دین" کہا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام دین یا تو دین محرف ہیں یا دین باطل۔ ان کے مقابلہ میں پیغمبر اسلام جو چیز لے کر آئے ہیں وہ ہدایت بھی ہے اور دین بھی۔ اسی لیے وہ دین حق ہے۔ وہ خدا کا سچا دین ہے جس میں کوئی غلط بات شامل نہیں۔

اللہ کا جو مطلوب دین (نور) ہے اس کو اس نے ہر زمانہ میں اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بھیجا۔ مگر ہر بار یہ ہوا کہ پیغمبر کی زبان سے اس کا اعلان تو ہو گیا مگر وہ ایک ثابت شدہ سچائی کے طور پر قائم نہ ہو سکا۔ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے بھیجے گئے کہ وہ نہ صرف خدا کے سچے دین کا مکمل اعلان کریں بلکہ اسی کے ساتھ اس کو ایک ثابت شدہ حقیقت بنا دیں۔

دین کو ثابت شدہ حقیقت بنانے سے کیا مراد ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ایک متوازی مثال لیجئے۔ یہ مثال ڈیموکریسی (جمہوریت) کی ہے۔ ڈیموکریسی کی اصل یونانی ہے جو دو لفظوں کا مرکب ہے Demos بمعنی عوام Kratein بمعنی حکومت کرنا۔ یعنی عوامی حکومت۔

ڈیموکریسی کا تخیل اب سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے قدیم یونان کے فلسفیوں کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ شہری سطح پر اس کے محدود مقامی تجربے بھی کیے گئے۔ مگر ڈیموکریسی کئی ہزار سال تک صرف ایک ایسے سیاسی اصول کی حیثیت رکھتی تھی جس کا اعلان کر دیا گیا ہو۔ مگر وہ لوگوں کے لیے

ایک مسلّم حقیقت یا ثابت شدہ سچائی نہ بنا ہو۔ فرانس کے انقلاب (۱۷۸۹) کے بعد ایسا ہوا کہ ڈیموکریسی ایک مانی ہوئی حقیقت بن گئی۔ حتی کہ اب ایک ڈکٹیٹر بھی اپنی ڈکٹیٹرشپ چلاتا ہے تو ڈیموکریسی کے نام پر چلاتا ہے۔

رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ دنیا میں جو انقلاب آیا، اس نے خدا کے دین کو ایک ثابت شدہ حقیقت بنا دیا ہے۔ اب خدا کا دین ایک مسلّمہ تاریخی واقعہ ہے نہ کہ محض ایک مذہبی مفروضہ۔

پیغمبروں نے اعلان کیا کہ خدا ایک ہے۔ مگر انسان چونکہ دنیا کو مختلف اشیاء اور مظاہر کے روپ میں دیکھتا تھا، اس کو یہ یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ اس دنیا کا خدا صرف ایک خدا ہے۔ اس نے دیکھا کہ دنیا میں کئی طرح کی چیزیں موجود ہیں، اس لیے اس نے یقین کر لیا کہ خدا بھی ضرور کئی ہوں گا۔

مگر سائنسی انقلاب جو اسلامی انقلاب کے اثر سے ظاہر ہوا۔ اس نے غلط فہمی کی اس بنیاد کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ سائنس نے یہ ثابت کیا کہ دنیا کی چیزیں بظاہر دیکھنے میں اگرچہ بہت قسم کی دکھائی دیتی ہیں، مگر آخری تجزیہ میں سب کی سب ایک ہیں۔ سب کا آخری جزء ایٹم ہے اور ایٹم برقی لہروں سے تشکیل پاتا ہے۔ اس طرح ثابت ہوگیا کہ کائنات کی مختلف چیزوں کی ترکیب ایک ہی چیز سے ہوئی ہے۔ اور جب تمام مخلوقات کی اصل ایک ہے تو یہ عین فطری ہے کہ سب کا خالق بھی ایک ہو۔

ہزاروں سال سے انسان یہ سمجھتا تھا کہ وہ فلسفہ یا علمی مطالعہ کے ذریعہ زندگی کی حقیقت دریافت کرلے گا۔ اور کسی نبی کی ضرورت نہ ہوگی جو اس کو حقیقتِ حیات کے بارہ میں بتائے۔ مگر جدید سائنسی ترقیوں کے بعد علم انسانی جہاں پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی محدودیت کی وجہ سے کبھی بھی اس قابل نہیں ہو سکتا کہ تمام حقائق کو یا حقیقت کی آخری صورت کو دریافت کرلے۔ اس طرح خود علم انسانی کے ذریعہ یہ ثابت ہوگیا کہ انسان حق کی واقفیت کے لیے خدا کے پیغمبر کا محتاج ہے۔ کیوں کہ خود اپنی تلاش سے وہ حق کی دریافت تک نہیں پہنچ سکتا۔

شدّاد کی قسم کے بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ اس دنیا میں اپنی جنّت بنا سکتے ہیں، انھیں آخرت کی جنت کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر جدید ترقیوں نے اس مزعومہ کی تردید کر دی۔ موجودہ زمانہ میں ہر قسم کی آرام و آرائش کی چیزیں تیار ہوگئیں، مگر راحت کے جدید ترین سامانوں سے بھرا ہوا شہر تعمیر کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ انسان اب بھی اتنا ہی بے چین ہے جتنا کہ وہ پہلے تھا۔ انسان آخرت کی جنت ہی میں سکون حاصل کر سکتا ہے۔ دنیا کی جنت اس کے لیے سکون کا مقام نہیں۔

تاریخی تصدیق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین تھے۔ آپ نے دنیا کو امن کی طاقت سے روشناس کیا اور عملاً اس کو برت کر دکھا دیا۔ آپ کی شخصیت کا یہ پہلو آپ کی رسالت کا ایک عظیم تاریخی ثبوت ہے۔

تاریخ میں ہمیشہ یہ فکر پایا گیا ہے کہ طاقت حق ہے (might is right) یہی اصول ہندستانی زبان میں اس طرح مشہور ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ ہر زمانہ کا انسان یہ سمجھتا رہا ہے کہ کسی مقصد کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ متشددانہ طاقت ہے۔ کارل مارکس نے اس نظریہ کو بڑھا کر ایک پورا فلسفہ بنایا۔ اس نے کہا کہ دنیا کی ترقی کا سفر ہمیشہ تشدد کے ذریعہ طے پاتا ہے۔ اس کے اس نظریہ کو جدلیاتی مادیت کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق، ہر دور اپنی آخری حد پر پہنچ کر اپنا ضد یا اپنا عدو ظاہر کرتا ہے۔ یا مارکس کے الفاظ میں ہر تھیسس بالآخر اپنا اینٹی تھیسس پیدا کرتا ہے۔ اس اینٹی تھیسس اور تھیسس کے درمیان متشددانہ ٹکراؤ پیش آتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں تھیسس مٹ جاتا ہے اور اینٹی تھیسس باقی رہتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں نجی ملکیت پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام نے اسی طرح بے ملکیت مزدوروں کو پیدا کیا ہے۔ یہ مزدور طبقہ سرمایہ دارانہ تھیسس کا اینٹی تھیسس ہے۔ اب قانون فطرت کے تحت دونوں میں ٹکراؤ پیش آئے گا۔ آخر کار سرمایہ دارانہ نظام ختم ہوگا اور مزدور طبقہ کا دور تاریخ میں شروع ہو جائے گا۔

مارکس کے نزدیک یہ تبدیلی صرف تشدد کے ذریعہ آسکتی تھی۔ اسٹالن نے اس نظریہ کی تشریح کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ ہم کو مزدور انقلاب لانے کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول اسلحہ، دوم اسلحہ، سوم اسلحہ، اور آخر میں پھر اسلحہ۔ تشدد کا یہی فلسفہ تھا کہ ۱۹۱۷ میں جب روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو وہاں کی حکومت نے اپنے وسائل کا سب سے بڑا حصہ ہتھیاروں کی تیاری میں لگا دیا۔ چنانچہ ۷۰ سالہ عمل کے بعد وہ ہتھیاروں کے اعتبار سے سپر پاور بن گیا۔ کمیونسٹ روس کے اس متشددانہ منصوبہ کی زد سب سے زیادہ امریکہ پر پڑتی تھی جو سرمایہ دارانہ نظام کا چمپین بن کر ابھرا تھا۔ چنانچہ اس کے جواب میں امریکہ نے بھی خطرناک ہتھیاروں کی تیاری کی مہم پوری طاقت کے ساتھ شروع کر دی۔ ہتھیاروں کی اس دوڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے پاس اتنے زیادہ ہتھیار جمع ہو گئے کہ ان میں سے ہر ایک ساری دنیا کی آبادی کو پانچ ہزار بار ہلاک کر سکتا تھا۔

مگر ہتھیاروں کی اس غیر معمولی فراہمی کے باوجود نہ روس نے اپنا ہتھیار امریکہ کے خلاف استعمال کیا اور نہ امریکہ نے اپنا ہتھیار روس کے خلاف۔ اس کے بجائے یہ ہوا کہ ۱۹۹۱ میں دونوں ملکوں نے باہم یہ معاہدہ کر لیا کہ وہ کبھی ایک دوسرے کے خلاف جنگی اقدام نہیں کریں گے اور اپنے دور مار ہتھیاروں کا ۳۳ فی صد حصہ ضائع کر دیں گے۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بے پناہ دولت خرچ کرنے کے بعد جب خطرناک ہتھیاروں کا ڈھیر جمع ہو گیا تو معلوم ہوا کہ عملاً وہ ناقابل استعمال ہے۔ کیوں کہ روس اگر اپنے مزائلوں کو امریکہ کے نشانوں پر پھینکے تو عین اسی وقت امریکہ کے مزائل بھی روس کے نشانوں پر روانہ ہو چکے ہوں گے۔ اس طرح جنگ چھڑنے کے ابتدائی چند گھنٹوں میں ہی دونوں ملک راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے۔ مزید یہ کہ اس جنگ میں جیتنے والا بھی بدترین ہار سے دوچار ہوگا۔ کیوں کہ جدید جنگ پانی اور ہوا اور فضا کو اتنا زیادہ بگاڑ دے گی کہ اس کے بعد زمین پر انسان جیسی مخلوق کا بسنا ہی ناممکن ہو جائے۔

روس اور امریکہ کے اس تجربہ نے آخری طور پر ثابت کر دیا ہے کہ جنگ اور تشدد کا طریقہ آخری حد تک بے فائدہ طریقہ ہے۔ جنگ اور تشدد کے ذریعہ نہ دنیا میں کوئی تعمیری انقلاب لایا جا سکتا اور نہ کسی انسانی مسئلہ کو حل کیا جا سکتا۔

موجودہ زمانہ کے اس تجربہ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو نئے عنوان سے ثابت شدہ بنا دیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مقصد کے حصول کے لیے مبنی بر دعوت (dawah-based) طریقہ کو سب سے اعلیٰ طریقہ بتایا تھا۔ اس کے بعد کارل مارکس جیسے مفکرین اٹھے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ مقصد کے حصول کے لیے مبنی بر تشدد (violence-based) طریقہ سب سے زیادہ کارگر طریقہ ہے۔

مگر جدید حقائق حیرت انگیز طور پر پیغمبر اسلام کی رہنمائی کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اور انھوں نے مارکس جیسے مفکرین کے نظریہ کو سراسر باطل ٹھہرایا ہے۔ اس طرح خالص تاریخی تجربہ کی روشنی میں یہ ثابت ہوا ہے کہ پیغمبر اسلام کی رہنمائی الہامی رہنمائی تھی۔ اور دوسرے تمام لوگوں کے نظریات محدود انسانی ذہن کی پیداوار تھے جو حقائق کا سامنا پیش آنے کے بعد حرف غلط ثابت ہو گئے۔ پیغمبر اسلام کا پیغام صدیاں گزرنے کے بعد بھی اپنی صداقت کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے۔

تاریخ کا سب سے بڑا انسان

برطانی مستشرق ای ای کلیٹ نے اپنی ایک کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے۔ اس نے آپ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تاریخ میں مذہب اسلام کے بانی سے زیادہ حیرت ناک کوئی کردار نہیں پایا جاتا۔ کوئی دوسرا آدمی مشکل سے ملے گا جس نے دنیا کی تقدیر پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہو۔ بلاشبہ ان کو موافق حالات ملے۔ مگر وہ جانتے تھے کہ ان حالات کو کس طرح اپنے حق میں موڑا جائے۔ انھوں نے مشکلات کا مقابلہ اس عزم کے ساتھ کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں۔ اگرچہ وہ کسی دوسرے مقام پر یا کسی دوسرے زمانہ میں اس طرح کامیاب نہیں ہو سکتے تھے مگر یہ بھی یقینی ہے کہ دوسرا کوئی آدمی سرے سے کامیابی ہی حاصل نہیں کر سکتا تھا :

> There is no more astonishing career in history than that of the founder of this religion (Islam), and scarcely any man has more profoundly influenced the destinies of the world. He was, of course, favoured by circumstances, but he knew how to turn them to his purposes, and he faced adversity with the determination to wring success out of failure. While he could not have succeeded in another place or at another time, it is tolerably certain that no one could have succeeded at all.
> E.E. Kellett, *A Short History of Religions,* London, 1933. p. 333

اس طرح کا اعتراف بیشتر مورخین نے کیا ہے۔ آپ کی عملی جدوجہد کی مدت صرف ۲۳ سال ہے۔ آپ نے فردِ واحد کی حیثیت سے اپنے کام کا آغاز فرمایا۔ مگر اس مختصر مدت میں عرب کے تمام قبائل آپ کے دین میں داخل ہو گئے۔ یمن سے لے کر شام و فلسطین کی سرحدوں تک پورے جزیرہ نمائے عرب پر آپ کی مملکت قائم ہو گئی۔ آپ کے دین کی پشت پر ایک انتہائی طاقت ور ٹیم تیار ہو گئی جس نے وقت کی شہنشاہیتوں سے ٹکر لی اور ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کے ہمہ جہتی اثرات ساری دنیا میں محسوس کیے گئے۔

دینی اصلاح، علمی ارتقاء، اخلاقی روایات، سائنسی ترقی، غرض انسانی زندگی میں بعد کے دور میں جو بھی اعلیٰ کام ہوئے ہیں وہ سب براہ راست یا بالواسطہ طور پر آپ ہی کے لائے ہوئے انقلاب کا نتیجہ ہیں۔

پیغمبر اسلام کو شکست دینے کے لیے ان کے زمانہ کی تمام باطل طاقتیں متحد ہوگئیں۔ اس کے باوجود آپ کو ایسی کامیابی حاصل ہوئی جس کی دوسری نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ پیغمبر اسلام کو یہ غیر معمولی کامیابی خدا کی خاص مدد سے حاصل ہوئی۔

یہ ایک تاریخی نمونہ ہے جس کے ذریعہ خدا نے تمام انسانوں کو یہ دکھایا ہے کہ آخر کار صرف وہ لوگ کامیابی کا مقام حاصل کریں گے جو خدا کے سچے راستہ پر چلیں۔ اس کے علاوہ دوسرے راستوں پر چلنے والے لوگ خدا کی دنیا میں ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں گے۔

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ (Michael H. Hart) کی ۵۷۲ صفحہ کی کتاب ایک سو (The 100) پہلی بار ۱۹۷۸ میں چھپی۔ مصنف نے اپنی اس کتاب میں پوری تاریخ سے ایک سو ایسے انسانوں کا انتخاب کیا جنھوں نے دنیا میں سب سے زیادہ بڑائی اور کامیابی حاصل کی۔ اس فہرست میں مصنف نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نمبر ایک پر رکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ تاریخ کے واحد شخص ہیں جو مذہبی اور دنیاوی دونوں پہلوؤں سے سب سے زیادہ کامیاب رہے :

> He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels. (p. 33)

قرآن میں پیغمبر اسلام کو تمام انسانوں کے لیے نمونہ (الاحزاب ۲۱) بتایا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت صرف یہ نہیں تھی کہ وہ تاریخ کے سب سے زیادہ کامیاب انسان تھے۔ بلکہ آپ نے اسی کے ساتھ اپنی عملی زندگی سے یہ بتایا کہ اس دنیا میں سب سے بڑی کامیابی (supreme success) حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ہیرو کی نہیں ہے بلکہ ایک ابدی رہنما کی ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے زندگی کے اعلیٰ ترین اصول بذریعہ وحی تعلیم فرمائے۔ آپ نے ان اصولوں کو اپنی عملی زندگی میں پوری طرح اختیار فرمایا۔ اس طرح آپ کی زندگی ان اصولوں کے عملی اظہار کا مثالی نمونہ بن گئی۔ آپ کی یہ زندگی تاریخ میں پوری طرح محفوظ ہے۔ اور اس کا مطالعہ کرکے آج بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کرنے کا راز کیا ہے۔ اس دنیا میں کس طرح اپنے آپ کو کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔

پیغمبر کا طریقِ کار

امام البخاری نے اپنی صحیح میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت مختلف ابواب کے تحت نقل کی ہے۔ باب اقامۃ الحدود والانتقام لحرمات اللہ کے الفاظ یہ ہیں :

ماخُیّرَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین اَمرینِ اِلاّ اختارَ أیسرَهما۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان کا انتخاب فرماتے۔

(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۸۶/۱۲)

اس سے معاملات زندگی کے بارہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نہایت اہم سنت معلوم ہوتی ہے۔ وہ سنت ، مذکورہ روایت کے مطابق ، اختیار الیسر ہے۔ یعنی موجود انتخابات (available options) میں نسبتاً آسان انتخاب (easier option) کو لے لینا اور مشکل انتخاب (harder option) کو چھوڑ دینا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی اصول پر مبنی تھی۔ آپ نے کبھی اس اصول کے خلاف عمل نہیں فرمایا۔ مثلاً قدیم مکہ میں ایک انتخاب یہ تھا کہ کعبہ کے اندر سے بتوں کو نکالنے کے لیے اقدام کیا جائے ، دوسرا انتخاب یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں سے شرک کو نکالنے کی کوشش کی جائے۔ آپ نے دوسرے انتخاب کو لے لیا ، کیوں کہ پہلا انتخاب اس وقت سخت مشکل تھا۔ مکی دور کے آخر میں ایک انتخاب یہ تھا کہ آپ تمام اہل ایمان کو جمع کر کے مشرکین مکہ سے لڑ جائیں ، دوسرا انتخاب یہ تھا کہ آپ مکہ چھوڑ کر دوسری بستی میں چلے جائیں۔ آپ نے دوسرے انتخاب کو لے لیا ، کیوں کہ پہلا انتخاب زیادہ مشکل تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر ایک انتخاب یہ تھا کہ زبردستی مکہ میں داخل ہونے کی کوشش کریں ، دوسرا انتخاب یہ تھا کہ واپس لوٹ کر مدینہ چلے جائیں۔ آپ نے دوسرے انتخاب کو لے لیا ، کیوں کہ پہلا انتخاب سخت دشوار تھا۔

یہی معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا ہے۔ آپ نے ہمیشہ اختیار الیسر کے اصول پر عمل فرمایا ہے ، آپ نے کبھی اختیار اعسر کو اپنا طریقہ نہیں بنایا۔

اس سنّتِ رسولؐ میں بے شمار دینی اور دنیاوی فائدے چھپے ہوئے ہیں۔ یہ ایک

ربانی حکمت ہے جو فلاح اور کامیابی کا ایک بے خطا نسخہ ہے۔ جو لوگ اس کو اختیار کریں وہ کبھی بھی اس دنیا میں ناکامی سے دوچار نہیں ہو سکتے۔

مشکل انتخاب کو لینے میں اپنی طاقت بے فائدہ طور پر ضائع ہوتی ہے مسئلہ کی سنگینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک مسئلہ کے ساتھ بہت سے اور مسائل جڑ جاتے ہیں۔ چیزیں اپنی حد میں نہ رہ کر حد سے تجاوز کرنے لگتی ہیں۔ جدوجہد کا نتیجہ رخی رہنا سخت مشتبہ ہو جاتا ہے۔ تحریک میں غیر صالح عناصر داخل ہو جاتے ہیں۔ وغیرہ۔

اس کے برعکس آسان انتخاب لینا گویا ناممکن کو چھوڑ کر ممکن کا انتخاب کرنا ہے۔ ایسا انتخاب عمل کے نتیجہ خیز ہونے کی ضمانت ہے۔ وہ مسائل میں اضافہ کو روکنے والا ہے۔ اس میں ہر اگلا قدم آگے بڑھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس میں فطرت کے عوامل مددگار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ایک مسئلہ کے ساتھ مزید مسائل پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتا۔

انتخاب ایسر درحقیقت فطرت کا اصول ہے۔ مثلاً روشنی کبھی ٹھہری ہوئی حالت میں نہیں رہتی۔ وہ ہمیشہ سفر کرتی ہے۔ مگر روشنی ہمیشہ مختصر ترین راستہ سے سفر کرتی ہے، یہی حال تمام واقعات فطرت کا ہے۔ فطرت کی دنیا میں ہونے والا ہر عمل بہت سی صورتوں میں سے صرف وہ صورت اختیار کرتا ہے جو نسبتاً آسان اور سادہ ہو۔

حضرت عائشہؓ کا مذکورہ قول پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی پر صادق آتا ہے۔ آپ کی زندگی کے تمام واقعات دعوت، صبر، ہجرت، صلح، اعراض، اصلاح، دُعا جیسے عنوانات کے تحت جمع کیے جاسکتے ہیں، اور یہ سب کے سب مشکل کے مقابلہ میں آسان کو اختیار کرنے کی مثالیں ہیں۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر دشمنوں کا ایک بڑا لشکر مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ مگر آپ نے مدینہ کے کنارہ خندق کھود کر ان کو دوسری طرف روک دیا اور جنگ ومقابلہ کی نوبت نہ آنے دی۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے نہایت رازداری کے ساتھ سفر کی تیاری کی اور خاموش سفر کر کے مکہ پہنچ گئے، تاکہ مکہ میں جنگ کے بغیر پرامن داخلہ ہو جائے۔ اپنے دشمنوں پر قابو پانے کے بعد آپ نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ معاف کر دیا۔ کیونکہ قتل کی صورت میں قبائل میں انتقام کی آگ بھڑکتی اور نئی شدید تر صورتحال پیدا ہو جاتی۔ انتخاب ایسر آپ کی پوری زندگی کا ایک جامع عملی عنوان ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ شرکت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل مکہ میں ظلم و زیادتی کے کچھ واقعات ہوئے، مثلاً یمن کے قبیلہ زبید کا ایک آدمی مکہ آیا۔ اس نے عاص بن وائل کے ہاتھ کچھ سودا فروخت کیا۔ عاص نے اس کی قیمت ادا کرنے میں بے انصافی کی۔ یمنی تاجر نے کچھ اشعار کہے اور ان میں اپنی مظلومیت پر فریاد کی۔ اس طرح یہ معاملہ لوگوں کے درمیان مشہور ہو گیا۔

اس وقت مکہ میں عبد اللہ بن جدعان التیمی عزت اور بڑائی والا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ قریش کے کئی لوگ اس کے مکان پر جمع ہوئے۔ ان لوگوں نے عاص بن وائل کے فعل پر اس کی سخت مذمت کی۔ اور پھر سب نے پختہ عہد کیا کہ وہ اس طرح کا واقعہ مکہ میں برداشت نہیں کریں گے۔ اور اگر ایسا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو وہ مظلوم کا ساتھ دیں گے، اور ظالم کو مجبور کریں گے کہ وہ مظلوم کو اس کا واقعی حق ادا کرے۔ اس عہد کو حِلف الفضول کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ نام اس لیے پڑا کہ اس میں انھوں نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وہ مال کو اس کے حق دار کی طرف لوٹائیں گے (لأنهم تحالفوا على أنهم يردّون الفضول إلى أهلها)

طلحہ بن عبد اللہ بن عوف الزہری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبد اللہ بن جُدعان کے گھر پر جو عہد کیا گیا، میں اس عہد میں موجود تھا۔ اس کے بدلے میں سرخ اونٹوں کے ملنے کو بھی میں پسند نہیں کروں گا۔ اور اگر اسلام میں بھی اس کے لیے مجھے بلایا جائے تو میں ضرور اس پر لبیک کہوں گا (لقد شهدتُ في دارِ عبدِ الله جُدعانَ حِلفاً ما أُحِبُّ أنّ لي به حُمْرَ النَّعَمِ۔ ولو أُدْعىٰ به في الإسلام لَأَجَبْتُ) سیرۃ النبی لابن ہشام ۱/۱۴۵

اس معاملہ کے ساتھ جو لوگ وابستہ تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر سب کے سب غیر مسلم تھے۔ سودا بیچنے والا بھی غیر مسلم، خریدنے والا بھی غیر مسلم۔ بد معاملگی کے بعد مذکورہ معاہدہ میں شریک ہونے والے بھی سب کے سب غیر مسلم۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں شرکت فرمائی اور نبوت کے بعد اس شرکت کی تصدیق بھی کر دی۔ اور بوقتِ ضرورت دوبارہ اس میں شرکت کے لیے آمادگی ظاہر فرمائی۔

اس سے معلوم ہوا کہ سماجی بھلائی کے کاموں میں غیر مسلموں کے ساتھ شرکت عین درست ہے

اور اسلام کا ایک مطلوب کام ہے۔ اس طرح کے کاموں میں مسلم اور غیر مسلم کی تمیز کیے بغیر پوری طرح حصہ لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔

نقطۂ آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ ۶۳۲ء میں مدینہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ نبوت ملنے کے بعد ۶۱۰ء میں آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلی وحی نازل ہوئی۔

آپ کو نبوت دینا گویا آپ کو اصلاح انسانیت کے کام پر مامور کرنا تھا۔ اس وقت کے مکہ کو دیکھئے تو وہاں مختلف قسم کی برائیاں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً کعبۃ اللہ کے اندر ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ لوگ جوا، شراب، زنا جیسے جرائم میں مبتلا تھے۔ رومی ایمپائر اور ایرانی ایمپائر نے عرب میں سیاسی نفوذ قائم کر رکھا تھا۔ وہ عربوں کو اپنا غلام سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایرانی حکمراں کسریٰ کے نام دعوتی مکتوب روانہ فرمایا تو اس کو اس نے گستاخی پر محمول کیا اور کہا کہ وہ مجھے خط لکھتا ہے، حالاں کہ وہ میرا غلام ہے (یکتب الیّ بھذا وھو عبدی) السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۳/۵۰۸

اگر یہ چیزیں اولین اہمیت کی ہوتیں یا انھیں برائیوں کے خلاف اصلاحی مہم سے کار نبوت کا آغاز مطلوب ہوتا تو قرآن میں سب سے پہلے اس مفہوم کی آیتیں اترتیں :

طہّر الکعبۃ من الاصنام — کعبہ کو بتوں سے پاک کرو

اَقِم حدود اللہ علی المجرمین — خدا کے احکام کو مجرموں کے اوپر نافذ کرو

قاتل الفرس والرومان — ایرانیوں اور رومیوں سے جنگ کرو

مگر دور اول میں اس قسم کی کوئی آیت قرآن میں اتاری نہیں گئی۔ اس کے بجائے پہلا حکم قرآن میں یہ اترا کہ پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تم کو پیدا کیا۔ جس نے انسان کو علق سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے علم سکھایا قلم سے۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا (اِقرأ باسمِ ربّكَ الّذی خلق۔ خلقَ الاِنسانَ مِن علَق۔ اِقرأ وَ ربّكَ الاکرَم۔ الّذی علّم بالقلم۔ علّمَ الاِنسانَ ما لم یَعلَم)

اس سنتِ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اصلاحی عمل کا نقطۂ آغاز کیا ہے۔ وہ ہے علم

کا حصول، لوگوں کو باشعور بنانے کی جدوجہد۔ ماحول میں خواہ کتنی ہی زیادہ عملی برائیاں موجود ہوں۔ خواہ مقدس کعبہ کو بتوں سے گندا کیا جارہا ہو۔ خواہ بیرونی طاقتیں سیاسی غلامی کا جال بچھائے ہوئے ہوں۔ خواہ لوگ سنگین قسم کے جرائم میں ملوث ہوں۔ مگر اس قسم کی تمام برائیوں پر صبر کرتے ہوئے ساری طاقت صرف ایک کام پر صرف کی جائے گی، اور وہ علم و دانش کا حصول ہے۔

"اقرأ" کی آیت ہمیشہ کے لیے متعین کر رہی ہے کہ اسلامی عمل کا نقطۂ آغاز کیا ہے۔ اسلامی عمل کا نقطۂ آغاز قرأت ہے۔ یعنی پڑھنا اور پڑھانا۔

جذباتی اقدام نہیں

مکہ کے دور اول میں مسلمان چھپ کر عبادت کرتے تھے اور انفرادی انداز میں خاموشی کے ساتھ تبلیغ کرتے تھے، حضرت ابو بکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم اظہار کریں گے۔ اس وقت مکہ میں ۳۸ مسلمان تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار و اعلان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابو بکر ہم تھوڑے ہیں (یا ابا بکر إنا قلیل) حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا تو مسلمانوں کی تعداد چالیس سے اوپر ہوگئی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم حق پر ہیں۔ پھر ہم کیوں اپنے دین کو چھپائیں۔ ہم کو اظہار کی اجازت دیجئے۔ آپ نے دوبارہ فرمایا کہ اے عمر ہم تھوڑے ہیں (یا عمر إنا قلیل) حیاۃ الصحابہ ۱/ ۲۸۰-۲۸۲

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جذباتی اقدام کا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت یہ ہے کہ عملی اقدام ہمیشہ حالات کے مطابق کیا جائے۔ افراد یا وسائل کی کمی کی بنا پر اگر یہ اندیشہ ہو کہ اقدام کا مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوگا تو صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اور عملی اقدام کے لیے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جبکہ حالات اس کے لیے سازگار ہو جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت یہ کہہ کر اقدام سے روکا کہ ہم تھوڑے ہیں، اس وقت بھی آپ مکمل طور پر اسلام کے کام میں مصروف تھے۔ اس وقت آپ کی کوششوں کا دائرہ تھا ——— دعا، عبادت، تربیت، انفرادی تبلیغ۔ وغیرہ۔ جو لوگ اظہار کی اجازت چاہتے تھے وہ اس دائرہ سے آگے بڑھ کر عملی اقدام کے مرحلہ میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ مگر عملی اقدام کا تعلق صرف جوش سے نہیں ہے بلکہ حقیقی عملی حالات سے ہے۔ عملی اقدام اس وقت کیا جائے گا جب کہ اس کے

نتیجہ خیز ہونے کی امید ہو۔ بصورتِ دیگر صرف پہلے دائرہ میں اپنے کام کو محدود رکھا جائے گا۔

مسئلہ بننے سے پرہیز

ابوطالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ انھوں نے اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا۔ مگر وہ آخر عمر تک آپ کی حمایت کرتے رہے۔ ابوطالب کی وفات کے بعد قدیم قبائلی نظام کے تحت ضرورت تھی کہ آپ اپنے لیے کوئی اور حامی تلاش کریں۔ چنانچہ آپ مختلف قبائل کے سرداروں سے ملے۔

حج کے موسم میں عرب کے قبیلے مکہ آتے تھے۔ آپ نے اس اجتماع کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اس سلسلہ میں آپ نے جن قبائل سے ملاقات کی ان میں سے ایک قبیلہ بنی کعب تھا۔ آپ سوق عکاظ میں ان سے ملے۔ ابتدائی تعارفی گفتگو کے بعد آپ نے ان سے کہا :

إنّي رسول الله - فإن اتيتكم تمنعوني حتى ابلّغ رسالة ربّي - ولم أكره احداً منكم على شيئ - (حياة الصحابه ١/٩٥)	میں اللہ کا رسول ہوں۔ پس اگر میں تمہارے پاس آؤں تو کیا تم میری پشت پناہی کرو گے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں۔ اور میں تم میں سے کسی کو (اس کے علاوہ) مزید کسی چیز پر مجبور نہ کروں گا۔

اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ میں تمہارے درمیان ایک بے مسئلہ انسان (no-problem man) بن کر رہوں گا۔ میرا کام صرف یہ ہوگا کہ پُرامن طور پر لوگوں کو توحید کی دعوت دوں۔ دوسرے سماجی یا قبائلی یا سیاسی معاملات میں میں کوئی دخل نہیں دوں گا۔ آخری حد تک میری یہ کوشش ہوگی کہ میں تمہارے لیے کسی مسئلہ کا باعث نہ بنوں۔

اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ داعی جس ماحول میں رہے وہاں وہ پُرامن داعی بن کر رہے۔ وہ ہرگز لوگوں کے لیے مسئلہ نہ بنے۔

ظلم کے باوجود دعا

مکہ میں جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لائے ان میں سے ایک طفیل بن عمرو الدوسی ہیں۔ ان کا تعلق قبیلہ دوس سے تھا۔ وہ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ آئے۔ یہاں آپ کی زبان سے اللہ کا کلام سنا اور آپ سے باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ متاثر ہو گئے اور اسلام قبول کر لیا۔

اپنے قبیلہ میں واپس جاکر انھوں نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ مگر ان کی بیوی کے سوا کسی نے اسلام قبول نہیں کیا۔ حتی کہ قبیلہ کے لوگوں نے حضرت طفیل کے ساتھ سختیاں کیں۔ وہ بد دل ہوکر دوبارہ مکہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے قبیلہ کی شکایت کی۔ انھوں نے کہا کہ میرا قبیلہ سرکش ہوگیا ہے، اس لیے آپ اس کے خلاف بددعا کیجئے۔ آپ نے ہاتھ اٹھاکر قبیلہ کے حق میں دعا کی اور فرمایا :

اللّٰھمّ اھدِ دوساً۔ ارجع إلی قومِك فادعُھُم وارفُق بِھم۔ اے اللہ قبیلہ دوس کو ہدایت دے۔ تم اپنی قوم کی طرف واپس جاؤ اور انھیں دعوت دو۔ اور ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو۔

(سیرۃ النبی لابن ہشام ۱/۴۰۹)

اس کے بعد طفیل بن عمرو اپنے قبیلہ میں واپس آئے اور دوبارہ نرمی اور حکمت کے ساتھ لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا۔ ہجرت کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے مدینہ آئے تو اہل قبیلہ کی اکثریت اسلام میں داخل ہوچکی تھی۔ حضرت ابوہریرہؓ کا تعلق بھی اسی قبیلہ دوس سے تھا۔

اس سے اسلام کے داعی کا کردار معلوم ہوتا ہے۔ داعی ہمیشہ اپنے مدعو کا خیرخواہ ہوتا ہے، خواہ مدعو اس کے ساتھ ظلم کرے۔ داعی یک طرفہ طور پر مدعو کی زیادتیوں پر صبر کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس کے حق میں اچھی دعائیں کرتا ہے۔ وہ مایوس ہوئے بغیر اس کی ہدایت کی حکیمانہ کوشش کرتا رہتا ہے۔ مدعو کے سلوک سے بے پروا ہوکر داعی ہر حال میں اس کا خیرخواہ بنا رہتا ہے۔

آخری حد تک خیرخواہ

ابوطالب کی وفات کے بعد مکہ کی زمین آپ کے لیے بہت سخت ہوگئی۔ آپ اپنے حامی کی تلاش میں طائف گئے جو مکہ کے جنوب مشرق میں تقریباً ۶۵ میل پر واقع تھا۔ آپ نے وہاں کے سرداروں عبد یالیل، مسعود اور حُبیب سے ملاقات کی اور ان کو توحید کی دعوت پیش کی۔ مگر تینوں نے آپ کے ساتھ نہایت بُرا برتاؤ کیا۔ حتی کہ یہ کہا کہ کیا اللہ کو تمہارے سوا کوئی اور آدمی نہیں ملتا تھا جس کو وہ اپنا رسول بنائے۔ آخر میں انھوں نے کچھ لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا جنھوں نے پتھر مار مار کر آپ کو شہر سے باہر نکال دیا۔

آپ زخمی ہو گئے۔ آپ کے جسم سے خون بہہ کر پاؤں کی ایڑی تک پہنچ گیا۔ اس حال میں آپ نے رات کے وقت راستہ کے ایک باغ میں پناہ لی۔ ابھی آپ طائف اور مکہ کے درمیان تھے کہ اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ آپ کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ میں ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) ہوں۔ مجھ کو اللہ نے بھیجا ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو میں طائف کی بستی کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس ڈالوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو ان کے جیسے نہ ہوں گے۔ وہ ایک اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی شریک نہ ٹھہرائیں گے (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۲/۵۳-۱۵۲)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری حد تک لوگوں کے خیرخواہ تھے۔ حتی کہ موجودہ نسل اگر آپ پر ظلم کر رہی ہو تو آپ اس کی ہلاکت کے خواہش مند نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ یہ امید رکھتے تھے کہ ان کی اگلی نسل ان سے مختلف ہوگی اور وہ سچائی کا اعتراف کرکے اس کا ساتھ دے گی۔

دعوت دراصل انسانوں کے لیے خیرخواہی کا نام ہے۔ اور جس دل میں دوسروں کے لیے خیرخواہی ہو وہ ہر حال میں دوسروں کا بھلا چاہے گا، حتی کہ اس وقت بھی جب کہ بظاہر وہ داعی کے دشمن بن گئے ہوں۔ داعی یک طرفہ حسن اخلاق کا پابند ہوتا ہے۔ داعی اپنا انعام اپنے رب سے پانے کا امیدوار ہوتا ہے، اس لیے مدعو کی زیادتی اُس کو اس پر آمادہ نہیں کرتی کہ وہ اس کے نقصان کے درپے ہو جائے۔

جہاں مشکل ہے وہیں آسانی بھی ہے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تقریباً ۱۳ سال تک دعوتِ توحید کا کام کیا۔ وہاں کے کچھ افراد ایمان لائے۔ مگر اکثریت منکر بنی رہی۔ آخر میں اہل مکہ کو آپ سے اتنی دشمنی ہوگئی کہ وہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر طرح کا عذاب دینے لگے۔ حتی کہ آپ کے قتل کے درپے ہو گئے۔

اس وقت قرآن میں یہ آیت اتری کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے مشکل کیساتھ آسانی ہے (فان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا) اس ہدایت کا مطلب یہ تھا کہ مکہ میں اگر مخالفت کا سامنا ہے تو اس سے بددل نہ ہو۔ اس دنیا میں اگر کچھ لوگ مخالفت کرتے ہیں تو کچھ اور لوگ موافقت کرنے والے بھی مل جاتے ہیں۔ چنانچہ نئی منصوبہ بندی کی گئی۔ اس کے بعد کچھ مسلمان مدینہ بھیجے گئے تاکہ اندازہ

ہو کہ مدینہ کے لوگوں کی طرف سے کس قسم کا جواب ملے گا۔

یہ لوگ جو مدینہ گئے وہ مُقری کہے جاتے تھے۔ یعنی قرآن پڑھ کر سنانے والے۔ یہ تجربہ نہایت کامیاب رہا۔ بہت کم عرصہ میں مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پھیل گیا۔ دونوں بستیوں میں اس فرق کا سبب یہ تھا کہ مکہ والوں کے لیے شرک اقتصادی مفاد کا مسئلہ تھا۔ مکہ میں زراعت وغیرہ نہیں تھی۔ ان کی معاشیات کا انحصار ان زائرین کے اوپر تھا جو سال بھر کعبہ کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ وہ کعبہ پر نذر و نیاز بھی چڑھاتے تھے اور ان کی وجہ سے مکہ کی تجارت فروغ پاتی تھی جس طرح آجکل سیاحتی ملکوں میں وہاں کی تجارت سیاحوں کے ذریعہ فروغ پاتی ہے۔

مگر مدینہ والے اس ذہنی پیچیدگی سے آزاد تھے۔ ان کے یہاں پانی اور زرخیز زمین موجود تھی۔ چنانچہ وہ کامیابی کے ساتھ زراعت اور باغبانی کرتے تھے اور اس سے اپنی معاش حاصل کرتے تھے۔ اس طرح مدینہ والوں کے شرک کے ساتھ اقتصادی مفاد وابستہ نہیں تھا۔ ان کے لیے شرک صرف ایک آبائی رسم کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے لوگوں نے دعوتِ توحید کی سخت مخالفت کی۔ کیوں کہ ان کو اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے توحید کا دین قبول کر لیا اور شرک کو چھوڑ دیا تو ان کا سارا معاشی مفاد درہم برہم ہو جائے گا۔ مگر مدینہ والوں کے لیے اس قسم کی رکاوٹ موجود نہ تھی اس لیے انھوں نے کسی مزاحمت کے بغیر اسلام قبول کر لیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مقام پر یا کسی گروہ کی طرف سے مخالفت کا سامنا پیش آئے تو اہل حق کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ ان سے لڑکر اپنے کو ہلاک کرلیں۔ اس کے بجائے صحیح پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ کر دوسرا مقام یا دوسرا گروہ تلاش کیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ پہلا مقام اگر "مکہ" ثابت ہوا تھا تو دوسرا مقام "مدینہ" کی تاریخ کا اعادہ کرنے والا بن جائے۔

ہر قیمت پر نزاع کو ختم کرنا

ہجرت کا حکم آنے کے بعد جو مسلمان مکہ کو چھوڑ کر مدینہ گئے ان میں سے ایک صہیب بن سنان الرومی تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد مدینہ پہنچے۔ حضرت صہیب جب مکہ سے نکلے تو قریش کے کچھ لوگوں نے ان کو پکڑا۔ انھوں نے کہا کہ تم مکہ میں آئے تو تم غریب تھے۔ پھر تم نے یہاں مال کمایا۔ اب تم اس مال کو لے کر مدینہ جانا چاہتے ہو تو ہم تم کو نہیں جانے دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں اپنا

مال (دینار) تم کو دے دوں تو کیا تم مجھ کو جانے دو گے، انھوں نے کہا کہ ہاں۔ اس کے بعد صہیب نے اپنی جیب سے تمام دینار نکالے اور انھیں قریش کے حوالے کر دیا۔ اب قریش نے ان کو چھوڑ دیا اور وہ چل کر مدینہ پہنچ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ صہیب کی تجارت کامیاب رہی، صہیب کی تجارت کامیاب رہی (ربح صہیب ربح صہیب) ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ اے ابو یحییٰ تمہاری تجارت کامیاب رہی، تمہاری تجارت کامیاب رہی (ربح البیع یا ابا یحییٰ، ربح البیع یا ابا یحییٰ) حیاۃ الصحابہ ۱/۳۶۱

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن اور غیر مومن کے درمیان اگر مال یا زمین وغیرہ کے بارہ میں کوئی نزاع پیدا ہو تو مومن کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ حق کے نام پر فریق ثانی سے لڑ جائے اور اس کے نتیجہ میں اپنے آپ کو ہلاک کر لے۔ ایسے معاملات میں اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ مال یا زمین کو فریق ثانی کے حوالے کر کے اپنی زندگی کو اس سے بچایا جائے۔ کیوں کہ مومن کی زندگی ہر دوسری چیز سے زیادہ قیمتی ہے۔

یہ داعی کا اخلاق ہے۔ داعی یہ چاہتا ہے کہ مدعو سے کوئی بھی مادی جھگڑا نہ چھڑے۔ حتی کہ اگر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان کوئی مادی جھگڑا چھڑ جائے تو داعی کو چاہیے کہ وہ یک طرفہ قربانی کے ذریعہ پہلی فرصت میں اس کو ختم کر دے تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلق بحال ہو سکے۔ داعی اور مدعو کے درمیان نارمل تعلق کی ذمہ داری داعی کو قبول کرنا ہے۔ اس لیے داعی ہی کو یہ کوشش کرنا ہے کہ یہ تعلق کسی حال میں بگڑنے نہ پائے، خواہ اس کے لیے داعی کو یک طرفہ قربانی کیوں نہ دینا پڑے۔

علم کی غیر معمولی اہمیت

جنگِ بدر میں اہل ایمان کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔ دشمن فوج کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر آدمی قیدی بنا کر مدینہ لائے گئے۔ اس زمانہ میں مدینہ میں تعلیم نہیں تھی۔ مگر مکہ میں تعلیم تھی۔ چنانچہ مکہ کے یہ قیدی قدیم معیار کے مطابق تعلیم یافتہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ ان میں سے جو شخص مدینہ کے دس لڑکوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے گا۔ اس کی اس تعلیمی خدمت کو فدیہ قرار دے کر ہم اسے چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ کئی قیدی اس طرح رہا ہو کر مکہ واپس گئے (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۲/۵۱۲)

یہ پہلا اسکول تھا جو اسلام کی تاریخ میں خود پیغمبر اسلام کے زمانہ میں قائم ہوا۔ اس اسکول کے طلبہ سب کے سب مسلمان تھے۔ مگر اس کے ٹیچر سب کے سب غیر مسلم بلکہ دشمن اسلام تھے۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت ہے۔ اس سنت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں علم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ غیر مسلم سے حتی کہ اسلام دشمنوں سے بھی اگر علم سیکھنے کا موقع ہو تو سیکھنا چاہیے۔ کسی بھی اندیشہ کو علم سیکھنے کے لیے عذر نہیں بنانا چاہیے۔

تشدد کے بجائے حکمت

ہجرت کے دوسرے سال غزوۂ بدر پیش آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ ابوجہل کی قیادت میں آرہے ہیں تاکہ مدینہ پر حملہ کریں۔ آپ بھی ۳۱۳ مسلمانوں کے ساتھ نکلے۔ آپ چاہتے تھے کہ دشمن فوج کی تعداد معلوم کریں۔ آپ نے کچھ اصحاب کو آگے بھیجا کہ وہ پتہ کریں۔ وہ لوگ دو غلام پکڑ کر لے آئے جو مکہ کی طرف سے آرہے تھے۔

آپ نے ان سے پوچھا کہ مکہ سے جو لوگ نکلے ہیں ان کو تم نے دیکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے پوچھا کہ ان کی تعداد کتنی ہے، اب انھوں نے انکار کیا اور کہا کہ ہم نہیں جانتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سوال بدل دیا اور پوچھا کہ وہ لوگ اپنے کھانے کے لیے روزانہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کسی دن نو اونٹ اور کسی دن دس اونٹ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ لوگ نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہیں (القوم ما بین التسعمأة الی الالف)

السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۲/ ۳۹۷

غلاموں نے جب تعداد بتانے سے انکار کیا تو ایک صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مارنے کا حکم دیتے اور مار پیٹ کے ذریعہ ان سے کہلوانے کی کوشش کرتے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ آپ نے سختی کا طریقہ چھوڑ کر حکمت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ یہی اصول زندگی کے تمام معاملات کے لیے ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ حکمت اور تدبیر کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرے، وہ تشدد تک ہرگز نہ جائے۔ کیوں کہ تشدد سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور سادہ معاملہ ایک پیچیدہ معاملہ بن کر رہ جاتا ہے۔

پر امن تدبیر اس دنیا میں سب سے زیادہ کارگر تدبیر ہے۔

پسپائی بھی اقدام ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ رومی حکومت مدینہ کی اسلامی ریاست کے خلاف جارحانہ ارادہ رکھتی ہے اور اس نے غسانیوں کی مدد سے شام کی سرحد پر ایک فوج بھی اس مقصد کے لیے جمع کی ہے۔ چنانچہ آپ نے تین ہزار مسلمانوں کا لشکر ان کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ تاریخ اسلام میں اس کو غزوۂ مؤتہ کہا جاتا ہے۔

چند روز کی جنگ میں مسلمانوں کے تین سردار شہید ہو گئے۔ اس کے بعد خالد بن الولید کو مسلم لشکر کا سردار بنایا گیا۔ انھوں نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ مسلم فوج کی تعداد تین ہزار ہے، جب کہ رومی لشکر کی تعداد دو لاکھ۔ یہ فرق ناقابل عبور حد تک زیادہ تھا۔ چنانچہ حضرت خالد نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ حکیمانہ تدبیر کے ساتھ پیچھے ہٹ کر وہ مدینہ واپس آ گئے۔

مسلم فوج جب مدینہ پہنچی تو یہاں کے مسلمانوں نے برے انداز میں ان کا استقبال کیا۔ انھوں نے ان کے اوپر مٹی پھینکی اور کہا کہ اے بھاگنے والو، تم اللہ کے راستہ سے بھاگ آئے (یا فُرّار فررتم فی سبیل اللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ وہ بھاگنے والے نہیں ہیں۔ بلکہ ان شاء اللہ وہ اقدام کرنے والے ہیں (لیسوا بالفرار ولکنھم الکرار ان شاء اللہ تعالیٰ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم یہ تھا کہ وہ بھاگ کر واپس نہیں آئے ہیں۔ بلکہ انھوں نے جنگی حکمت عملی کے تحت ایسا کیا ہے۔ وہ تیاری کر کے ان شاء اللہ دوبارہ اقدام کریں گے اور کامیاب ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ اگر نتیجہ خیز نہ ہو رہی ہو تو بے فائدہ طور پر جنگ جاری رکھنا اسلام کا طریقہ نہیں۔ ایسی حالت میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ اہل اسلام جنگ کے میدان سے ہٹ کر تیاری کے میدان میں لوٹ آئیں۔ مسلمان کا کام لڑکر مر جانا نہیں ہے۔ مسلمان کا کام تاریخ کو صحیح رخ کی طرف چلانا ہے۔ اور یہ کام زندہ رہ کر ہو سکتا ہے۔ اپنے آپ کو ہلاک کر کے اس کام کو انجام نہیں دیا جا سکتا۔

مثبت طرز فکر

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے طائف گئے تھے۔ آپ ابھی سفر میں تھے کہ درمیان میں ایک راستہ آیا۔ آپ نے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ الضیقہ

(تنگ راستہ) آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ بلکہ وہ الیسریٰ ہے یعنی آسان راستہ (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۳/۶۵۵)

اس واقعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم سنت معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ ہے تنگی کو فراخی کی صورت میں دیکھنا، مشکل کو آسانی کے روپ میں دیکھنا۔ منفی چیز میں بھی مثبت رخ پالینا۔

اس دنیا میں کوئی بھی مشکل صرف مشکل نہیں۔ ہر مشکل کے ساتھ یہاں آسانی پائی جاتی ہے۔ یہاں سلبی پہلو کے ساتھ ہر چیز میں ایجابی پہلو بھی موجود ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کسی چیز کو مشکل کیوں کہے۔ اس کو چاہیے کہ آسانی والے پہلو کو لیتے ہوئے وہ اس کو آسانی کا نام دے۔ وہ چیزوں کو منفی رخ سے دیکھنے کے بجائے مثبت رخ سے انھیں دیکھنے لگے۔

اس سنتِ رسول کو مثبت سوچ (positive thinking) کہہ سکتے ہیں۔ اسلام آدمی کو پورے معنوں میں مثبت طرز فکر والا انسان (positive thinker) بناتا ہے۔ اسلام میں منفی طرز فکر کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

میدان مقابلہ کو بدلنا

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش مکہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ چھوٹی بڑی کئی لڑائیاں ہوئیں۔ مگر دونوں کے درمیان فیصلہ نہیں ہونا تھا۔ اس وقت ۶ ھ میں ایک الہامی خواب کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اعلان فرمایا کہ میں عمرہ کی ادائگی کے لیے مکہ جاؤں گا۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

یہ قافلہ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچا تو قریش کے سردار آگئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اب دونوں فریقوں کے درمیان گفتگو شروع ہوئی جو کئی دن تک چلتی رہی۔ اس گفتگو میں یہ طے پایا کہ رسول اللہؐ اور قریش کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ ہو جائے۔ قریش نے اس معاہدہ کے لیے ایسی شرطیں پیش کیں جو یک طرفہ طور پر ان کے حق میں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تمام شرطوں کو مان لیا اور یہ معاہدہ کرکے واپس آگئے کہ دس سال تک دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں کریں گے اور پرامن طور پر رہیں گے۔

صحابہ کرام کے اوپر یہ معاہدہ نہایت سخت تھا۔ کیوں کہ اس میں قریش کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا گیا تھا۔ لیکن جب معاہدہ ہوگیا تو قرآن کی سورہ الفتح اتری اور اس میں اعلان کیا گیا کہ یہ معاہدہ اہل ایمان کے لیے فتح مبین کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کا سبب یہ تھا کہ معاہدہ حدیبیہ سے پہلے مومنین اور مشرکین کا مقابلہ جنگ کے میدان میں ہو رہا تھا۔ چوں کہ دونوں کے پاس جنگی طاقت تھی اس لیے کبھی ایک فریق جیتتا تھا اور کبھی دوسرا فریق۔ مگر معاہدہ حدیبیہ نے مقابلہ کے میدان کو بدل دیا۔ اب دونوں فکری اور نظریاتی مقابلہ کے میدان میں آ گئے۔ چنانچہ جب مکہ اور مدینہ کے درمیان آمد و رفت شروع ہوئی اور پر امن ماحول میں تبادلۂ خیال جاری ہوا تو اہل توحید کے نظریات واضح طور پر اہل شرک کے نظریات پر برتر ثابت ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں لوگ اتنی بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہو گئے کہ صرف عددی طاقت ہی دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہوگئی۔

یہ سنت بتاتی ہے کہ جب بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ٹکراؤ کے حالات پیدا ہو جائیں تو مسلمانوں کو یک طرفہ بنیاد پر ٹکراؤ کو ختم کر دینا چاہیے۔ ٹکراؤ میں مقابلہ کا ذریعہ مادی قوت ہوتا ہے۔ مگر امن کے حالات میں فکری اور نظریاتی بحث اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اور جب مقابلہ فکری میدان میں آجائے تو لازماً اسلام کو فتح حاصل ہوگی، کیوں کہ فکری برتری اسلام کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔

روایات کو توڑے بغیر

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے کعبہ کی تعمیر کی۔ انھوں نے اللہ کے حکم کے تحت حج کا نظام قمری کیلنڈر کی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ بعد کو قریش مکہ نے اپنے تجارتی مفاد کی خاطر حج کا نظام شمسی کیلنڈر کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ یہ اللہ کے دین میں ایک بگاڑ تھا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن میں شامل تھا کہ وہ اس بگاڑ کو درست کریں اور حج کے نظام کو دوبارہ قمری کیلنڈر کی بنیاد پر قائم کر دیں۔

اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ۶۱۰ء میں نبی کا منصب عطا فرمایا۔ اس وقت آپ مکہ میں تھے مگر آپ نے اس مسئلہ کو نہیں چھیڑا۔ آپ اپنی آنکھوں سے ہر سال دیکھتے تھے کہ لوگ خدائی نقشہ کے خلاف شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے حج کر رہے ہیں مگر کبھی آپ نے اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ اس کے بعد ۶۳۰ء میں وہ وقت آیا جب کہ آپ کو مکہ پر فتح حاصل ہوگئی۔ مگر اب بھی آپ نے

حج کے نظام میں تبدیلی کا اعلان نہیں فرمایا۔ فتح مکہ کے اگلے سال بہت سے مسلمانوں نے مکہ جاکر حج ادا کیا۔ مگر یہ حج مشرکین کے بنائے ہوئے نظام کے تحت شمسی کیلنڈر کی بنیاد پر تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ پہلے ۶۳۲ء میں پہلی بار مکہ جاکر حج ادا فرمایا۔ اس وقت (حجۃ الوداع میں) آپ نے اعلان فرمایا کہ اب ہمیشہ کے لیے مشرکین کا نظام ختم کر دیا گیا اب قیامت تک حج کی عبادت قمری کیلنڈر کی بنیاد پر ادا کی جائے گی۔

آپ نے ایسا کیوں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ روایت کو توڑے بغیر اس بگاڑ کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ شمسی سال کے مقابلہ میں قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے۔ اس لیے ۳۳ سال کے بعد دونوں کی تاریخیں ایک ہوجاتی ہیں۔ ۶۳۲ء میں یہ ۳۳ سالہ دور پورا ہو رہا تھا اور حج کی تاریخ دوبارہ ذی الحجہ کے مہینہ میں پڑ رہی تھی۔ جب حج کی تاریخ اپنے آپ ذی الحجہ کے مہینہ میں آگئی تو آپ نے مکہ جاکر حج کا فریضہ ادا کر دیا اور اس وقت اعلان کر دیا کہ آئندہ اب حج کی عبادت ہمیشہ ذی الحجہ کے مہینہ میں ادا کی جائے گی۔

زندگی میں روایات (traditions) کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ لوگ زیادہ تر روایات کے زور پر ہی عمل کرتے ہیں۔ اس لیے روایات کو توڑنا ہمیشہ سماج میں انتشار کا باعث ہوتا ہے۔ اصلاح کا صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ روایات کو توڑے بغیر فطری انداز میں اس کو رائج کیا جائے۔

عملی حل

حدیبیہ کے سفر (۶ھ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً دو ہفتہ تک حدیبیہ کے مقام پر ٹھہرے تھے۔ یہ دو ہفتہ صورت حال کے مطالعہ اور قریش مکہ سے بات چیت میں گزرا۔ اس دوران مکہ کے بہت سے لوگ آپ سے ملنے کے لیے آئے۔ ان میں بُدیل بن ورقاء الخزاعی، الحلیس بن علقمہ، عروہ بن مسعود الثقفی بھی تھے۔ یہ تینوں اپنے اپنے قبیلہ میں سردار کی حیثیت رکھتے تھے۔

یہ لوگ اگرچہ مشرکین میں سے تھے۔ مگر وہ فطری طور پر انصاف پسند تھے۔ انھوں نے مکہ واپس جاکر آپ کے بارہ میں قریش کو اچھی رپورٹ دی۔ انھوں نے رسولؐ اور اصحاب رسول کے متعلق بتایا کہ وہ لوگ جنگ کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ عمرہ کے لیے آئے ہیں، اس لیے ان کو روکا نہ جائے۔ ایک سردار نے کہا کہ کیا اس آدمی کو بیت اللہ کی زیارت سے روکا جائے گا جو اس کی

تعظیم کے لیے آیا ہے (اَیُصَدُّ عن بیت اللہ مَن جاء مُعظِمًا لہ) سیرۃ ابن ہشام ۳/۳۶۱

یہ بیانات واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تھے۔ مگر آپ نے انھیں مطلق استعمال نہیں کیا۔ قریش کے ساتھ گفت گو میں آپ نے کبھی ان لوگوں کی باتوں کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کی باتیں خواہ کتنی ہی زیادہ منصفانہ کیوں نہ ہوں، وہ عملی طور پر بے فائدہ تھیں کیونکہ قریش ہرگز ان کو ماننے والے نہ تھے جو اس وقت مکہ کے سرکش سرداروں کے زیر اثر تھے۔ چنانچہ اس قسم کی موافق رپورٹوں اور بیانات کے باوجود آپ نے قریش کے مطالبات کو یک طرفہ طور پر مان لیا۔ اور وہ امن معاہدہ کر کے مدینہ واپس چلے آئے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

اس واقعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصی سنت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جب کسی سے نزاع پیدا ہو تو "منطقی انصاف" کے بجائے "عملی حل" کو اہمیت دینا چاہیے۔ ایسے معاملات میں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ کس آدمی نے ہمارے موافق بات کہی ہے یا ہمارے نقطۂ نظر سے منصفانہ بیان دیا ہے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے ساتھ اصلاً نزاع برپا ہوئی ہے وہ خود کس طرح نزاع کو ختم کرنے پر راضی ہوں گے، اور پیدا شدہ مسئلہ کا عملی حل کیا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اصل مقصود مسئلہ کا عملی حل ہے نہ کہ مسئلہ کا منطقی تجزیہ۔

ایک حکمت

غزوۂ احد شوال ۳ھ میں پیش آیا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمان غالب رہے۔ مگر بعد کو انھیں شکست ہوئی۔ تقریباً ستر اصحاب شہید ہوئے۔ جب مسلمان منتشر ہو گیے تو دشمنوں کا ہجوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا۔ انھوں نے آپ کے اوپر پتھر پھینکنے شروع کیے۔ عبداللہ بن قمیئہ اور عُتبہ بن ابی وقاص وغیرہ نے آپ پر اس زور کے ساتھ پتھر مارے کہ آپ کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ سامنے کا دانت ٹوٹ گیا۔ لوہے کی خود کی دو کڑیاں آپ کے رخسار میں اندر تک گھس گئیں۔ بعد کو ابو عبیدہ بن الجراح نے ان کڑیوں کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تو ان کے دو دانت ٹوٹ گیے۔

رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم زخمی ہو کر ایک پہلو پر گر پڑے۔ اس وقت آپ نے پہاڑ کے ایک گڑھے میں پناہ لی تاکہ آپ دشمنوں کی نظر سے اوجھل ہو جائیں۔ لوگوں نے آپ کو نہیں دیکھا تو مشہور

ہوگیا کہ آپ شہید ہوگیے۔ اس خبر سے آپ کے اصحاب میں زبردست سراسیمگی پھیل گئی۔ اس ہنگامی حالت میں جو مختلف واقعات پیش آئے ان میں سے ایک یہ تھا :

قال ابن اسحاق : وکان اول من عرف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعد الھزیمۃ وقول الناس قُتِلَ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم — کما ذکر ابن شھاب الزھری — کعب بن مالک، قال : عَرَفْتُ عینیہ الشریفتین تزھران من تحت المِغْفَر، فنادیتُ باعلیٰ صوتی یا معشر المسلمین ابشروا، ھذا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، فاشار الیّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم " ان اَنْصِتْ " سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۱

ابن اسحاق کہتے ہیں۔ اور پہلا شخص جس نے شکست کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا اور لوگوں کے اس قول کے بعد کہ آپ قتل کر دیئے گیے، جیسا کہ ابن شہاب زہری نے بیان کیا، وہ کعب بن مالکؓ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی دونوں آنکھوں کو خود کے اندر سے چمکتے ہوئے دیکھا اس وقت میں نے بلند آواز سے پکارا، اے مسلمانو، تمہارے لیے خوش خبری ہو۔ یہ ہیں اللہ کے رسول۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف اشارہ فرمایا کہ چپ رہو۔

صحابی نے اس وقت جو جملہ کہا تھا اس کو الگ کرکے دیکھیے۔ انھوں نے صرف یہ کہا تھا کہ "مسلمانو، تمہیں خوش خبری ہو، اللہ کے رسول یہاں موجود ہیں" بظاہر یہ ایک صحیح اور معصوم جملہ ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسا جملہ ہے جس پر کہنے والے کو ثواب ملنا چاہیے اور اس کی تعریف میں اَحْسَنْتَ اور صَدَقْتَ کا غلغلہ بلند ہونا چاہیے۔ مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں چپ رہنے کے لیے کہا۔ اور وہ بھی زبان سے نہیں کہا بلکہ اشارہ سے کہا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ نے اس وقت نہ خود بولنا پسند فرمایا اور نہ یہ چاہا کہ کوئی دوسرا شخص اس موقع پر بولے۔

مذکورہ موقع پر کیوں ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بولنے سے منع فرمایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت آپ دشمنوں کی نگاہ سے اوجھل تھے۔ چوں کہ اس وقت آپ شدید زخمی تھے، اس لیے آپ کا لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہنا ہی قرین مصلحت تھا۔ اگر وہ لوگ جان لیتے کہ آپ یہاں گڑھے میں ہیں تو وہ ہجوم کرکے وہاں آتے اور آپ کے اوپر مزید پتھر برسانا شروع کر دیتے۔ ایسے نازک موقع پر چپ رہنا زیادہ بہتر تھا نہ کہ بولنا۔

اسی کا نام موقع شناسی ہے۔ عملی کارروائی ہمیشہ حالات اور مواقع کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔ جس کارروائی میں حالات اور مواقع کی رعایت شامل نہ ہو وہ خودکشی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی عملی کارروائی۔

حالات کبھی یکساں نہیں رہتے، ان میں بار بار تبدیلی ہوتی ہے، اس لیے طریق عمل میں بھی بار بار تبدیلی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کبھی ایک مقصد کو اعلان کے ساتھ حاصل کیا جاتا ہے کبھی اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اخفار کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کبھی آدمی مجبور ہوتا ہے کہ فریق ثانی کے ساتھ مقابلہ کرے، کبھی زیادہ کامیاب تدبیر یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مقابلہ کے میدان سے ہٹا دے۔ کبھی پانے کی کوشش کا نام پانا ہوتا ہے اور کبھی پانا اس کا نام ہوتا ہے کہ کھونے کو برداشت کرلیا جائے۔

موجودہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ حکمت اتنی زیادہ ضروری ہے کہ اللہ کے پیغمبر کو بھی اس کی رعایت کرنی پڑی، پھر دوسرے لوگ اس کی رعایت کیے بغیر کیسے کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔

اصلاح میں نرمی اور تدریج

طائف قدیم عرب کا واحد فصیل دار شہر تھا۔ اس کی زمین بھی زرخیز تھی۔ یہاں قبیلہ ثقیف رہتا تھا۔ اپنی بعض امتیازی خصوصیات کی بنا پر یہ لوگ بہت مغرور تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سرکشی بھی کی اور طرح طرح کی گستاخیاں بھی کیں۔ فتح مکہ کے باوجود انھوں نے کافی دیر کے بعد آپ کی اطاعت قبول کی۔

قبیلہ ثقیف کا وفد رمضان ۹ ھ میں مدینہ آیا، اس نے قبول اسلام کے لیے عجیب عجیب شرطیں پیش کیں۔ انھیں میں سے ایک شرط یہ تھی کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اس شرط پر بیعت کی کہ وہ نہ صدقہ (زکوٰۃ) دیں گے اور نہ جہاد میں شریک ہوں گے۔ رسول اللہ ؐ نے اس شرط کو مان کر ان کی بیعت قبول کرلی۔ کچھ لوگوں نے اس پر سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

سیتصدقون ویجاھدون اذا أسلموا   جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو اس کے بعد وہ صدقہ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔

(السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۴/۵۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے ایک اہم اسلامی اصول معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ اصلاح میں تدریج کی حکمت ہے۔ زیر اصلاح افراد اگر بیک وقت تمام اسلامی احکام قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو مصلح کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ان کے اوپر سارے اسلامی احکام نافذ کرنے کے لیے زبردستی کرے یا ان کی اصلاح سے مایوس ہو جائے۔ اس کے بجائے اس کو انسانی فطرت پر بھروسہ کرتے ہوئے حکمت اور تدریج کے ساتھ اسلامی احکام کا نفاذ عمل میں لانا چاہیے۔

اس سنت رسول سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ کوئی نیا شخص اگر اسلام قبول کرنے کے لیے اس قسم کی شرط لگائے کہ وہ فلاں کام نہیں کرے گا یا فلاں عادت نہیں چھوڑے گا تو اس کی اس شرط کو مانتے ہوئے اس کو اسلام میں داخل کر لینا چاہیے۔ اور یہ امید رکھنا چاہیے کہ جب وہ اسلام کے دائرہ میں آجائے گا تو اس کے بعد ان شاء اللہ وہ دھیرے دھیرے تمام اسلامی احکام پر عمل کرنے لگے گا۔

ٹکراؤ سے اعراض

حدیبیہ کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے روانہ ہو کر جب عُسفان کے مقام پر پہنچے تو وہاں آپ کی ملاقات بشر بن سفیان الکعبی سے ہوئی۔ اس نے آپ کو بتایا کہ قریش کو آپ کے اس سفر کی اطلاع مل چکی ہے۔ وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ نکل آئے ہیں۔ انھوں نے چیتے کی کھال پہن لی ہے اور ذی طوی میں آکر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انھوں نے عہد کیا ہے کہ وہ ہرگز آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ خالد بن ولید ان کے سواروں کے دستہ کے سردار ہیں اور وہ اپنے سواروں کے ساتھ کراع الغمیم تک بڑھ چکے ہیں۔

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے یہ نہیں فرمایا کہ خالد کے دستہ سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بلکہ آپ نے لوگوں سے کہا کہ تم میں کون شخص ہے جو ہم کو یہ راستہ چھوڑ کر جس پر قریش ہیں، کسی دوسرے راستہ سے لے چلے (مَن رجلٌ یخرجُ بنا علی طریقٍ غیرِ طریقِهمُ التی هم بها)

یہ سن کر قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے کہا کہ اَنا یا رسولَ اللّٰہ (اے خدا کے رسول، میں یہ کام کروں گا) اس کے بعد یہ صاحب آگے ہو گئے اور پورے قافلہ کو ایک نئے راستہ پر چلا کر آگے لے گئے جو سخت پتھریلا اور دشوار تھا۔ قریشی دستہ جو خالد بن الولید کی سرداری میں آگے بڑھ رہا

تھا، اس نے مسلم لشکر کا غبار فضا میں دیکھا۔ اب انھوں نے سمجھا کہ وہ لوگ دوسرے راستہ چلے گئے۔ چنانچہ قریشی لشکر بھی واپس ہوگیا اور دوڑتا ہوا قریش کے یہاں واپس آگیا (سیرۃ النبی لابن ہشام ۳/۵۷-۳۵۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل بتاتا ہے کہ آپ کی سنتوں میں سے ایک اہم سنت ٹکراؤ سے اعراض ہے۔ اگر دشمن جنگ پر تلا ہوا ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اہل اسلام بھی فوراً مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں۔ اہل اسلام کو چاہیے کہ وہ ٹکراؤ سے اعراض کی ہر ممکن تدبیر اختیار کریں، الّا یہ کہ مقابلہ بالکل ناگزیر ہو جائے۔ گویا اسلام میں اعراض اصل ہے اور جنگ صرف استثناء۔

رازداری کا طریقہ

قریش نے حدیبیہ کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ اس کے بعد یہ معاہدہ ٹوٹ گیا۔ یہ ۸ھ کا واقعہ ہے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ مہم پر روانہ ہونے کے لیے ضروری تیاری کریں۔ چنانچہ لوگ تیاری کرنے لگے۔ آپ نے اپنے گھر والوں سے بھی کہا کہ تم لوگ میرا سامانِ سفر تیار کرو۔ اس طرح پورے مدینہ میں تیاریاں ہونے لگیں۔ مگر کسی کو بھی یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ تیاری کہاں کے لیے ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے قریبی اصحاب کو بھی آپ نے اس سلسلہ میں کچھ نہیں بتایا۔

حضرت ابوبکرؓ کو تشویش تھی۔ ایک روز وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آئے۔ یہاں دیکھا کہ حضرت عائشہؓ آپ کے سفر کی تیاری میں لگی ہوئی ہیں (یعنی راستہ کے لیے ستو وغیرہ بنا رہی ہیں) حضرت ابوبکرؓ نے اپنی صاحبزادی سے پوچھا کہ کیا تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ ان کے لیے سامان تیار کرو۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا کہ تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ تیاری کہاں جانے کے لیے ہو رہی ہے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم مجھ کو معلوم نہیں (واللّٰہ ما ادری) سیرۃ النبی لابن ہشام ۴/۱۴

اس سنتِ نبوی سے یہ اصول ملتا ہے کہ اجتماعی معاملات میں ہمیشہ رازداری کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ آپ کی یہ تیاری مکہ کی مہم کے لیے تھی۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ آپ اس طرح روانہ ہوں کہ مکہ والے اس سے بالکل بے خبر رہیں۔ وہ اس کو صرف اس وقت جانیں جب کہ آپ مکہ کی سرحد پر پہنچ چکے ہوں۔ اس مقصد کے لیے آپ نے رازداری کا اتنا زیادہ اہتمام کیا کہ انتہائی قریبی ساتھیوں کو بھی اس کی اطلاع نہیں دی۔ اس طرح کی مہم میں رازداری کا طریقہ اختیار کرنا مہم کی کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔

ہر حال میں درگزر

مدینہ کی مسجد نبوی کا واقعہ ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مسجد میں موجود تھے ۔ اس درمیان ایک اعرابی آیا ۔ اس نے مسجد کے اندر پیشاب کر دیا ۔ لوگ اس کو تنبیہہ کرنے کے لیے دوڑے ۔ مگر آپ نے منع فرما دیا ۔ آپ نے کہا کہ اعرابی کو چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر ایک ڈول پانی بہا دو ۔ کیوں کہ تم آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو ، تم مشکل پیدا کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے (فانما بُعثتم میسّرین ولم تُبعثوا معسّرین) فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱/۳۸۶

مذکورہ اعرابی نے مسجد کی بے حرمتی کی تھی ۔ اس نے مقدس مسجد کو گندا کر دیا تھا ۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نہ ڈانٹا اور نہ مارا اور نہ اسے کوئی سزا دی ۔ حتی کہ آپ کے اصحاب جب اس کی تنبیہہ کے لیے دوڑے تو اس تنبیہہ کو آپ نے سختی سے تعبیر کیا اور اس کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنے کی ہدایت فرمائی ۔

مسجد نبوی میں پیشاب کرنا مسجد کی بے حرمتی کی آخری قبیح صورت ہے ۔ مگر ایسی قبیح حرکت پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہہ کرنا پسند نہیں فرمایا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اعرابی جب اپنے قبیلہ میں واپس گیا تو اس نے قبیلہ والوں سے کہا کہ میں مدینہ گیا اور وہاں میں نے مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہ میں پیشاب کر دیا ۔ محمدؐ بھی وہاں موجود تھے ۔ مگر خدا کی قسم محمدؐ نے نہ مجھ کو جھڑکا اور نہ مجھ پر غصہ کیا (واللہ ما زجرنی محمد واللہ ما قھرنی محمد) اس اعلیٰ سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اعرابی اور اسی کے ساتھ قبیلہ کے دوسرے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل اسلام کو چاہیے کہ وہ قبیح ترین معاملات میں بھی انسانوں سے درگزر کریں ۔ لوگوں کی بری حرکتوں کے باوجود وہ ان کے اوپر سختی کرنے والے نہ بنیں ۔ اہل اسلام کو ہر حال میں نرمی کا طریقہ اختیار کرنا ہے ، خواہ دوسروں کی طرف سے کتنا ہی اشتعال انگیز معاملہ کیوں نہ کیا گیا ہو ۔

ذاتی شرف کے بجائے اہلیت کو دیکھنا

نماز باجماعت کا نظام ہجرت کے بعد مدینہ میں قائم ہوا ۔ اب سوال یہ تھا کہ لوگوں کو اکھٹا کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے ۔ آپ نے لوگوں سے مشورہ کیا ۔ کسی نے کہا کہ نماز کے وقت جھنڈا اکھڑا کیا جائے ، لوگ جب اس کو دیکھیں گے تو مسجد میں جمع ہو جائیں گے ۔ کسی نے کہا کہ جب نماز کا وقت

آجائے تو بگل بجایا جائے۔ کسی نے کہا کہ ناقوس بجایا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے کسی بھی تجویز کو پسند نہیں فرمایا۔ اور مجلس برخاست ہوگئی۔

اگلے دن فجر کی نماز کے بعد ایک صحابی عبداللہ بن زید نے بتایا کہ انھوں نے رات کو خواب میں دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک شخص آتا ہے اور وہ ان کو اذان کے کلمات بتا رہا ہے۔ یہ کلمات وہی تھے جو آج دنیا بھر کی تمام مسجدوں میں ہر جگہ ہر نماز کے وقت دہرائے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ کلمات سنے تو فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے اور خدا کی طرف سے ہے۔ اور اس کے بعد آپ نے فیصلہ فرمادیا کہ پانچوں نمازوں کے وقت لوگوں کو مسجد میں جمع کرنے کے لیے یہی کلمات پکارے جائیں۔

یہ خواب اگرچہ حضرت عبداللہ بن زید نے دیکھا تھا۔ اور یہ ان کے لیے بلاشبہ غیر معمولی شرف تھا کہ ان کو اللہ کی طرف سے اذان کے وہ کلمات تلقین کیے جائیں جو قیامت تک تمام مسجدوں میں دہرائے جانے والے ہیں۔ مگر آپ نے عبداللہ بن زید کو اذان دینے کا کام نہیں سونپا۔ بلکہ ان سے کہا کہ تم یہ کلمات بلال کو سکھا دو اور وہ کھڑے ہو کر اذان دیں گے۔ کیوں کہ وہ تم سے زیادہ بلند آواز ہیں (فانہ اندیٰ صوتاً منک) سنن ابی داؤد ۱/۱۳۲

یہ واقعہ عہدوں کی تقسیم میں اسلام کے مزاج کو بتا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عہدہ یا منصب پر کسی آدمی کو مقرر کرنا ہو تو ذاتی شرف کی بنیاد اس کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا بلکہ اہلیت کی بنیاد پر اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔ کسی ذمہ داری کے عہدہ کو بخوبی طور پر انجام دینے کے لیے جس مخصوص صلاحیت کی ضرورت ہو، وہ صلاحیت جس آدمی کے اندر پائی جائے اس کو اس عہدہ کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ ایسا نہیں کیا جائے گا کہ ذاتی شرف کی بنیاد پر لوگوں کو عہدے دے دیے جائیں، خواہ ان کو بخوبی طور پر انجام دینے کی اہلیت ان کے اندر نہ پائی جاتی ہو۔

جنگ سے آخری حد تک بچنا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں جو انقلاب لائے اس کی ایک حیرت ناک خصوصیت یہ ہے کہ ۲۳ سالہ عمل کے ذریعہ پورے عرب میں انقلاب آگیا مگر اس کے دوران دونوں طرف کے صرف ایک ہزار سے کچھ اوپر آدمی ہلاک ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا لایا ہوا انقلاب ایک غیر خونی

انقلاب (bloodless revolution) تھا، یہ غیر خونی انقلاب کیوں کر ممکن ہوا۔

یہ پیغمبر اسلام کی پر امن جد وجہد کے ذریعہ ممکن ہوا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ (الصلح خیر (النساء ۱۲۸) مگر سارے قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ (الحرب خیر۔ قرآن میں قیادت کا راز صبر (السجدہ ۲۴) کو بتایا گیا ہے۔ یہ کہیں نہیں فرمایا کہ قیادت و امامت کا راز ٹکراؤ ہے۔ اسی قسم کی خدائی تعلیمات نے پیغمبر اسلام کا طریق کار متعین کیا تھا۔

آپ کو اپنی قوم کی طرف سے سخت ترین مخالفت کا سامنا پیش آیا۔ مگر آپ نے اپنی ساری عمر میں باقاعدہ طور پر صرف تین بار جنگ کی ——— بدر، احد اور حنین۔ یہ تینوں جنگیں دفاعی تھیں اور ایسے حالات میں لڑی گئیں کہ فریق ثانی نے یک طرفہ جارحیت کے ذریعہ جنگ سے بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہیں رکھی تھی۔

مکہ کے آخری زمانہ میں قریش کے سرداروں نے تلواریں لے کر آپ کے مکان کو گھیر لیا۔ مگر آپ رات کے وقت خاموشی سے نکل کر مدینہ چلے گئے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر دشمنوں کی فوج مدینہ پر حملہ آور ہوئی۔ مگر آپ نے خندق کھود کر انھیں فاصلہ پر روک دیا۔ حدیبیہ کے سفر میں آپ کو معلوم ہوا کہ خالد بن ولید سواروں کے ایک دستہ کے ساتھ آپ کی طرف جنگ کے ارادہ سے بڑھ رہے ہیں، تو آپ نے اپنا راستہ بدل دیا تاکہ ان سے مڈبھیڑ نہ ہو سکے۔ اسی سفر میں حدیبیہ کے مقام پر قریش نے آپ کا راستہ روکا۔ اگر آپ اپنے منصوبہ کے مطابق عمرہ کے لیے مکہ میں داخل ہونے کی کوشش کرتے تو یقیناً جنگ ہو جاتی۔ مگر آپ دشمن کی شرائط پر صلح کر کے وہاں سے مدینہ واپس آ گئے۔ فتح مکہ کے بعد مکہ کے لوگ آپ کے پاس لائے گئے جو ہر اعتبار سے جنگی مجرم تھے۔ مگر آپ نے ان کو معاف کر دیا۔ اگر آپ ان سے انتقام لیتے تو جوابی انتقام کی صورت میں دوبارہ جنگ بھڑک اٹھتی۔ وغیرہ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ جنگ سے آخری حد تک اعراض کیا جائے۔ دشمن سے ٹکراؤ صرف اس وقت کیا جائے جب کہ اس کی یک طرفہ جارحیت کی بنا پر دوسری کوئی صورت سرے سے باقی نہ رہے۔

مظاہرۂ طاقت نہ کہ استعمالِ طاقت

۳ ھ میں غزوۂ احد پیش آیا۔ اس غزوہ میں اہل ایمان کو شکست ہوئی۔ ان کی تعداد اس وقت ۷۰۰ تھی۔ اس میں سے ستر آدمی شہید ہو گئے۔ اور بہت سے زخمی ہوئے۔ غزوۂ احد کے فوراً

بعد ایک اور مہم پیش آئی جس کو اسلام کی تاریخ میں غزوۂ حمراء الاسد کہا جاتا ہے۔ غزوۂ احد میں جنگ کی گئی تھی اور غزوۂ حمراء الاسد میں صرف مظاہرہ۔

احد کے بعد قریش کا لشکر فاتحانہ طور پر واپس مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہ لوگ جب روحاء کے مقام پر پہنچے تو انھیں خیال آیا کہ ہم نے بڑی غلطی کی۔ ہم کو چاہیے تھا کہ جب مسلمانوں کو شکست ہو گئی تو ہم ان کا پیچھا کرتے ہوئے مدینہ میں گھس جاتے اور مسلمانوں کی طاقت کو آخری حد تک کچل دیتے۔ مگر ہم قبل از وقت وہاں سے لوٹ آئے۔ روحاء میں ٹھہر کر یہ لوگ تیاری کرنے لگے کہ ہم دوبارہ مدینہ کی طرف واپس جائیں اور اپنی فتح کو تکمیل تک پہنچائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی اس کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ آپ قریش کے بارہ میں خبریں معلوم کرتے رہتے تھے۔ ایک مسافر نے بتایا کہ وہ لوگ روحاء کے مقام پر ٹھہر گئے ہیں اور مدینہ واپس آنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اعلان کر دیا کہ دشمن کا پیچھا کرنے کے لیے ہمیں چلنا ہے، سب لوگ تیار ہو جائیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ ہمارے ساتھ وہی لوگ چلیں جو غزوۂ احد میں عملاً شریک تھے۔ نئے افراد ہرگز نہ جائیں۔ چنانچہ عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں نے چلنے کے لیے کہا مگر آپ نے سختی کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کا مقصد لشکر قریش سے از سرِ نو جنگ کرنا نہیں تھا بلکہ انھیں صرف خوف زدہ کرنا تھا۔ اگر نئے تازہ دم لوگ اس مہم میں شامل رہتے تو اندیشہ تھا کہ جوش میں آکر وہ دشمن سے لڑائی چھیڑ دیں اور پھر اصل مقصد حاصل نہ ہو سکے۔

اس مہم سے آپ کا مقصد صرف یہ تھا کہ جب وہ سنیں کہ مسلمان ان کا پیچھا کرنے کے لیے نکلے ہیں تو وہ یہ سمجھ کر ڈر جائیں کہ مسلمانوں کو شاید نئی مدد حاصل ہو گئی ہے اور وہ زیادہ بڑی فوج لے کر ان کی طرف آرہے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قریش کو جب یہ خبر ملی کہ رسول اللہ ؐ اپنے ساتھیوں کو لے کر ان کی طرف بڑھ رہے ہیں تو وہ خوف زدہ ہو گئے اور مدینہ واپسی کا ارادہ ترک کر کے تیزی سے مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی خبر ملی تو آپ نے کہا کہ ہمارا مقصد حاصل ہو گیا۔ اب تم لوگ بھی اپنے گھروں کی طرف واپس ہو جاؤ (البدایہ والنہایہ لابن کثیر ۴/۵۱-۴۹)

اس طرح کے کئی واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

صرف دشمن کا پیچھا کرنے کے لیے سفر فرمایا نہ کہ مڈبھیڑ کرنے کے لیے۔ آپ کی اس سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان اگر دیکھیں کہ ان کے کچھ دشمن موجود ہیں تو ان سے لڑنے کی کوشش نہ کریں۔ البتہ حالات کے مطابق کچھ ایسی مظاہراتی تدبیر اختیار کریں جس سے دشمن خوف زدہ ہو جائے اور اپنی مخالفانہ کارروائی سے باز رہے۔

دشمن بھی جھک گئے

مکہ کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت ترین مخالفت کی تھی۔ انھوں نے آپ پر اور آپ کے اصحاب پر ہر قسم کا ظلم کیا تھا۔ یہاں تک کہ انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں۔ اس کے بعد بھی وہ لوگ خاموش نہیں ہوئے۔ اب انھوں نے باقاعدہ آپ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت فرمائی اور آپ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوئے۔

ہجرت کے آٹھویں سال مکہ فتح ہوگیا۔ آپ ایک فاتح کی حیثیت سے دوبارہ مکہ میں داخل ہوئے۔ آپ بیت اللہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مکہ کے وہ تمام لوگ وہاں لائے گئے جنھوں نے آپ پر ظلم کیا تھا اور آپ کے خلاف بدترین سازشیں کی تھیں۔ مگر جب وہ لوگ آگئے تو آپ نے ان کو ملامت تک نہیں کی۔ بلکہ فرمایا کہ جاؤ تم لوگ آزاد ہو۔

یہ مہربانی انتہائی غیر متوقع اور انتہائی غیر معمولی تھی۔ چنانچہ مکہ والوں پر اس کا بے حد اثر ہوا۔ اور انھوں نے مسلمانوں کا دین قبول کر لیا۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ بیت اللہ سے نکلے جیسے کہ انھوں نے نئی زندگی پائی ہو۔ اور پھر وہ اسلام میں داخل ہو گئے (فخرجوا کانما نُشروا من القبور فدخلوا فی الاسلام) حیاۃ الصحابہ ۱/۱۷۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت انسانوں کو مسخر کرنے کا راز بتاتی ہے۔ انسانوں کی تسخیر کا راز انتقام نہیں ہے بلکہ معافی ہے۔ جتنی بڑی معافی ہو اتنا ہی زیادہ بڑا اثر آدمی کے اوپر پڑے گا۔ انتقام سے نفرت کی آگ بھڑکتی ہے، جب کہ عفو و درگزر سے نفرت کی آگ ہمیشہ کے لیے بجھ جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے ساتھ درگزر کا جو معاملہ کیا وہ ایسا غیر معمولی تھا کہ اس کے بعد وہ لوگ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ اپنے کو مردہ سمجھ چکے تھے، آپ نے دوبارہ ان کو زندگی دے دی۔ یہ اتنا زیادہ بڑا سلوک ہے کہ اس کے بعد کوئی انسان سرکشی کا تحمل نہیں کر سکتا۔

پسپائی بھی اقدام ہے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں توحید کی دعوت شروع کی اور ۱۳ سال تک اس کے لیے ہر قسم کی پر امن کوشش کرتے رہے۔ مگر آپ کی ساری کوششوں کے باوجود مکہ کے لوگ آپ کی اطاعت پر راضی نہیں ہوئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا مگر بیشتر لوگ آپ کی دعوت کے منکر بنے رہے۔ آخری دور میں مکہ کے سرداروں نے آپ کے خلاف ہر قسم کی زیادتی کو اپنے لیے جائز کر لیا۔

پہلے انھوں نے کمزور مسلمانوں کو ستایا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ اور آپ کے خاندان بنو ہاشم کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ جب اس سے بھی معاملہ ختم نہیں ہوا تو انھوں نے آخری فیصلہ کن کارروائی کا منصوبہ بنایا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مکی دور کے آخری زمانہ میں قریش کے تمام سردار دار الندوہ میں جمع ہوئے۔ یہ دار الندوہ دراصل قصی بن کلاب کا مکان تھا جہاں قریش کے لوگ اہم معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ مشورہ کے دوران مختلف رائیں سامنے آئیں۔ ایک سردار نے کہا کہ محمدؐ کو لوہے کی زنجیروں میں باندھ کر ایک جگہ بند کر دو اور ان کی موت کا انتظار کرو۔ مگر اس رائے پر حاضرین کا اتفاق نہ ہو سکا۔ ایک اور شخص نے کہا کہ محمدؐ کو مکہ سے نکال دو۔ یہاں سے جلاوطنی کے بعد وہ جہاں چاہیں جا کر بسیں۔ مگر اس رائے پر بھی لوگ متفق نہیں ہوئے۔

آخر میں ابوجہل بن ہشام نے کہا کہ میری بھی ایک رائے ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم لوگ اس کو پسند کرو گے۔ ابوجہل نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ ہم مکہ کے ہر قبیلہ میں سے ایک جوان آدمی کو لیں۔ اور پھر ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تلوار دیں۔ یہ سب بیک وقت محمدؐ کے پاس پہنچیں۔ یہ لوگ ایک ساتھ اس طرح تلوار ماریں گویا کہ وہ ایک ہی آدمی کا وار ہے اور اس طرح سب مل کر محمدؐ کو قتل کر دیں۔ اس کے بعد ہم اس شخص سے نجات پا لیں گے۔ کیوں کہ اس طرح اس کے قتل کا خون تمام قبیلوں پر بٹ جائے گا اور بنو عبد مناف اپنی قوم کے تمام افراد سے جنگ نہ کر سکیں گے اور خوں بہا لینے پر راضی ہو جائیں گے۔

جب قریش کا ظلم اس حد تک پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

مکہ چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پر چلے جانے کا فیصلہ فرمایا۔ اس طرح وہ واقعہ پیش آیا جس کو اسلامی تاریخ میں ہجرت کہا جاتا ہے۔ اس فیصلہ کی حکمت بتاتے ہوئے آپ نے ایک نہایت اہم بات فرمائی۔ یہ حدیث بخاری (فضائل مدینہ) مسلم (کتاب الحج) اور موطا امام مالک (کتاب الجامع) میں نقل ہوئی ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

أُمِرتُ بقريةٍ تأكل القُرى يقولون يثربُ وهي المدينةُ تنفي الناس كما ينفي الكيرُ خبثَ الحديد۔

مجھے ایک بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں اور وہ مدینہ ہے۔ یہ بستی لوگوں کی کثافت کو دور کر دے گی جس طرح لوہار کی بھٹی لوہے کی کثافت کو دور کر دیتی ہے۔

قدیم مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک چیلنج کا سامنا تھا۔ اگر آپ اس چیلنج کا مقابلہ براہِ راست کرتے تو آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ کے مخالفین سے لڑ جاتے۔ مگر اس کے بجائے آپ نے مکہ کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آپ نے "اقدام" کے بجائے "پسپائی" کے طریقہ کا انتخاب کیا۔ کیوں کہ اس وقت کے حالات میں یہ اندیشہ تھا کہ اقدام الٹے نتیجہ والا (counter-productive) ثابت ہوگا۔

صورت حال یہ تھی کہ مکہ کے لوگوں کے لیے بت پرستی ذاتی انٹرسٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کے معاشی ذرائع بہت محدود تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ کیا کہ عرب کے ۳۶۰ قبیلوں کے بت کعبہ میں رکھ دیے۔ اس طرح عرب کے تمام قبیلے اپنے بتوں کی پرستش کے لیے مکہ آتے اور وہاں نذریں دیتے اور چڑھاوا چڑھاتے۔ قریش مکہ کو اندیشہ تھا کہ اگر وہ محمدؐ کے پیغام توحید کو مان کر تمام بتوں کو ختم کر دیں تو اس کے بعد ان کے واحد ذریعہ معاش کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر مدینہ والوں کی نفسیات اس سے مختلف تھی۔ مدینہ میں پانی تھا اور وہاں کے لوگوں کی معاش کا انحصار کھیتی اور باغبانی پر تھا۔ ان کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ بت پرستی کا خاتمہ ہوا تو اسی کے ساتھ ان کے ذریعہ معاش کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

اس طرح ہجرتِ مدینہ گویا مخالف ماحول سے نکل کر موافق ماحول میں جانے کے ہم معنی تھی۔ چنانچہ مدینہ والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام توحید کو نہایت تیزی کے ساتھ قبول کر لیا۔ حتی

کہ مدینہ کی بیشتر آبادی اسلام میں داخل ہوگئی۔ جب مہاجرین مکہ کے ساتھ انصار مدینہ کی طاقت مل گئی تو آپ اس حیثیت میں ہو گئے کہ اسلام کو نہ صرف مدینہ میں بلکہ پورے عرب میں غالب اور سربلند کرسکیں۔

سادہ کاغذ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے، ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو حدیبیہ کی نسبت سے مشہور ہے۔ یہ واقعہ ۶ھ میں پیش آیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ۱۴ سو اصحاب کے ساتھ سفر کرتے ہوئے جب مکہ کے قریب حدیبیہ میں پہنچے تو آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اونٹنی کو اس ہستی نے روک دیا ہے جس نے ابرہہ کے ہاتھیوں کو روک دیا تھا۔ آپ وہیں ٹھہر گیے اور فرمایا:

لَا تَدعُونِی قُریش الیوم الیٰ خُطّۃٍ یسألُونَنی فیہا صلۃَ الرحِم اِلّا اَعْطَیتُھُم اِیّاھَا۔ سیرۃ ابن ہشام ۳/۳۵۸، البدایہ والنہایہ ۴/۱۶۵، الکامل فی التاریخ لابن اثیر ۲/۲۰۰

قریش آج مجھے جس چیز کی بھی دعوت دیں جس میں کہ صلۂ رحمی ہو تو میں ضرور وہ چیز انھیں دوں گا۔

اس کے بعد آپ کے اور قریش کے درمیان گفتگو شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ آپ نے قریش کی شرائط پر وہ معاہدہ کرلیا جس کو معاہدۂ حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ جس کے مطابق یہ طے پایا تھا کہ دس سال تک دونوں فریقوں کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوگی۔

یہ ایک معلوم تاریخی واقعہ ہے کہ قدیم عرب صلۂ رحمی کو بے حد اہمیت دیتے تھے۔ ان کی قبائلی روایت کے مطابق، یہ بالکل ناممکن تھا کہ وہ آپ کے سامنے ایسی تجویز پیش کریں جو صلۂ رحمی کے اصول کے خلاف ہو اور قطعِ رحم پر مبنی ہو۔ اس اعتبار سے گویا کہ آپ نے یہ فرمایا کہ میں قریش کے سامنے سادہ کاغذ پیش کرتا ہوں۔ وہ جو چاہیں اس پر لکھ دیں۔ میں اس کو مان لوں گا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس کھلی پیش کش کا سبب یہ تھا کہ آپ یہ جانتے تھے کہ قریش خواہ بظاہر کیسی ہی شرائط کاغذ پر لکھوائیں لیکن جنگ بندی کے بعد یہ واقعہ لازمی طور پر پیش آئے گا کہ دعوت کے امکانات کھل جائیں گے۔ اور دعوت کے امکانات کا کھلنا فتح اعظم کے امکانات کا کھلنا تھا، جیسا کہ عملاً دو سال کے اندر پیش آیا۔ دعوت انسانوں کی تسخیر ہے۔ اور جب انسان مسخر

ہوجائیں تو اس کے بعد ہر چیز مسخر ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی چیز مسخر ہونے کے لیے باقی نہیں رہتی۔

آغاز عمل

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مکہ سے نکلے تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

ما اطیبك من بلد و احبك الیّ۔ ولولا ان قومی اخرجونی منك ما سکنت غیرك (اے مکہ تو میرے نزدیک کتنا اچھا شہر ہے اور کتنا محبوب ہے۔ اور اگر تیری قوم مجھ کو تیرے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا کہیں نہ رہتا، ترمذی)

پیغمبر نے اپنے محبوب وطن سے محرومی کو گوارا کیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مدینہ میں اسلام کا زبردست مرکز قائم ہوگیا۔ اگر وہ مکہ سے ہجرت کرنے کے بجائے مکہ والوں سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرتے تو اسلام کی تاریخ بننے سے قبل پہلے ہی قدم پر ختم ہوجاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑی عقلمندی محرومی پر راضی ہونا ہے اور سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ آدمی اپنی محرومی پر راضی نہ ہو ——— یہی ایک لفظ میں دنیا کی کامیابی اور ناکامی کا راز ہے اور یہی آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا راز بھی۔

محرومی پر راضی ہونا دوسرے لفظوں میں حقیقت واقعہ کا اعتراف کرنا ہے۔ جب آدمی حقیقت واقعہ کا اعتراف کرتا ہے تو وہ اپنی جدوجہد کے آغاز کو پالیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ حقیقت واقعہ کا اعتراف نہ کرے تو وہ ایسی چیزوں کے حصول کے لئے دوڑتا رہے گا جو اس کو ملنے والی نہیں۔

اس بات کو سن کر نادان لوگ ہمیشہ بول اٹھتے ہیں ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یا قوم آج محروم ہے وہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو محروم بنالے۔ اس قسم کا خیال زندگی سے سراسر ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ زندگی ایک نمو پذیر حقیقت ہے۔ زندگی میں ٹھہراؤ ممکن نہیں۔ جب آپ اپنے کو اس واقعی مقام پر رکھنے پر راضی ہوتے ہیں جہاں باعتبار حالات آپ کو ہونا چاہئے تو گویا آپ اپنے کو وہاں رکھتے ہیں جہاں آپ کی زندگی نمو پذیری کی صلاحیت کو بروئے کار لاسکتی ہے۔ جہاں سے آپ اپنی اگلی منزل کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ محرومی پر راضی ہونے والا اپنے آغاز کو پالیتا ہے، اور اپنے آغاز عمل کو پالینا ہی منزل پر پہنچنے کا سب سے بڑا راز ہے۔

کسی مفکر کا قول ہے "سیاست ممکنات کا کھیل ہے"، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آج ممکن ہے اس سے آغاز کرکے آپ وہاں پہنچ سکتے ہیں جو آج آپ کے لئے ممکن نہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ آج ہی سے ناممکن سے آغاز کریں تو سفر کا آغاز ہی نہ ہوگا۔ آپ ممکن سے بھی محروم رہیں گے اور ناممکن سے بھی۔

ایک نظر میں فرصت عمل حاصل کرنا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں توحید کی دعوت شروع کی تو وہاں کے مشرکین آپ کے سخت مخالف ہوگئے۔ وہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر طرح ستانے لگے۔ اس وقت آپ نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کہ لڑکر شہید ہو جائیں۔ نبوت کے تیرھویں سال آپ مکہ چھوڑ کر دور کے شہر مدینہ چلے گئے۔ تاکہ نئے میدان میں کام کے مواقع تلاش کرسکیں۔

تاہم مشرکین قریش اب بھی ٹھنڈے نہیں ہوئے۔ اب انھوں نے باقاعدہ آپ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ جنگ پر جنگ ہوتی رہی۔ مگر اسلام عرب میں فیصلہ کن طاقت نہ بن سکا۔ آخر کار آپ نے صلح کا فیصلہ کیا۔ آپ نے قریش کے ہر مطالبہ کو مان کر ہجرت کے چھٹے سال ان سے صلح کر لی۔ یہ صلح حدیبیہ تھی۔ صلح حدیبیہ حقیقۃً دس سال کا ناجنگ معاہدہ (No-war Pact) تھا جو دشمن کے مطالبات کو یک طرفہ طور پر مان کر حاصل کیا گیا۔

صلح حدیبیہ ذی قعدہ ٦ھ میں ہوئی۔ اور واقدی کے بیان کے مطابق اگلے ہی مہینہ ذی الحجہ ٦ھ میں آپ نے اطراف عرب اور اطراف مدینہ میں دعوتی وفود بھیجنے شروع کر دئے۔ ابن کثیر نے اس سلسلہ میں حسب ذیل روایت نقل کی ہے:

قال عبد اللہ بن وھب، عن یونس عن الزھری حدثنی عبد الرحمٰن بن القاری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قام ذات یوم علی المنبر خطیباً فحمد اللہ واثنی علیہ وتشھد ثم قال اما بعد فانی ارید ان ابعث بعضکم الی ملوك الاعاجم فلا تختلفوا علیّ کما اختلفت بنو اسرائیل علی عیسٰی بن مریم۔ فقال المھاجرون یا رسول اللہ انا لا نختلف علیك فی شئ ابدا فمرنا وابعثنا
(ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، المجلد الثالث، صفحہ ۵۰۷)

(صلح حدیبیہ کے بعد) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن منبر پر خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ نے اللہ کی حمد کی اور اس کی تعریف بیان کی اور شہادت دی۔ پھر فرمایا کہ اے لوگو، میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے کچھ لوگوں کو عجمی بادشاہوں کے پاس بھیجوں۔ پس تم لوگ میرے اوپر اختلاف نہ کرو جس طرح بنی اسرائیل نے عیسٰی بن مریم سے اختلاف کیا۔ مہاجرین نے کہا اے اللہ کے رسول، ہم آپ سے کسی بھی چیز میں کبھی اختلاف نہ کریں گے۔ پس آپ ہم کو حکم دیجئے اور ہم کو بھیجئے۔

صلح حدیبیہ کے بعد جن امیروں اور بادشاہوں کو آپ نے دعوتی خطوط بھیجے ان کی تعداد

مختلف کتابوں کے استقصار سے ایک درجن سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کچھ مشہور مکاتیب کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱	عبداللہ بن حذافہ کو	کسریٰ کے نام	ایران
۲	سلیط بن عمرو	ہوذہ بن علی	یمامہ
۳	العلاء بن الحضرمی	منذر بن ساویٰ	ہجر
۴	عمرو بن العاص	جیفر و عباد	عمان
۵	دحیہ کلبی	قیصر روم	شام
۶	شجاع بن وہب اسدی	منذر بن الحارث	غسان
۷	عمرو بن امیہ الضمری	نجاشی	حبشہ
۸	المہاجر بن ابی امیہ	الحارث بن عبد کلال	یمن
۹	جریر بن عبداللہ البجلی	ذوالکلاع الحمیری	اطراف یمن
۱۰	حاتب بن ابی بلتعہ	المقوقس	مصر

صلح حدیبیہ کا یہ عظیم الشان فائدہ تھا کہ اس نے اسلام کو جنگ کے محدود میدان سے نکال کر دعوت کے وسیع تر میدان میں پہنچا دیا۔ جنگ کے اعتبار سے اسلام قبائلی سرداروں کے مقابلہ میں بھی فیصلہ کن نہیں بن رہا تھا مگر دعوت کے میدان میں آتے ہی اسلام کی عظمت کا یہ حال ہوا کہ وہ شاہان عالم کے مقابلہ میں بھی اقدام کی پوزیشن میں تھا۔

مگر اسلام کو اس تسخیری میدان میں لانے کی دو لازمی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ داعی اور مدعو کے کے درمیان تمام مادی اور سیاسی جھگڑوں کو یک طرفہ قربانی کے ذریعہ ختم کر دیا جائے۔ تاکہ سننے اور سنانے کی معتدل فضا پیدا ہو۔ دوسری لازمی شرط داعی گروہ کا آپس کا اتحاد ہے تاکہ وہ طاقت حاصل ہو جو دعوت کا عمل موثر طور پر جاری کرنے کے لئے ضروری ہے۔

چار مرحلے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت کو عام طور پر دو دور میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مکی دور اور مدنی دور۔ مگر یہ محض جغرافی تقسیم ہے۔ دعوتی مراحل کے اعتبار سے آپ کی مدت نبوت کو تقسیم کیا جائے تو وہ اس سے زیادہ قرار پائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی کتاب تدریج کے ساتھ اتاری گئی۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ رسول کے اوپر پورا قرآن ایک ساتھ کیوں نہیں اتار دیا گیا۔ ایسا اس لیے ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا ہے (الفرقان ۳۲)

اس آیت میں رتّلناہُ ترتیلاً کی تفسیر شیئاً بعدَ شیئٍ کے لفظ سے کی گئی ہے یعنی ایک تعلیم کے بعد دوسری تعلیم اور ایک حکم کے بعد دوسرا حکم نازل کیا گیا۔ یہ وہی چیز ہے جس کو تدریج کہا جاتا ہے۔ اس تدریج کا لازمی تقاضا ہے کہ دعوت نبوت عملی اعتبار سے مختلف مراحل میں تقسیم ہو۔ اس اعتبار سے غور کیا جائے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ نبوت چار بڑے مرحلوں میں تقسیم تھا (الجامع لاحکام القرآن ۲۹/۱۳)

پہلا مرحلہ وہ ہے جو مکی دور کے نصف اول میں پیش آیا۔ اس مرحلہ کی خصوصیت یہ تھی کہ دعوت کا عمل محدود طور پر اخفاء کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ نماز بھی چھپ کر پڑھی جاتی تھی۔

دوسرا مرحلہ مکی دور کے نصف ثانی کا ہے۔ اس زمانہ میں علی الاعلان توحید کی دعوت دی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان جاکر کہتے تھے کہ ایھا الناس، قولوا لاالٰہ الا اللّٰہ تفلحوا۔ صحابہ کرام جگہ جگہ لوگوں کو قرآن کے اترے ہوئے حصے پڑھ کر سناتے تھے۔

تیسرا مرحلہ مدنی دور کے نصف کا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مدینہ میں دو متوازی نظام قائم تھے۔ ایک یہودیوں کا جس کا سردارِ اعلیٰ کعب بن اشرف تھا۔ دوسرا اہل اسلام کا جس میں رہنمائی اور قیادت کا مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔

چوتھا مرحلہ مدنی دور کے نصف ثانی کا ہے۔ اس زمانہ میں یہود کی طاقت ختم ہوگئی

اور مدینہ میں صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حاکمانہ حیثیت حاصل ہوگئی۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۲۱) یعنی تمہارے لیے رسول اللہؐ کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔ یہ نمونہ صرف آخری دور کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں بعد کو آنے والے امتی ایسے دین کے مکلف ہو جائیں گے جس کی تکلیف نہ سابق انبیاء کو دی گئی، اور نہ خود پیغمبر اسلام اور اصحاب رسول کو۔ کیوں کہ واقعات بتاتے ہیں کہ ہر ایک کی تکلیف ہمیشہ تدریج کے اصول پر تھی۔ یعنی جیسے حالات، اس کے مطابق ذمہ داری۔

اس اصول کی روشنی میں صحیح بات یہ ہے کہ ہر دور کے اور ہر مقام کے امتیوں کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دعوت نبوت کے کس مرحلہ میں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو جس مرحلہ میں پائیں، اسی کے اعتبار سے وہ اللہ کے نزدیک مسئول قرار پائیں گے۔

مثلاً کمیونسٹ ملکوں میں جو حالات تھے، وہ نبوت کے پہلے مرحلہ کے مشابہ تھے۔ ان ملکوں کے مسلمانوں پر وہی ذمہ داری تھی جو مکی دور کے نصف اول کے مسلمانوں کی تھی۔ اگرچہ اب خود کمیونسٹ ملکوں میں مذہبی آزادی آچکی ہے۔ اور اب کہیں بھی پورے طور پر یہ حالات موجود نہیں ہیں۔

دوسرے مرحلۂ نبوت کے لیے چین کی مثال دی جا سکتی ہے۔ یہاں وہ حالات پائے جاتے ہیں جو مکی دور کے مرحلۂ ثانی میں پائے جاتے تھے۔ یہاں کے مسلمان اسی دور والے احکام کے مکلف ہیں۔

تیسرے مرحلہ کی ایک مثال موجودہ ہندستان ہے۔ یہاں عملی طور پر دو متوازی نظام قائم ہیں۔ ایک ملکی عدالت کا نظام۔ دوسرا دار الافتاء اور دار القضاء کے شعبے جو علماء کے زیر نگرانی کام کر رہے ہیں۔ ہندستان کے مسلمانوں کو وہ تقاضے پورے کرنے چاہئیں جو مدنی دور کے مرحلہ اول میں پائے جاتے تھے۔

چوتھے مرحلہ کی ایک مثال پاکستان ہے۔ پاکستان کے مسلمان حکماً ان تمام احکام کے مکلف ہیں جن کا مکلف مدنی دور کے نصف ثانی کے مسلمانوں کو کیا گیا تھا۔

یہ چار تقسیمیں بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح پیغمبر کی زندگی میں ہر مرحلۂ حیات کا نمونہ قائم کر دیا۔ یہ اس لیے ہوا تاکہ اللہ کے بندوں کو عسر سے بچایا جائے اور ان کو یسر (آسانی) کے ساتھ دین دار بننے کا موقع فراہم کیا جائے۔

عظمتِ اسلام

دین اسلام

اسلام کائنات کا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات کو پیدا کیا تو اسی وقت یہ مقدر کر دیا کہ کائنات کا دین اسلام ہوگا۔ وہ کامل طور پر اللہ کی اطاعت اور سپردگی کے راستہ پر چلے گی۔ وہ ادنیٰ درجہ میں بھی اس کی مرضی سے انحراف نہیں کرے گی۔

اس کے بعد جب اللہ نے انسان کو پیدا کر کے زمین پر بسایا تو اس کو بھی یہی حکم دیا کہ وہ پوری طرح اللہ کا فرماں بردار رہ کر دنیا میں زندگی گزارے۔ اللہ کی کامل اطاعت ہی کائنات کا مذہب ہے اور اللہ کی کامل اطاعت ہی انسان کا مذہب بھی :

Submission to God is the only religion for both:
Man and the Universe.

البتہ کائنات اور انسان میں ایک فرق ہے۔ کائنات پوری طرح مسخر ہے۔ وہ مجبور ہے کہ وہی کرے جس کا حکم اللہ نے اس کو دے رکھا ہے۔ وہ اللہ کے حکم سے بال برابر بھی تجاوز نہیں کر سکتی۔ مگر انسان ایک بااختیار مخلوق ہے۔ انسان کو وہی اطاعت اختیارانہ طور پر کرنا ہے جس کو بقیہ کائنات مجبورانہ طور پر کر رہی ہے۔

کائنات اپنی ساری وسعتوں کے باوجود ایک وحدت ہے۔ پوری کائنات ایک نظام وحدت کے تحت عمل کرتی ہے۔ اس طرح کائنات اس بات کا مظاہرہ کر رہی ہے کہ وہ ایک خدا کو ماننے والی ہے۔ یہی چیز انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے ایک خدا کو مان لے، وہ اپنی فکر کو پوری طرح توحید کی فکر میں ڈھال لے۔

شہد کی مکھی سے لے کر شمسی نظام تک کائنات کا ہر جزء نہایت بامعنی انداز میں اپنا عمل کر رہا ہے۔ جیسے کہ وہ کسی برتر طاقت سے اپنے لیے احکام وصول کر رہا ہو۔ اسی کا نام وحی ہے۔ انسان کی طرف بھی اللہ نے پیغمبروں کے ذریعہ وحی کی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اس وحی کو اپنا رہنما بنائے، وہ اپنی زندگی کے تمام اعمال اسی وحی کی روشنی میں انجام دے۔

پوری کائنات حالتِ سجدہ میں ہے۔ اس کا ایک مظاہرہ درخت اور تمام بلندیاں اپنے سایہ

کی صورت میں کرتی ہیں۔ ہر بلند چیز اپنا سایہ زمین پر ڈال کر گویا اپنے خالق کے آگے سجدہ کر رہی ہے۔ یہی سجدہ انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کے آگے سجدہ میں گر جائے، وہ اللہ کی عبادت گزاری کو اپنی روح کی غذا بنا لے۔

کائنات میں بے شمار چیزیں ہیں۔ اور ہر ایک حرکت کی حالت میں ہے۔ مگر ان کے درمیان کبھی کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اس کا ہر جزء اس کے دوسرے اجزاء سے کامل ہم آہنگ رہ کر اپنا عمل کرتا ہے۔ یہی طریقہ انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی انفرادیت کو اجتماعیت کے ساتھ جوڑے۔ ہر انسان دوسرے انسانوں سے موافقت کرتے ہوئے اپنا مقصدِ حیات حاصل کرے۔

کائنات نفع بخشی کے اصول پر چل رہی ہے۔ کائنات کا ہر جزء اپنا عمل اس طرح کرتا ہے کہ وہ دوسرے تمام اجزاء کے لیے مفید بن سکے۔ یہی اصول انسان کو بھی اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ ہر آدمی کو اس پختہ سوچ کے ساتھ دنیا میں رہنا ہے کہ اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ اس کی سرگرمیاں دوسرے کے لیے ہمیشہ نفع بخش ثابت ہوں۔

کائنات پوری کی پوری قابلِ پیشین گوئی کردار رکھتی ہے۔ کائنات کے ہر جزء کے بارہ میں پیشگی طور پر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ وہ کس طرح اپنا عمل کرے گا۔ یہی چیز انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو بھی قابل پیشین گوئی کردار کا حامل ہونا چاہیے۔ انسان کو اتنا زیادہ با اصول ہونا چاہیے کہ پیشگی طور پر یہ اندازہ کیا جا سکے کہ کن حالات میں وہ کس قسم کا ردعمل ظاہر کرے گا۔

کائنات کی ہر چیز اپنی حد کے اندر رہ کر عمل کرتی ہے۔ ہر ستارہ اپنے ذاتی مدار میں حرکت کرتا ہے، کوئی ستارہ کبھی دوسرے کے مدار میں داخل نہیں ہوتا۔ یہی طریقہ انسان کو بھی اختیار کرنا ہے۔ ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی حد کے اندر رہے۔ وہ کبھی دوسرے کے دائرہ میں داخل نہ ہو۔ ہر آدمی کو اس احساس کے ساتھ دنیا میں رہنا ہے کہ اس کی حد وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے دوسرے کی حد شروع ہوتی ہے۔

انسان کے بارہ میں اللہ کی مرضی کیا ہے، اس کو اللہ نے وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبروں کے پاس بھیجا۔ اسلام اس وحی کا آخری اور مستند اڈیشن ہے۔ اسلام اللہ کی مرضی کا لفظی بیان ہے اور کائنات اللہ کی مرضی کا عملی مظاہرہ۔

اسلام کی طاقت

مشہور امریکی میگزین نیوز ویک (۳ فروری ۱۹۹۲) کی کور اسٹوری وسط ایشیا کے بارہ میں ہے۔ اس کی سرخی اس نے ان الفاظ میں قائم کی ہے ——— وسط ایشیا کا وسیع علاقہ سوویت اقتدار سے آزادی کے بعد اپنے اسلامی تشخص کی تلاش میں :

Central Asia: freed from Soviet rule,
a vast region searches for an Islamic identity.

روس کی سرحدی ریاستیں، ازبکستان، قزاقستان، کرغیزستان، ترکمانستان، تاجکستان، سو سال پہلے مسلم ریاستیں تھیں۔ ۱۹۱۷ میں روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو اس نے جلد ہی توسیع کی پالیسی اختیار کی۔ وسط ایشیا کی ان تمام ریاستوں کو اپنے قبضہ میں لے کر جبری طور پر ان کے اوپر کمیونسٹ نظام نافذ کر دیا گیا۔ اس پورے علاقہ پر ۷۰ سال سوویت یونین کا قبضہ رہا۔ یہاں تک کہ حالات میں تبدیلی ہوئی اور ۱۹۹۱ کے آخر میں یہ تمام ریاستیں آزاد ہوگئیں۔

ان ریاستوں کے بارہ میں مسلسل ایسی خبریں آرہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۷۰ سال تک اشتراکی قید میں رہنے کے باوجود وہاں کے مسلمانوں نے اسلام سے اپنا تعلق باقی رکھا اور جیسے ہی آزادی ملی ان کی اسلامیت اچانک نمایاں ہوگئی جو اشتراکی جبر کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں اور ان کے گھروں میں چھپی ہوئی تھی۔

مذکورہ نیوز ویک کی ٹیم نے علاقہ کا براہ راست جائزہ لینے کے بعد بتایا ہے کہ سعودی علماء کثیر تعداد میں قرآن کے نسخے لے کر اس علاقہ میں آگئے ہیں تاکہ "پیرافٹ محمد کے پیغام" کو لوگوں کے درمیان پھیلائیں۔ کمیونسٹوں نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں یہاں کا رسم الخط جبری طور پر بدل کر روسی رسم الخط کر دیا تھا۔ اب نئے حکمراں دوبارہ اس کو عربی رسم الخط میں تبدیل کر رہے ہیں۔

اشتراکی دور حکومت میں یہ ناممکن تھا کہ باہر کا کوئی ادارہ اس علاقہ میں دینی مدد پہنچا سکے۔ آج مختلف اسلامک ممالک آزادانہ طور پر یہ کام کر رہے ہیں۔ سعودی عرب نے تخمیناً ایک بلین ڈالر وسط ایشیا میں پہنچایا ہے تاکہ وہاں کے دینی کاموں کو فروغ حاصل ہو۔ وہ مزید سات بلین ڈالر

تاشقند کے ریلیجس بورڈ کو دے رہا ہے تاکہ امام اسماعیل البخاری کے مزار کے ساتھ ایک بڑا اسلامک سنٹر قائم کیا جا سکے۔ (صفحہ ۲۱)

سعودیہ کا اسلامک بینک ایک منصوبہ کو تین لاکھ ڈالر ($ 300,000) کی مدد دے رہا ہے تاکہ دوشنبی (Dushanbe) میں ایک بڑا دینی مدرسہ قائم کیا جا سکے۔ اسی طرح دوسرے مسلم ممالک بھی اس علاقہ میں اسلام کے فروغ کے لیے مختلف طریقہ سے اپنا تعاون دے رہے ہیں۔

نیوز ویک نے مزید لکھا ہے کہ دو سال پہلے تاجکستان میں صرف ۱۸ مسجدیں تھیں۔ آج مسلم ذمہ داروں کے بیان کے مطابق، یہاں ۲۵۰۰ سے زیادہ مسجدیں ہیں:

> Two years ago there were only 18 mosques in Tajikistan. Today, according to Muslim authorities, there are more than 2,500 mosques. (p.21)

اشتراکی نظام کے تحت آنے سے پہلے یہاں جو مسلمان تھے، ان میں سے بیشتر اس مدت میں وفات پا چکے۔ اب اس علاقہ میں جو مسلم نسلیں ہیں وہ زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو اشتراکی نظام کے دور میں پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اشتراکی ماحول میں پرورش پائی اور اشتراکی اداروں میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس کے باوجود ان کے درمیان اسلام باقی رہا اور آزادی پاتے ہی از سر نو دوبارہ زندہ ہو گیا۔

یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ کوئی حکومت خواہ وہ کتنی ہی زیادہ طاقت ور ہو، وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں کے اندر سے ان کے اسلامی تشخص کو مٹا دے۔ قرآن کے مطابق، خدا کا دین اب خشیت انسانی کے دور سے نکل کر خشیت ربانی کے دور میں داخل ہو چکا ہے (المائدہ ۳) اب اسلام اتنا مستحکم ہو چکا ہے کہ کوئی بھی طاقت اس کو نقصان پہنچانے پر قادر نہیں۔ اب اندیشہ تمام تر خدا کی طرف سے ہے نہ کہ انسان کی طرف سے۔

خدا کی طرف سے اسلام کو کامل اور مستحکم دین قرار دیا جانا اس بات کی ضمانت ہے کہ کوئی بھی طاقت اسلام کو مستقل نوعیت کا نقصان نہ پہنچا سکے۔ دوسروں کی طرف سے اسلام اور اہل اسلام کو وقتی قسم کا ضرر پہنچ سکتا ہے۔ مگر اس قسم کی کوئی حالت دیر تک باقی رہنے والی نہیں۔ جب بھی ایسا ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حالات میں ایسی تبدیلی لائی جائے گی کہ مخالفین اسلام کے تمام منصوبے ڈھ جائیں۔ اسلام کا سورج وقتی بدلی سے نکل کر دوبارہ آفاق میں چمکنے لگے۔

کامل مذہب

انسان کو ایک عقیدہ یا نظام فکر کی ضرورت ہے جو اس کے اندرونی تقاضے کا جواب ہو۔ جو اس کی زندگی کی تشریح کرے۔ جس سے وہ اپنی عملی زندگی میں رہنمائی لے سکے۔

عام مذاہب انسان کے لیے ایسا نظام فکر فراہم کرنے میں ناکام ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مذاہب تحریف کی بنا پر اپنی واقعی حیثیت کو کھو چکے ہیں۔ ان کے اور انسانی فطرت کے درمیان مطابقت باقی نہیں رہی ہے۔ وہ زندگی کے معاملات میں صحیح رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی بنا پر آج کی تعلیم یافتہ دنیا نے ان مذاہب کو رد کر دیا ہے۔

سائنس کے ظہور کے بعد جدید انسان نے یہ سمجھا کہ سائنس اس کو وہ فکری بنیاد دے سکتی ہے جس پر وہ کھڑا ہو سکے۔ مگر یہاں ایک اور مسئلہ اس کے لیے رکاوٹ بن گیا۔ سائنس میں بھی انسان اپنے لیے مطلوب فکری بنیاد نہ پا سکا۔

سائنس نے انسان کو عالم فطرت کی دریافت میں مدد دی۔ یہ عالم فطرت جو اس نے دریافت کیا وہ بے حد بامعنی تھا۔ اس میں نظم تھا، اس میں ڈزائن تھی۔ اس میں منصوبہ بندی تھی۔ مگر دوبارہ سائنس کی ایک کمی سائنس اور انسان کے درمیان حائل ہو گئی۔ انسان یہاں بھی اپنے مطلوب نظام فکر کو حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

سائنس کی کمی یہ تھی کہ اس نے صرف "کیا ہے" کے بارہ میں بتایا۔ "کیوں ہے" کے بارہ میں وہ انسان کو کچھ نہ بتا سکی۔ گویا سائنس انسان کو ایک اچھی مشین تو دیتی ہے مگر وہ یہ نہیں بتاتی کہ اس اعلیٰ مشین کا صانع (Maker) کون ہے۔ اس مسئلہ کا حل مذہب کے پاس تھا۔ مگر جدید انسان مذہب کو پہلے ہی رد کر چکا تھا۔

انسان ایک توجیہہ پسند حیوان (explanation-seeking animal) ہے۔ وہ ہر واقعہ کی توجیہہ چاہتا ہے۔ سائنس آدمی کی اس طلب کو پورا نہیں کرتی۔ وہ واقعہ کی نشان دہی کرتی ہے مگر وہ واقعہ کی توجیہہ نہیں بتاتی۔ وہ انسان کو ایک ایسی کائنات سے متعارف کرتی ہے جس میں ڈزائن اور پلان ہے۔ مگر وہ انسان کو اس کے ڈزائنر اور اس کے پلانر کے بارہ میں کوئی خبر نہیں دیتی۔

اس کے بعد قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ انسان مطمئن ہونے کے بجائے حیرانی میں پڑ جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسی ڈزائن کیسے یہاں موجود ہے جس کا کوئی ڈزائنر نہیں۔ ایک ایسا پلان کیسے یہاں پایا جاتا ہے جس کا کوئی پلانر نہیں۔

سائنس کی دریافت کردہ دنیا کی یہی کمی ہے جس کی بنا پر البرٹ آئن سٹائن سے لے کر ہاکنگ (Stephen Hawking) تک تمام سوچنے والے دماغ یہ محسوس کرتے رہے ہیں کہ کائنات میں بہت سے ایسے پہلو ہیں جن کو سمجھنا انتہائی حد تک دشوار ہے :

There are aspects in the universe which are extremely difficult to understand

اس فکری مشکل کو شروڈنگر نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ فطرت کے بارہ میں سب سے زیادہ ناقابل فہم بات یہ ہے کہ وہ قابل فہم ہے :

The most incomprehensible thing about nature is that it is comprehensible

سائنس کے بعد دوسری چیز مذہب ہے۔ مگر قوموں کے پاس جو مذہب ہے وہ (اسلام کے سوا) سب کا سب محرف ہے۔ اس لیے وہ انسانی فطرت کو اپیل نہیں کرتا۔ سائنس اس بنا پر انسان کو فکری بنیاد نہ دے سکی کہ وہ نامکمل تھی۔ اور اس کا مذہب اس بنا پر اس کو فکری بنیاد دینے میں ناکام ہے کہ وہ محرف ہے۔

یہاں انسانیت کی امید صرف ایک ہے، اور وہ اسلام ہے۔ آج اسلام ہی ایسا نظام فکر ہے جو انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ وہ ایسا مذہب ہے جس میں کوئی تحریف نہیں، وہ ایسا علم ہے جو سچی سائنس کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اسلام کا ٹکراؤ نہ انسانی فطرت سے ہے اور نہ حقیقی علم سے۔

آج کا انسان محرف مذہب اور نامکمل سائنس کی دوطرفہ مشکل کے درمیان جی رہا ہے۔ ان حالات میں انسان کی مشکل کا جواب صرف ایک ہے، اور وہ اسلام ہے۔ اگر اسلام کو وقت کی زبان اور وقت کے اسلوب میں پیش کر دیا جائے تو آج کا انسان دوڑ کر اس کو لے لے گا، کیوں کہ اس کی روح آج سب سے زیادہ اسی کی تلاش میں ہے۔

نظریاتی سپر پاور

موجودہ زمانہ میں بڑی طاقتوں کا بہت چرچا ہے۔ بڑی طاقت ہونا سب سے بڑی چیز سمجھا جاتا ہے۔ مگر بڑی طاقت کے نام سے لوگ صرف دو قسم کی طاقت کو جانتے ہیں۔ ایک، اقتصادی سپر پاور (economic superpower) جو آج جاپان کو حاصل ہے۔ دوسرے فوجی سپر پاور (military superpower) جو خلیج کی جنگ (۱۹۹۱) کے بعد امریکہ کو حاصل ہوگئی ہے۔

مگر خدا کی دنیا میں ایک اور امکان موجود ہے جو ان دونوں سے بھی زیادہ بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ اور وہ ہے نظریاتی سپر پاور (ideological superpower) بننا۔ یعنی آدمی کے پاس ایک ایسا نظریہ ہو جو دلوں کو اپیل کرے، جو ذہن کو اس کے تمام سوالات کا جواب دیتا ہو۔ جو فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہو۔ جس انسان یا گروہ کے پاس اس قسم کا نظریہ ہو، وہ کسی مادی زور کے بغیر صرف اپنی نظریاتی قوت کے ذریعہ قوموں کو مسخر کر سکتا ہے، وہ ظاہری طاقت کے بغیر سب سے بڑی طاقت بن سکتا ہے۔

خدا کا دین یہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ خدا کا دین تمام فکری مسائل کو حل کرتا ہے۔ وہ انسان کی اندرونی طلب کا صحیح ترین جواب ہے۔ وہ انسان کو اس کے مقصدِ حیات سے آشنا کراتا ہے۔ جو انسان خدا کے دین کو پالے، وہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے سب کچھ پالیا۔ اب اس کو کچھ اور پانے کی ضرورت نہیں۔

خدا کے تمام پیغمبر یہی دین لے کر آئے۔ مگر پچھلے پیغمبروں کی تعلیمات اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہیں۔ انسانی آمیزشوں نے ان کو محرف دین بنا دیا۔ اب زمین کے اوپر صرف ایک دین ہے جس کو خدا کا الدّین ہونے کی حیثیت حاصل ہے، اور وہ پیغمبر آخر الزماں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے۔ آپ کا دین قرآن وسنّت کی صورت میں آج بھی پوری طرح محفوظ ہے۔

اس اعتبار سے نظریاتی سپر پاور بننے کا موقع اب صرف پیغمبر اسلامؐ کے دین کے لیے ہے۔ کسی اور مذہب کے لیے نہیں ——— اہل اسلام کے حق میں یہ ایک ایسا ایڈوانٹج ہے جو کسی بھی دوسرے مذہب کے ماننے والوں کو حاصل نہیں۔

تاریخ کا تجربہ نظریہ کی فوقیت کو ثابت کرتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نظریہ نہ صرف ایک طاقت ہے بلکہ وہ سب سے بڑی طاقت ہے۔

امریکہ کے ایک ادارہ نے اپنے جائزہ (ٹائمس آف انڈیا اکتوبر ۱۹۸۹) میں پایا ہے کہ ان کے سوال نامہ کا جواب دینے والے امریکیوں میں ۶۳ فی صد ایسے لوگ تھے جن کا خیال تھا کہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کے لیے سب سے بڑا چیلنج اب سوویت یونین کا فوجی خطرہ نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا چیلنج وہ اقتصادی خطرہ ہے جو جاپان جیسے ملکوں کی طرف سے پیش آرہا ہے:

A recent survey by the American Insight Group of Cambridge (Mass) found that 63 per cent of their respondents felt that the biggest foreign policy challenge is no longer a military threat from the Soviet Union, an economic threat from countries like Japan.

مگر دولت اور طاقت کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر لینے کے باوجود جاپان عالمی سطح پر وہ اہمیت حاصل نہ کر سکا جو بظاہر اسے حاصل کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپان کے پاس اقتصادی طاقت ہے مگر جاپان کے پاس نظریہ نہیں۔ یہی بات ہے جو امریکی بینکر مسٹر مرفی (W. Taggart Murphey) نے اس طرح کہی کہ جاپان ایک ایسی سوسائٹی ہے جس کی حیثیت طاقت بغیر مقصد (Power without purpose) کی ہے۔ جاپان کے پاس دنیا کو دینے کے لیے کوئی چیز نہیں، سوا اپنے بارہ میں انوکھے پن کے ایک تصور کے:

Japan has nothign to offer the world — only the idea of its uniqueness.

سیاسی طاقت یا فوجی طاقت بظاہر بہت بڑی چیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نظریہ کی طاقت اس سے بھی زیادہ بڑی ہے۔ مادی طاقت نظریہ کے بغیر بے حقیقت ہے۔ جب کہ نظریہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ مادی طاقت کے بغیر بھی ناقابل تسخیر طاقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس گروہ کے پاس ایک نظریہ ہو۔ جو انسانوں کو ایک اعلیٰ مقصد کا تصوّر دے سکتا ہو۔ وہ سب سے بڑی چیز کا مالک ہے۔ وہ خود اپنی بنیاد پر کھڑا ہو سکتا ہے، وہ ہر چیلنج کا مقابلہ کر کے آگے بڑھ سکتا ہے۔ نظریہ دوسری چیزوں پر قیادت کرتا ہے، دوسری چیزیں نظریہ کے اوپر قائد نہیں بن سکتیں۔

برتر طاقت

قاہرہ کے عربی جریدہ آخر ساعۃ مصر (۲۱ رجب ۱۴۱۱ھ) نے لکھا ہے کہ اگست ۱۹۹۰ میں جب عراق نے کویت پر حملہ کیا تو اس کے بعد قاہرہ میں دکتور احمد الرائف کے مکان پر نشستیں ہونے لگیں۔ اس میں عرب علماء اور مفکرین کا منتخب طبقہ شرکت کرتا تھا۔

ایک روز مصری اہل علم کی ایک تعداد بیٹھی ہوئی تھی۔ گفتگو کا موضوع صدام حسین کی ضد اور جارحیت تھی اور یہ کہ اس کے نتیجہ میں امت مسلمہ کتنے بڑے سیاسی اور اقتصادی اور تہذیبی مسائل میں مبتلا ہوگئی ہے۔ ہر ایک اس خلیجی بحران پر اظہار افسوس کر رہا تھا اور اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس پر اظہار خیال کر رہا تھا۔

انھیں میں سے ایک دکتور زغلول النجار تھے۔ وہ ریاض کی جامعۃ الامام محمد بن سعود میں استاد ہیں۔ وہ انگریزی اچھی جانتے ہیں۔ امریکی فوجیں جب حفر الباطن (سعودی عرب) میں ٹھہری ہوئی تھیں، اس وقت سعودی حکومت نے دکتور زغلول النجار کو حفر الباطن بھیجا تھا تاکہ وہ ان کے سامنے اسلام پر لکچر دیں۔ اس کی فرمائش خود امریکی فوجیوں نے کی تھی۔

دکتور نجار نے کہا کہ موجودہ بحران بلاشبہ ایک سخت نامبارک واقعہ ہے۔ مگر میں آپ کو اس تاریک صورت حال میں ایک مبارک خبر سنانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ امریکی ایرفورس کے چیف نے مجھ کو مدعو کیا تھا اور فرمائش کی تھی کہ میں شرق اوسط کی تہذیب وثقافت اور اس کے عقائد کے موضوع پر امریکی فوجوں کے سامنے لکچر دوں تاکہ وہ اس علاقہ کے لوگوں کے مذہب وتہذیب سے واقف ہوسکیں۔

اس موضوع میں اسلام اپنے آپ شامل تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لکچر میں ان کے سامنے اسلام کی تعلیمات کا تعارف کرایا اور ان کو اسلامی قدروں سے واقف کرایا۔ امریکی ایرفورس کے جنرل نے نہایت احترام کے ساتھ میرا استقبال کیا اور فوجیوں نے بہت توجہ کے ساتھ میری باتوں کو سنا۔

جب میں نے اپنا لکچر ختم کیا تو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک امریکی پائلٹ اپنے ہزاروں ساتھیوں کے درمیان سے اٹھا اور اسی وقت اپنے قبول اسلام کا اعلان کیا۔ اس نے اپنے متعلق اظہار خیال

کرتے ہوئے بتایا کہ کئی سال سے ایسا تھا کہ مجھے اپنے اندر کسی چیز کی کمی کا احساس ہوتا تھا اور میں برابر اس کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں تھا۔ اس درمیان میں نے تقریباً پانچ سو کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ایک سو سے زیادہ چرچ میں گیا۔ مگر مجھے اپنی مطلوبہ چیز نہیں ملی۔ آج آپ نے اسلام کے بارہ میں جو معلومات دی ہیں ان کو سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہی وہ چیز ہے جس کی مجھے عرصہ سے تلاش تھی۔

اس کے بعد مذکورہ امریکی پائلٹ نے دکتور زغلول النجار سے کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ آپ بتائیے کہ میں اس کا اظہار کس طرح کروں۔ انھوں نے کہا کہ اس کا طریقہ بالکل سادہ ہے۔ آپ کلمۂ شہادت اپنی زبان سے ادا کیجئے۔ آپ کہئے: اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ۔ پائلٹ نے فوراً کلمہ پڑھا اور لکچر ہال میں سب کے سامنے کئی بار اس کو دہرایا۔

دکتور زغلول النجار نے بتایا کہ اس کے بعد حفر الباطن کے امریکی فوجیوں کے درمیان اسلام کا چرچا ہوا۔ لوگ اسلام قبول کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک فوجی کرنل نے انھیں بتایا کہ یہاں اسلام قبول کرنے والے امریکی فوجیوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے۔

خلیجی بحران کے زمانہ میں امریکہ ایک سپر پاور کی حیثیت سے عرب دنیا میں آیا۔ اس نے مسلم قوموں کے اوپر اپنی مادی برتری قائم کرلی۔ مگر عین اسی وقت ایک میدان ایسا تھا جہاں اہلِ اسلام کو امریکہ کے اوپر ناقابل تسخیر برتری حاصل تھی۔ یہ عقیدہ اور نظریۂ حیات کا میدان تھا۔ امریکی فوجی مادی اعتبار سے غالب ہونے کے باوجود مجبور تھے کہ وہ فکری اور روحانی اعتبار سے اسلام کے آگے جھک جائیں۔

اسلام اپنی ذات میں ایک طاقت ہے۔ وہ ہر فوجی اور مادی طاقت کے اوپر غالب آتا ہے۔ اسلام کے پاس بظاہر فوجی اور مادی طاقت نہ ہو تب بھی وہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ کیوں کہ وہ خود ان لوگوں کو مسخر کرلیتا ہے جو فوجی اور مادی طاقت کے مالک بنے ہوئے ہوں۔

مذہب ہر آدمی کی ضرورت ہے۔ مذہب ہر آدمی کی فطرت کی پکار ہے۔ آدمی خود اپنی اندرونی طلب کے تحت مجبور ہے کہ وہ مذہب کی تلاش کرے۔ مگر اسلام کے سوا جتنے مذاہب ہیں ان میں تحریف ہو چکی ہے۔ اس بنا پر انھوں نے فطرت سے اپنی مطابقت کھو دی ہے۔ اسلام ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے۔ اس لیے آج اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو آدمی کی فطری طلب کا حقیقی جواب بن سکتا ہے۔

اسلام کی برکت

منگولیا کے پہاڑی علاقہ میں بسنے والے قبائل کے سردار کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس نے بعد کو چنگیز خاں (۱۲۲۷ - ۱۱۶۲) کے نام سے شہرت پائی۔ وہ نہایت لائق اور حوصلہ مند آدمی تھا۔ اس نے وحشی قبائل کو متحد کرکے ایک فوج بنائی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے لیے مقدر کیا گیا ہے کہ وہ سارے عالم کو فتح کرے۔

اولاً چنگیز خاں اور اس کے بعد اس کے بیٹے اور پوتے عالمی فتح کے اس منصوبہ کے لیے نکل پڑے۔ یہ لوگ جو تاریخ میں تاتاری یا منگول (Mongols) کہے جاتے ہیں، انھوں نے مشرقی یورپ سے لے کر چین اور ہندستان تک آباد دنیا کے بڑے حصہ میں تباہی برپا کردی۔ ۱۲۲۰ میں وہ ترکستان میں داخل ہوئے۔ ایک وسیع علاقہ میں انھوں نے عمارتیں ڈھا دیں، شہریوں کو قتل کر ڈالا۔ آبپاشی کے نظام کو تہ و بالا کر دیا (18/793) ۱۲۵۸ میں انھوں نے بغداد کے عالیشان شہر کو کھنڈر بنا ڈالا (2/586) وغیرہ، وغیرہ۔

ان وحشی قبائل کی یہ تباہ کاری مشرقی یورپ تک پہونچ گئی تھی۔ انھوں نے ۴۲-۱۲۴۱ میں پولینڈ پر حملہ کیا۔ انھوں نے روتھینیا (Red Ruthenia) کو اپنا مرکز بنالیا تھا۔ یہاں سے وہ پولینڈ پر غارت گرانہ حملہ کرتے تھے۔ ان مسلسل حملوں نے پولینڈ کو تباہ و برباد کر دیا تھا:

... from this base their repeated raids devastated Poland (14/639).

ان منگولوں (تاتاریوں) کی تباہ کاری کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اس کو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے وحشت و بربریت کے اس طوفان سے دنیا کو نجات دی۔ یہ صرف اسلام کی تسخیری طاقت تھی۔ ۱۲۵۸ میں جب وہ مسلم دنیا میں فاتح بن کر داخل ہوئے تو اسلام نے ان کے قلب و روح کو مسخر کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ تقریباً نصف صدی کے اندر مسلم قوموں کو بھی ان کے ظلم سے نجات مل گئی اور اسی کے ساتھ بقیہ دنیا کو بھی ـــــ آج دوبارہ دنیا کے انسان اس انتظار میں ہیں کہ اسلام وقت کے "تاتاریوں" کی روح کو مسخر کرے اور انسانی سماج دوبارہ امن اور انصاف کا گہوارہ بن جائے۔

اسلام آدمی کی زندگی کو بامعنی زندگی بناتا ہے۔ اسلام کے اندر ہر آدمی کے لیے افادیت ہے۔ اسلام ہر آدمی کی تلاش کا صحیح ترین جواب ہے۔

ڈاکٹر جارودی (Roger Garaudy) فرانس میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ وہ عیسائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ۱۹۳۳ء کے مشہور اقتصادی بحران نے ان کے ذہن پر اثر ڈالا۔ وہ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے، تاہم ان کو ذہنی اطمینان نہ مروجہ مسیحیت میں ملا اور نہ کمیونزم میں۔ بعد کو انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور ۱۹۸۲ء میں اسلام قبول کر لیا۔

ڈاکٹر جارودی کو ۱۹۸۶ء میں شاہ فیصل فاؤنڈیشن کے تحت خدمت اسلام کا نصف ایوارڈ دیا گیا۔ اس موقع پر ریاض میں ایک تقریب ہوئی جس میں ڈاکٹر جارودیؔ نے اپنے حالات کے بارہ میں مفصل تقریر کی۔ یہ تقریر انھوں نے فرانسیسی زبان میں کی تھی۔ اس کا مکمل عربی ترجمہ سعودی اخبار الریاض (۲ رجب ۱۴۰۶ھ، ۱۲ مارچ ۱۹۸۶ء) میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر جارودی کا ذہن جب کمیونزم سے ہٹا اور وہ مذہب کی جانب مائل ہوئے تو ابتداءً ان کا میلان مسیحیت کی طرف ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے باقاعدہ طور پر اسلام قبول کر لیا۔ اسلام میں انھوں نے اپنے پورے ذہنی اطمینان کو پالیا۔ الحاد سے اسلام کی طرف اپنے اس سفر کو بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں نے ایسا اس لیے کیا تاکہ کر کے گارڈ (Kierkegaard) کے الفاظ میں، اپنی زندگی کو بامعنی بنا سکوں (حتی اعطی لحیاتی معنی)

زندگی میں معنویت کی تلاش ایک فطری جذبہ ہے۔ وہ ہر آدمی کے اندر لازمی طور پر اور پیدائشی طور پر پایا جاتا ہے۔ اپنی اس اندرونی تلاش کا جواب پانے کے لیے وہ ہر طرف دوڑتا ہے۔ مگر دوسری تمام چیزوں میں اس کا جواب یا تو سرے سے موجود نہیں ہے یا اگر ہے تو جزئی طور پر ہے۔ اس لیے دوسری چیزوں میں انسان کو یہ تسکین نہیں ملتی کہ اس نے اپنی تلاش کا صحیح اور کامل جواب پالیا ہے۔

اس تلاش کا صحیح اور مکمل جواب صرف خدا کے محفوظ دین ــــــــــ اسلام میں موجود ہے۔ اسلام کی یہ امتیازی صفت اس کی دعوتی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

اسلام کی اثر انگیزی

شیخ محمد بدر الاسلام فضلی بی اے ، بی ٹی (علیگ) ہندستان سے جاپان گیے ۔ انگریزی دور کی ہندستانی حکومت نے ان کا تقرر ٹوکیو کے اسکول آف فارن لینگویجز میں کیا تھا ۔ وہ وہاں اردو اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے ۔

مسٹر فضلی دسمبر ۱۹۳۰ میں سمندری جہاز سے جاپان پہونچے ۔ وہ اپریل ۱۹۳۲ تک وہاں مقیم رہے ۔ جاپان کے حالات اور اپنے سفر کی روداد پر انھوں نے اسی زمانہ میں ایک کتاب "سیاحت جاپان" لکھی تھی ۔ یہ کتاب چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۳۴ میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے شائع ہوئی تھی ۔ مطبع کا نام کتاب پر "جامع برقی پریس دہلی" لکھا ہوا ہے ۔

مصنف نے اس کتاب میں جو واقعات نقل کیے ہیں ، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ انسائیکلوپیڈیا میں اسلام پر مقالہ لکھنے کے لیے ایک جاپانی فاضل نے اسلام کا مطالعہ کیا ۔ اس سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ۔ یہاں ان کے اپنے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں :

" جمعہ کے روز نماز کے لیے مسجد گیا ۔ ۵۰ نمازی جمع ہوئے ۔ ہر شخص ہیٹ کے نیچے ایک گول مخمل کی ٹوپی پہن کر آیا تھا ۔ نیچے کی منزل میں اور زینہ پر بہت سی کھونٹیاں دیوار پر لگی ہوئی ہیں ۔ ہیٹ ان پر ٹانگ دی اور گول ٹوپی پہن کر اوپر کے ہال میں جہاں نماز ہوتی ہے ، جمع ہوئے ۔ بعض لوگوں نے نیچے کی منزل میں وضو بھی کیا ۔

نماز کے بعد تمام نمازیوں سے مصافحہ ہوا ۔ یہیں ایک جاپانی صاحب سے بھی تعارف ہوا ۔ یہ بھی نماز میں شریک تھے ۔ ایک روسی مسلمان مسٹر صابر جمیل نے مجھ کو اور جاپانی مسلمان صاحب کو جن کا نام مسٹر سبورو تھا ۔ اسی وقت چائے نوشی کی دعوت دی ۔ صابر صاحب مسجد کے قریب ہی ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان میں رہتے ہیں ۔ ان کی اہلیہ محترمہ عائشہ نے مہمانوں کی بڑی خاطر مدارات کی ۔

مسٹر سبورو سے اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی ۔ میں نے دریافت کیا کہ اسلام کی کس خوبی نے آپ کو اس طرف مائل کیا ۔ انھوں نے بیان کیا کہ ان سے جاپانی انسائیکلوپیڈیا میں اسلام کے متعلق آرٹیکل لکھنے کے لیے کہا گیا تھا ۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ۔ مطالعہ اور تحقیق کے بعد

خود بخود اسلام کی حقانیت ان پر روشن ہوگئی۔ اور بغیر کسی خارجی تحریک کے مشرف بہ اسلام ہوگیا۔
انھوں نے کہا کہ اسلام کی بے شمار خوبیاں ہیں۔ مگر دو خوبیوں نے خصوصاً ان پر بڑا اثر کیا۔ اول توحید اور ثانیاً مذہبی رواداری۔ مسٹر سبورو ٹوکیو میں تنہا جاپانی مسلمان ہیں۔ ان کے علاوہ تمام جاپان میں معدودے چند جاپانی مسلمان ہیں۔" سیاحت جاپان، صفحہ ۱۴ — ۱۱۱

ماضی اور حال کی تاریخ میں اس طرح کے واقعات کثرت سے پائے جاتے ہیں جب کہ کسی آدمی نے اتفاقاً کسی اور مقصد کے تحت اسلام کی کتابوں کو پڑھا۔ پڑھنے سے پہلے وہ سمجھتا تھا کہ وہ صرف معلومات کے لیے اسلام کو پڑھ رہا ہے۔ مگر جب اس نے اسلام کو پڑھا تو وہ اس سے اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ اسلام قبول کرلیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کامل معنوں میں ایک فطری مذہب ہے۔ انسان کی فطرت میں جو احساسات غیر ملفوظ حالت میں چھپے ہوئے ہیں، اسلام انھیں احساسات کو ملفوظ حالت میں بیان کرتا ہے۔ اسلام ہر آدمی کے اپنے دل کی آواز ہے۔

چنانچہ جب کوئی شخص اسلام کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ حیرت انگیز طور پر محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اپنے دل کی کتاب کو پڑھ رہا ہے۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ جس اسلام کو اس نے صرف پڑھا تھا، اس کو وہ عملاً بھی اختیار کرلے۔ اسلام کو جان لینے کے بعد اس کو نہ ماننا خود اپنا انکار بن جاتا ہے، اور کون ہے جو خود اپنا انکار کرنے کا تحمل کر سکے۔

اسلام کی عمومی اشاعت کے لیے جو واحد شرط مطلوب ہے وہ صرف یہ کہ داعی اور مدعو کے درمیان نفرت کی فضا کو ختم کر دیا جائے۔ نفرت کی فضا ختم ہوتے ہی اسلام اپنے آپ اپنا کام کرتا ہے۔ وہ خود ہی لوگوں کے دلوں میں پہنچنے کے لیے اپنا راستہ بنالیتا ہے۔

نفرت کی فضا دوطرفہ طور پر ختم نہیں ہوسکتی۔ یہ فضا جب بھی ختم ہوگی یک طرفہ طور پر ختم ہوگی یہ یک طرفہ ذمہ داری داعی کو قبول کرنا ہے۔ یہ کام داعی کو کرنا ہے کہ وہ مدعو کی زیادتیوں پر یک طرفہ طور پر صبر کرے تاکہ نفرت کا ماحول ختم ہو اور داعی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا قائم ہو جس میں دین حق کی آواز بلا روک ٹوک لوگوں تک پہنچنے لگے۔ جب اسلام کوشش کے بغیر لوگوں کو متاثر کررہا ہو تو کوشش کے بعد وہ کتنا زیادہ لوگوں کو متاثر کرے گا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

آنے والی صدی

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ نے عالمی سیاست میں جو فوقیت حاصل کی، اس کے بعد سمجھا جانے لگا تھا کہ اب امن برطانیہ (Pax Britanica) کا دور ختم ہوگیا، اور امن امریکہ (Pax Americana) کا دور شروع ہوگیا ہے۔ ۱۹۹۰ میں ایک طرف خلیج کی جنگ میں غیر معمولی فتح اور دوسری طرف روس کے سپر پاور کی حیثیت سے خاتمہ نے امریکی دانشوروں کو اس یقین تک پہنچایا ہے کہ اب انسانی تاریخ امریکی بالادستی کے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ اور اکیسویں صدی بلاشبہہ امریکی صدی (American century) ثابت ہوگی۔

موجودہ زمانہ میں امریکہ مغربی تہذیب کا قائد ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کو مغربی تہذیب کی برتری کے ہم معنی سمجھا جارہا ہے۔ ممتاز امریکی دانشور فرانسس فوکویامی (Francis Fukuyame) نے اس سلسلہ میں متعدد آرٹیکل امریکی اور غیر امریکی جرنلوں میں شائع کیے ہیں۔ تین حوالے یہ ہیں :

The End of History, *The National Interest*, Summer 1989
Are We Witnessing the End of History, *Sunday Star*, September 1989
Are We at the End of History, *Fortune*, January 1990

ان کا کہنا ہے کہ موجودہ صدی جو اپنے خاتمہ کو پہنچ رہی ہے وہ اقتصادی اور سیاسی آزادی کے اصول کی واضح فتح (unabashed victory of economical and political liberalism) پر منتج ہوئی ہے۔ ہم غالباً انسانیت کے نظریاتی ارتقاء کے نقطۂ کمال کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ مغرب کی آزاد جمہوریت اب انسانی حکومت کے آخری نظام کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آگئی ہے :

We may be witnessing the end point of mankind's ideological evolution and the emergence of western liberal democracy as the final form of human government.

اسی قسم کا دعویٰ ۷۵ سال پہلے کمیونسٹ روس نے کیا تھا، اب یہی دعویٰ سرمایہ دار امریکہ کر رہا ہے۔ مگر اشتراکی ڈکٹیٹر شپ کا جو انجام ہوا، وہی انجام یقینی طور پر مغربی لبرلزم کا بھی ہونے والا ہے۔

زندگی کی تشکیل میں دو چیزوں کا دخل ہے۔ ایک نظام اور دوسرے، نظام کو چلانے والے افراد۔ نظام کے لیے انسانی افراد کی ضرورت ہے اور انسانی افراد کے لیے نظام کی۔ مگر ایک مسئلہ ہر نظام کو درپیش رہتا ہے۔ وہ انسان کی یہ کمزوری کہ جب بھی اس کو اختیار دیا جاتا ہے، وہ اپنے اختیار کے استعمال میں حد پر نہیں ٹھہرتا، وہ حد بندیوں کو توڑ کر اس کے باہر چلا جاتا ہے۔

آزادی اچھی چیز ہے۔ لیکن آزادی اسی وقت اچھی ہے جب کہ اس کو محدود دائرہ میں استعمال کیا جائے۔ مگر انسان کو جب آزادی دی جائے تو وہ اس کو کامل آزادی تک لے جانا چاہتا ہے۔ یہاں پہنچ کر آزادی کی نفی ہو جاتی ہے، اس کے بعد انسانی سماج میں بگاڑ کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ امریکہ میں انسان کو آزادی دی گئی۔ مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ لوگ حد پر نہیں رکے۔ ہر آدمی اپنی آزادی کو لامحدود آزادی کے طور پر استعمال کرنے لگا۔ اس کے نتیجہ میں طرح طرح کے سماجی فساد پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ اسکنر (B.F. Skinner) جیسے مفکرین پیدا ہوئے جنھوں نے اعلان کیا کہ ہم آزادی کا تحمل نہیں کر سکتے (We can't afford freedom)

اس کے مقابلہ میں دوسرا نظام جبر کا نظام ہے جس کو اشتراکی اصطلاح میں "مزدور کی ڈکٹیٹر شپ" کا نام دیا گیا ہے۔ مگر وہ بھی نہایت مہلک ثابت ہوا۔ جن انسانوں کو نظام جبر قائم کرنے کا اختیار دیا گیا انھوں نے اس کو لوگوں کے اوپر کامل جبر نافذ کرنے کے لیے استعمال کیا۔ جبر میں جزئی افادیت تھی۔ مگر اپنی حد سے آگے بڑھنے کے بعد اس نے اپنی افادیت کھو دی۔ چنانچہ "مزدور ڈکٹیٹر شپ" تاریخ کی بدترین شہنشاہیت کے ہم معنی بن گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ آزادی کا نظام ہو یا جبر کا نظام، دونوں کے لیے ایک ایسی مزید آئیڈیالوجی کی ضرورت ہے جو انسانی ارادہ کو کنٹرول کرے، جو انسان کو اپنی جائز حد پر رہنے کے لیے مجبور کر سکے۔ یہ آئیڈیالوجی صرف مذہب فراہم کرتا ہے۔ اب چونکہ دوسرے تمام مذاہب تحریف کی بنا پر ناقابل اعتبار ہو چکے ہیں، اس لیے اب اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اس آئیڈیالوجی کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے، اب اسلام ہی مذہب کا واحد نمائندہ ہے، اس لیے اب اسلام ہی ہے جو کسی نظام کی اس لازمی ضرورت کو پورا کر سکے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آنے والا دور پیکس امریکانا نہیں ہے بلکہ پیکس اسلامیکا (Pax Islamica) ہے، اگرچہ سطحی بین لوگ اس کو نہیں سمجھتے۔

دین محفوظ کی طاقت

۱۹۴۷ سے پہلے کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ جب کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ ایک پادری صاحب دہرہ دون میں تقریر کر رہے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک مجمع ان کی تقریر سن رہا تھا۔ وہ اپنی تقریر میں یہ ثابت کر رہے تھے کہ عیسیٰ مسیح خدا کے بیٹے ہیں اور انسانوں کی نجات صرف اس میں ہے کہ وہ آپ کی ابنیت اور کفارہ کے عقیدہ پر ایمان لائیں۔

مجمع میں ایک نوجوان مولوی بھی موجود تھے۔ وہ جلد ہی مدرسہ سے پڑھ کر نکلے تھے۔ پادری کی تقریر سن کر انھیں جوش آگیا۔ انھوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔ خدا کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ مولوی ابھی نوعمر تھے جب کہ پادری کافی تجربہ کار ہو چکا تھا۔ اس نے مولوی صاحب کو اپنے دلائل میں اس طرح الجھایا کہ بظاہر وہ لاجواب ہونے لگے۔

مجمع میں ایک جاہل مسلمان بیٹھا ہوا تھا جو معمولی تجارت کر کے اپنا کام چلاتا تھا۔ اس کو یہ منظر دیکھ کر غیرت آئی۔ وہ اٹھ کر مولوی صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ آپ بیٹھ جائیے۔ یہ پادری جاہل ہے۔ اور میں بھی جاہل ہوں۔ جاہل کا مقابلہ جاہل ہی کر سکتا ہے یہاں عالم کا کوئی کام نہیں۔

اس مسلمان نے پادری صاحب سے کہا۔ اب بتائیے کہ آپ کیا کہتے ہیں۔ پادری نے پُراعتماد لہجہ میں دہرایا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔

مسلمان نے بات کو مزید پختہ کرنے کے لیے کہا کہ آپ کا یہ کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں اور اللہ میاں ان کے باپ ہیں، پادری نے کہا ہاں۔ اب مسلمان نے پوچھا، اچھا یہ بتائیے کہ اللہ میاں کی عمر کتنی ہوگی۔ پادری نے کہا کہ بے وقوف، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اللہ میاں ازل سے ابد تک ہیں۔ ان کی عمر کیسے متعین کی جا سکتی ہے۔ عمر تو اس کی ہوتی ہے جو محدود ہو، خدا تو لامحدود ہے۔ مسلمان نے دوبارہ سوال کیا کہ ٹھیک ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ اتنی لمبی زندگی میں اللہ میاں کے یہاں کتنی اولاد ہوئی۔ پادری نے کہا صرف ایک، عیسیٰ مسیح، وہ اللہ کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ مسلمان نے کہا۔ لاحول ولاقوۃ، مجھے دیکھو۔ میری عمر ۵۲ سال کی ہے۔ اور میں ۱۲ بچے پیدا کر چکا ہوں۔ اللہ میاں کی عمر اربوں اور کھربوں سال سے بھی زیادہ ہے اور اب تک ان کے یہاں صرف ایک اولاد ہوئی۔

جب میرے جیسے آدمی کے یہاں ۱۲ اولاد ہوگئی تو اللہ میاں کے ایک ہی کیوں۔

عوام نے یہ سن کر فوراً تالی بجادی۔ پادری صاحب نے کچھ جواب دینا چاہا مگر تالیوں کی گونج میں ان کی آواز دب گئی۔ لوگوں نے پادری سے کہا کہ بس اب بات ختم ہوگئی۔ تمہارے پاس مسلمان کی بات کا کوئی جواب نہیں۔ اگلے دن اشتہار چھپ گیا کہ دہرہ دون میں مناظرہ ہوا۔ اس مناظرہ میں مسلمانوں کی جیت ہوئی اور پادری صاحب بری طرح ہار گئے۔

اسلام ایک محفوظ اور غیر محرف مذہب ہے، اور مسیحیت ایک غیر محفوظ اور محرف مذہب۔ اسی فرق کا یہ کرشمہ تھا کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ پادری کے مقابلہ میں ایک جاہل مسلمان کو فتح حاصل ہوئی۔

کوئی مذہب جب محفوظ حالت میں ہو تو وہ عین فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان کی فطرت ہی اس کو سمجھنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت اس کو انتہائی حد تک طاقت ور بنا دیتی ہے۔ یہ فطری طاقت آج صرف اسلام کو حاصل ہے۔ کیوں کہ آج اسلام ہی واحد مذہب ہے جو تحریف اور ملاوٹ سے پاک ہے۔ وہ اپنی اصل صورت میں محفوظ ہے۔ جب کہ دوسرے تمام مذاہب تحریف کے نتیجہ میں اپنی فطری سادگی کو کھو چکے ہیں۔ دوسرے مذاہب کی نمائندگی صرف ان کے علما ہی کر سکتے ہیں۔ جبکہ اسلام کی نمائندگی ایک عام مسلمان بھی بخوبی طور پر کر سکتا ہے۔

اسلام کی اس خصوصیت کی بنا پر یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک عام مسلمان بھی اس کا مبلغ بن جائے۔ ایک عام مسلمان بھی بڑے بڑے لوگوں سے مقابلہ کرکے اسلام کی حقانیت ثابت کر سکے۔

اسلام کی اس صفت نے اسلامی دعوت کی تسخیری قوت کو آخری حد تک بڑھا دیا ہے۔ اس نے اسلام کو ناقابلِ شکست حد تک ایک فاتح مذہب بنا دیا ہے۔

دوسرے مذاہب میں کسی کو اس مذہب کا مبلغ بنانا ہو تو اس کو خصوصی تربیت دینا ضروری ہوتا ہے۔ ان مذاہب کی تعلیمات اتنی پیچیدہ اور عقل عام سے اتنی ہٹی ہوئی ہیں کہ عام آدمی کے لیے ان کا مبلغ بننا ممکن نہیں۔ عام آدمی صرف ان کا مقلدانہ پرستار بن سکتا ہے وہ ان کا داعی اور مبلغ نہیں بن سکتا۔ مگر اسلام عین عقل عام کے مطابق ہے۔ اس لیے ہر آدمی خود اپنی فطری عقل کے ذریعہ اسلام کا داعی بن سکتا ہے۔ اسلام کا داعی اور مبلغ بننا اتنا ہی آسان ہے جتنا خود اپنی فطرت کی آواز کو لفظوں میں بیان کرنا۔

کون سا مذہب

ڈاکٹر رادھا کرشنن (۱۹۷۵-۱۸۸۸) ہندستان کے مشہور مصنف اور فلسفی تھے۔ ان کی ایک کتاب وہ ہے جس کا نام مذہب اور کلچر (Religion and Culture) ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے دکھایا ہے کہ مذہب انسان کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ مذہب کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلہ میں وہ کہتے ہیں کہ سوال مذہب یا بے مذہب کا نہیں بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کس قسم کا مذہب:

There is no question of religion or no religion, but what kind of religion.

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے جس قسم کے مذہب کی وکالت کی ہے، وہ مذہب وہ ہے جو وحدتِ ادیان پر عقیدہ رکھتا ہو۔ یعنی یہ تصور کہ ایک ہی آفاقی حقیقت ہے جو ہر مذہب میں ظاہری فرق کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

یہ نظریہ دراصل جزء پر کل کو قیاس کرکے وضع کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دو مختلف سچائیوں میں جزئی فرق ہو سکتے ہیں، تاہم اس جزئی فرق کے باوجود دونوں سچائیاں ایک مانی جائیں گی۔ مگر جب فرق کلی نوعیت کا ہو، مثلاً ایک مذہب کہے کہ خدا ہے، اور دوسرا مذہب کہے کہ مستقل بالذات حیثیت سے خدا کا کوئی وجود نہیں، اس طرح کے فرق جہاں پائے جائیں وہاں کوئی ایک ہی مذہب سچا ہوگا نہ کہ دونوں مذہب۔

مذہب کی ایک قسم وہ ہے جو ذاتی تجربات کو مذہب کی بنیاد بتاتی ہے۔ اس قسم کا مذہب سراسر ناقابل قبول ہے۔ کیوں کہ اصل سوال استناد کا ہے۔ ذاتی تجربہ کی بنیاد پر جو مذہب بنے، اس کو مستند نہیں کہا جا سکتا، اس لیے وہ قابل قبول بھی نہیں ہو سکتا۔

وہ کون سا مذہب ہے جس کو اختیار کیا جائے۔ خالص علمی اعتبار سے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مذہب جو ثابت شدہ ہو۔ یعنی وہ مذہب جو تاریخ کے معیار پر مستند ثابت ہو۔ وہ مذہب جس کا پیغمبر تاریخی پیغمبر ہو۔ جس کی دی ہوئی کتاب اپنی اصل صورت میں محفوظ ہو۔ جو تاریخ کی کسوٹی پر پوری طرح معتبر قرار پاتا ہو۔

اسلام فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ اسلام اور فطرت دونوں ایک دوسرے کے مثنی ہیں۔ اسلام کو جاننے کے بعد آدمی اس طرح اس کو قبول کرتا ہے گویا وہ اس کے اپنے دل کی بات ہو۔

مس سینڈرا اسٹرلنگ (Sandra Sterling) ایک امریکی خاتون ہیں۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب ان کا نیا نام عالیہ اسٹرلنگ (Alia Sterling) ہے۔ وہ امریکہ کی راجدھانی واشنگٹن میں رہتی ہیں۔

انھوں نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ ایک روز مجھے گھر کی الماری میں کچھ کتابیں ملیں۔ یہ کتابیں میری ماں نے اس وقت خریدی تھیں جب کہ وہ میری دادی کے ساتھ قاہرہ میں رہتی تھیں۔ میری دادی قاہرہ کے امریکی سفارت خانے میں ایک عہدہ دار تھیں۔ ان کتابوں میں ایک قرآن کا انگریزی ترجمہ بھی تھا۔ میں نے اس ترجمہ کو پڑھنا شروع کیا۔ اس کے مطالعہ سے میری دلچسپی بڑھی۔ اس کے بعد میں نے واشنگٹن سے اسلام کی تاریخ اور پیغمبر کی سیرت پر مزید کتابیں حاصل کیں اور ان کا مطالعہ کیا۔ اس طرح اسلام کی طرف میرا سفر شروع ہوا۔ اسلام نے مجھے ان تمام سوالوں کا جواب دیدیا جو میرے ذہن میں موجود تھا :

Islam answered all the questions I had in mind.

اسلام کی بنیاد توحید پر ہے۔ اور یہ چیز اس کو تمام دوسرے مذاہب سے الگ کرتی ہے۔ مثال کے طور پر یہودیت بھی ایک خدا کی بات کرتی ہے۔ مگر اس مذہب کے ماننے والوں کا دعویٰ ہے کہ خدا نے اپنی تمام نعمتیں صرف ایک قوم (یہود) کے لیے خاص کر دی ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ خدا جب ہر چیز کا خالق ہے تو اس نے اپنی نعمتوں کو کسی ایک گروہ کے لیے کیوں مخصوص کر دیا۔ دوسری طرف مسیحیت کا یہ حال ہے کہ وہ مسیح کو خدا کا بیٹا کہتی ہے۔ یہ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اور نہ یہ سمجھ میں آتا کہ خدا کی خدائی میں کوئی اور حصہ دار ہو سکتا ہے۔ ان باتوں پر میں بہت عرصہ تک غور کرتی رہی۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔

Islamic Voice, Bangalore, November 1987

آدمی کی فطرت میں مطلوب دین کا ماڈل پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب دین حق کو جانتا ہے تو وہ فوراً اس کو قبول کر لیتا ہے، کیوں کہ وہ اس کے معلوم ماڈل کے عین مطابق تھا۔

نیا مستقبل

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری دین ہے۔ اس کو ہر حال میں محفوظ اور قائم رہنا ہے۔ اس لیے شروع سے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بڑا عجیب رہا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کو مکہ سے نکالا جا رہا تھا تو وہ مدینہ میں داخل ہو کر اپنے لیے عالمی فتوحات کے دور کا آغاز کر رہا تھا۔

عباسی دور میں جب تاتاریوں نے خلافت کے قلعہ کو مسمار کر دیا تو اسی قلعہ کے ملبہ سے وہ نیا شاندار دور برآمد ہو گیا جو ترکی میں عثمانی خلافت اور برصغیر ہند میں مغل شہنشاہیت کے روپ میں ظاہر ہوا۔ آج بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں اسلام دوبارہ ایک نئے عہد کے دروازہ پر کھڑا ہوا ہے، ایک ایسا دروازہ جس میں داخل ہو کر خدا کا دین پوری دنیا کو روشنی اور زندگی دینے کا ذریعہ بن جائے۔

برصغیر ہند کے سیاسی لیڈروں نے ۱۹۴۲ میں کوئٹ انڈیا (Quit India) کا نعرہ دیا تھا۔ یعنی اے انگریزو، ہندستان چھوڑ دو۔ اس نعرہ کے بعد انگریز کی عظیم شہنشاہیت ہل گئی۔ یہاں تک کہ صرف پانچ سال کے اندر، ۱۹۴۷ میں اس کو مکمل طور پر ہندستان کو چھوڑ دینا پڑا۔ وہ ہندستان کو ہندستانیوں کے حوالے کر کے اس ملک سے واپس چلے گئے۔

آج یہ واقعہ بالکل سادہ سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر ۱۹۴۷ سے پہلے یہ ایک انوکھا واقعہ تھا۔ حتی کہ بہت سے لوگ آخر وقت تک اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ۱۹۴۶ میں میں کانپور میں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت کانپور کے ایک اردو اخبار نے اپنے اڈیٹوریل میں لکھا تھا کہ انگریز آزادی کی بات کر کے ہندستانیوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ بھلا وہ اس سونے کی چڑیا کو چھوڑ کر یہاں سے جا سکتا ہے۔ مگر پندرہ اگست ۱۹۴۷ کو ساری دنیا نے جان لیا کہ یہ انوکھا واقعہ ہو گیا اور انگریز ہندستان کو ہندستانیوں کے حوالے کر کے چلا گیا۔

اسی طرح آج اسلام کے احیاء کے لیے بھی شاندار امکانات موجود ہیں۔ جو لوگ صرف ظاہری چیزوں کو دیکھنے والی نظر رکھتے ہیں، انھیں اس قسم کی بات محض خوش فہمی معلوم ہوتی ہے۔ مگر حالات کو زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو یہ بات عین ہونے والی بات نظر آنے لگے گی۔ آج ہمیشہ سے زیادہ یہ موقع ہے کہ اسلام کو دوبارہ عالمی فکری طاقت کا درجہ دیا جا سکے۔

موجودہ زمانہ میں بے شمار تمدنی اور سائنسی ترقیاں وجود میں آئی ہیں۔ یہ ترقیاں کیسے وجود میں آئیں۔ یہ سب کی سب شرک (مظاہر پرستی) کے خاتمہ اور توحید کے غلبہ کے نتیجہ میں پیدا ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ ترقیاں اگرچہ آج بظاہر مادی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی ہیں مگر حقیقۃً وہ دینی مقصد کے لیے تھیں۔ وہ دین کے کام کے لیے دینی انقلاب کے ذریعہ ظہور میں آئیں۔

موجودہ تمدنی اور سائنسی ترقی دین کی معاون ترقی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تمام ترقیاں درحقیقت دعوت دین کے نئے امکانات تھے۔ یہ خدا کے داعیوں کی راہ سے ہر قسم کی مشکلات کو ہٹا کر ان کے کام کو سہل بنانا تھا۔ اس اعتبار سے یہ تمام ترقیاں گویا اس دعا کی تکمیل ہیں جو قرآن میں ان الفاظ میں سکھائی گئی تھی: ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا (خدایا، ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جو تونے ہم سے پہلے کی امتوں پر ڈالا تھا)

موجودہ انقلاب کے نتیجہ میں انتہائی نئے دعوتی امکانات کھل گئے جنھوں نے دعوتِ حق کے کام کو بالکل آسان بنا دیا، یہ سارے نئے امکانات اسی دعا کی قبولیت کے ہم معنی ہیں۔ جدید مواصلات اس لیے ہیں کہ حق کی آواز کو انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ سارے عالم میں پھیلایا جائے۔ جدید انکشافات اس لیے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے توحید کی دعوت کو سائنٹفک سطح پر مدلل کر کے پیش کیا جائے۔ جمہوری انقلاب اس لیے آیا کہ کسی رکاوٹ کے بغیر دعوت کے کام کو جاری کیا جا سکے۔ جغرافی فاصلے اس لیے کم کیے گئے کہ خدا کے سفیر تیز رفتاری کے ساتھ سفر کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکیں اور قبل اس کے کہ موت کا فرشتہ لوگوں کے پاس آئے انھیں زندگی کے بارہ میں خدا کی اسکیم سے باخبر کر دیں۔

اس انقلاب میں دنیوی فائدے کی حیثیت ایک مزید فائدے کی تھی۔ زندگی کی آسائشیں، وسیع تجارت کے امکانات، وغیرہ سب درحقیقت ضمنی فائدے تھے۔ وہ اصل دعوتی کام کی دنیوی مزدوری تھے۔ مگر اصل کام ہونے سے رہ گیا اور ساری دوڑ دھوپ صرف مزدوری وصول کرنے پر مرتکز ہو گئی۔

دورِ جدید اپنے تمام نئے امکانات کے ساتھ اہل اسلام کو پکار رہا ہے کہ اٹھو اور نئے مواقع کو استعمال کر کے آج کی دنیا میں اسلام کی اشاعت کرو۔ اسلام کی فکر اور اس کی تعلیمات کو ساری دنیا میں پھیلا دو۔ جدید دنیا کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کو رب العالمین کے بے آمیز دین سے آگاہ کیا جائے، اور یہ بے آمیز دین آج اسلام کے سوا اور کہیں موجود نہیں۔

ایک اعتراف

۱۹۷۶ میں لندن میں جشن اسلام (Festival of Islam) کے نام سے ایک تقریب منائی گئی تھی۔ اس موقع پر لندن کے مشہور اخبار ٹائمس (۲ اپریل ۱۹۷۶) نے اپنا ایک خصوصی نمبر شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا اسلامی دنیا (The World of Islam)

ٹائمس کی اس خصوصی اشاعت میں ولفرڈ بلنٹ (Wilfred Blunt) کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں موصوف نے لکھا تھا کہ انسان کی پوری لمبی تاریخ میں شاید اس سے زیادہ اچنبھے میں ڈالنے والا کوئی واقعہ نہیں ہے جیسا کہ غیر معمولی تیز رفتاری کے ساتھ اسلام کا پھیلاؤ۔ کون اندازہ کر سکتا تھا کہ درمیانی عمر کا ایک شخص جو کسی وقت مکہ کا تاجر اور تجارتی قافلہ کا سردار ہو، جس کو ۶۲۲ء میں اس کے وطن سے نکال دیا گیا ہو اور وہ مدینہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا ہو، وہ ایک ایسے مذہب کی بنیاد رکھے گا جو اس کی موت کے ایک صدی کے اندر مہذب دنیا کے آدھے حصہ میں قائم ہو جائے گا۔ جو مغرب میں فرانس کے قلب تک پہونچ جائے گا اور مشرق میں وہ دریائے سندھ کو عبور کر کے چین کی سرحد تک جا پہونچے گا۔

ولفریڈ بلنٹ مزید لکھتے ہیں کہ فرض کرو کہ اسلام کا یہ سیلاب نہ آتا تو کیا ہوتا۔ مغرب میں سائنس کی ترقی کی تاخیر کی سب سے بڑی وجہ رومی ہندسہ کا بے ڈھنگا پن تھا۔ عربی ہندسہ جو آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں ہندستان سے بغداد پہونچ چکا تھا، اگر وہ جلد ہی مغربی یورپ پہونچتا اور مجموعی طور پر اختیار کر لیا جاتا تو وہ بہت سی سائنسی ترقی جس کو ہم اٹلی کی نشأۃ ثانیہ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں، وہ کئی سو سال پہلے حاصل ہو جاتیں۔

ولفرڈ بلنٹ (۱۸۴۰-۱۹۲۲) اسلامی تہذیب سے بہت متاثر تھا۔ اس کی ایک کتاب کا نام ہے اسلام کا مستقبل (*The Future of Islam*) یہ کتاب پہلی بار ۱۸۸۲ میں شائع ہوئی تھی۔ اس نے کئی مسلم ملکوں کا دورہ بھی کیا تھا۔ اگلے صفحہ پر اس کے اصل الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔

Most Amazing Event

Islam is one of the great religions of the world — numerically second only to Christianity. Iran *is* no more than a small corner of that vast territory, stretching from the Atlantic to the South China Sea, where the Muezzin's voice is still to be heard, though today often recorded, calling the faithful to prayer.

There is, perhaps, nothing more amazing in the whole long history of mankind than the extent and the rapidity of the dissemination of Islam. Who could possibly have foreseen that a middle-aged one-time Meccan tradesman and caravan leader, driven in the year 622 from his birth-place to take refuge in Yathrib (Medina), was to found a religion which within a century of his death would have established itself over half the civilized world, would have struck westwards into the heart of France and eastwards crossed the Indus and penetrated to the frontiers of China.

And supposing the tide of Islam had not been stemmed? Nothing so delayed the advance of science in the West as the clumsiness of the Roman numerals. Had the Arabic numerals, which had reached Baghdad from India towards the end of the eighth century, been soon afterwards introduced into and adopted by western Europe as a whole, much of that scientific progress which we associate with the Renaissance in Italy might have been achieved several centuries earlier.

— Wilfred Blunt, *The Times* (London) April 2, 1976

نیا دور

اسلام کی بعثت پر جو حکومت قائم ہوئی وہ عام معنوں میں محض ایک حکومت نہ تھی۔ یہ شرک کے اوپر توحید کا غلبہ تھا۔ قدیم زمانہ میں دعوتِ توحید کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شرک اور سلطنت دونوں ایک دوسرے سے جُڑے ہوتے تھے۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ مشرکانہ عقائد سے اپنے لیے حکومت کا حق ثابت کرتے تھے۔ اس بنا پر شرک کے خلاف دعوت سلطنت کے خلاف دعوت بن جاتی تھی۔ اور وقت کی سلطنت ایسی دعوت کو مٹانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔

قدیم زمانہ میں خدائی بادشاہوں (God-kings) کا رواج تھا۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ اپنے آپ کو دیوتاؤں کی اولاد کہہ کر اپنے لیے حق حکومت ثابت کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کا ارضی ظہور بتا کر لوگوں کو یہ یقین دلاتے تھے کہ انھیں لوگوں کے اوپر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔

اس بنا پر جب خالص توحید کی دعوت اٹھتی تو ان کو محسوس ہوتا کہ وہ ان کے فلسفۂ حکومت کو غلط ثابت کر رہی ہے۔ دعوت توحید کی کامیابی میں انھیں اپنے نظریہ حکومت کی موت نظر آتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ جو عالمی غلبہ حاصل ہوا اس نے شرک اور سیاست کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ اب شرک محض ایک شخصی عقیدہ کی حیثیت سے باقی رہا۔ سیاست اور حکومت کے ساتھ اس کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ شرک اور سیاست کی یہ جدائی تکمیل دین کا ایک اہم پہلو ہے۔ اس کی وجہ سے بعد کے دور میں یہ ممکن ہو گیا کہ توحید کی دعوت اس طرح دی جا سکے کہ شرک کی طرف سے کسی جارحانہ رکاوٹ کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

مشرکانہ سیاست ختم ہو کر جو دوسری سیاست آئی وہ عوامی سیاست تھی۔ پہلے حق حکومت شرک سے اخذ کیا جاتا تھا۔ اب حق حکومت عوامی رائے سے اخذ کیا جانے لگا۔ اس تبدیلی نے اپنے لازمی نتیجہ کے طور پر دنیا سے شمشیر کے دور کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ شمشیر دراصل شخصی اقتدار کی پیداوار تھی۔ جب عوامی اقتدار آیا تو شمشیر نے منطقی طور پر اپنی اہمیت کھو دی۔ اس طرح تاریخ نظریاتی مقابلہ کے دور میں پہنچ گئی۔ اور نظریاتی مقابلہ کے میدان میں برتری ابدی طور پر صرف اسلام کا حصہ ہے۔ اب غلبہ صرف اسلام کے لیے مقدر ہے، دوسروں کے لیے مغلوبیت پر راضی ہونے کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔

دور قدیم میں اسلام کے علم بر داروں نے اسلام کو شرک کے اوپر غالب کیا تھا۔ آج دوبارہ وہ وقت آگیا ہے کہ اسلام کو الحاد کے اوپر غالب اور سر بلند کیا جائے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اسلام کے حاملین اٹھیں اور اپنے حصہ کا کام کر کے اس تاریخی امکان کو واقعہ بنا دیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی ۶۱۰ء میں اتری۔ اس کے بعد آپ نے عرب میں اسلام (دین توحید) کی دعوت کا کام شروع کیا۔ اگر آپ چودہ سو سال پیچھے چلے جائیں، اور ابتدائی وقت کے لحاظ سے دیکھیں تو حالات اتنے ناموافق اور اتنے تاریک نظر آئیں گے کہ بظاہر ایسا محسوس ہوگا کہ عرب میں یا بقیہ دنیا میں اسلام کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ لیکن اگر امکان کے اعتبار سے دیکھئے تو آپ پائیں گے کہ عین اسی وقت ایک شاندار مستقبل اسلامی قافلہ کا انتظار کر رہا ہے۔

ایسی ہی کچھ صورت حال موجودہ زمانہ میں بھی ہے۔ جو لوگ چیزوں کو صرف ظاہر حالات (Face value) کے اعتبار سے دیکھنے کے عادی ہیں، انھیں ہر طرف صرف مشکلات کے تاریک بادل چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان تاریک بادلوں کے پیچھے ایک روشن سورج چھپا ہوا موجود ہے۔

اسلام (توحید کی دعوت) آج جس عظیم امکان کے کنارے پہنچ چکی ہے، وہ اتنا قریب ہے کہ اس کی کرنیں پھوٹ کر ظاہر ہو رہی ہیں، اور اس کی جھلک صاف طور پر دکھائی دینے لگی ہے۔ مگر اسلام کے حق میں یہ سارا امکان دعوت کے اعتبار سے پیدا ہوا ہے، نہ کہ ان غیر دعوتی مقامات پر جہاں موجودہ زمانہ کے مسلمان انتہائی بے فائدہ طور پر اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں تمام قوموں میں مذہب کی طرف واپسی کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ یہ ایک عالمی ظاہرہ ہے۔ مذہبی لٹریچر آج سب سے زیادہ فروخت ہو رہا ہے۔ عبادت خانے جو خالی ہو گئے تھے، ساری دنیا میں دوبارہ بھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

تاہم دوسرے مذاہب محرف مذاہب ہیں۔ تحریف کی بنا پر ان مذاہب میں اور انسانی فطرت میں مطابقت باقی نہیں رہی ہے۔ ان حالات میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ لوگوں کی مذہب کی طرف واپسی حقیقۃً اسلام کی طرف واپسی ہے۔ کیوں کہ صرف اسلام ہی غیر محرف مذہب ہے اور اس بنا پر وہی واحد مذہب ہے جو حقیقی معنوں میں انسان کی طلب کا جواب بن سکتا ہے۔

شاہ کلید

مانٹگومری واٹ (W. Montgomery Watt) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے : اسلام کی عظمتِ رفتہ (The Majesty that was Islam) یہ کتاب اگرچہ اسلام کی تعریف پر ہے۔ مگر اس کا نام بہت زیادہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ کتاب کے اس نام کو دیکھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ اسلام اپنی ساری عظمتوں کے باوجود ماضی کی چیز تھا، وہ مستقبل کی چیز نہیں۔ کتاب کا یہ نام ماضی کے بارہ میں فخر اور مستقبل کے بارہ میں مایوسی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

مصنف نے کتاب کے پانچویں باب میں فلکیات کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ فلکیات کا فن عربوں کے لیے ایک عملی سائنس تھی۔ کیوں کہ ان کے لیے اپنے مذہب کی رو سے یہ ضروری تھا کہ وہ ہر اسلامی شہر سے مکہ کے رخ کو جانیں۔ تاکہ نمازوں کے وقت اپنے چہرہ کا رخ اس کی طرف کرسکیں :

> Astronomy was a practical science for the Arabs... because they had to know the direction of Mecca from every Islamic city, in order to face in this direction in their prayers (p. 228).

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے عبادتی اعمال غیر متعلق رسوم نہیں ہیں، بلکہ ان کا رشتہ دوسرے انسانی علوم سے براہ راست طور پر جڑا ہوا ہے ـــــ نماز کا تعلق سمتوں کے علم سے ہے۔ اسی طرح روزہ کا تعلق کیلنڈر سے۔ زکوٰۃ کا تعلق علم الحساب سے۔ حج کا تعلق علم جغرافیہ سے، وغیرہ۔

مسلمانوں کے درمیان اسلام اگر حقیقی شکل میں زندہ ہو تو اسی کے ساتھ دوسری تمام چیزیں بھی ان کے درمیان زندہ ہو جائیں گی۔ اسلام کا قیام اپنے آپ دوسری چیزوں کے قیام کا ذریعہ بن جائے گا۔ اسلامی تاریخ کے دور اول میں ایسا ہی پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اسلام اپنی حقیقی صورت میں زندہ نہیں۔ اس لیے دوسری چیزیں بھی ان کے درمیان زندہ نظر نہیں آتیں ـــــ اسلام شاہ کلید (Master Key) ہے، دینی امور کے لیے بھی، اور اسی کے ساتھ ہر قسم کے دنیوی امور کے لیے بھی۔

اسلام اپنی ذات میں ایک تسخیری طاقت ہے۔ اور تاریخ اس کی تسخیری طاقت کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کا اعتراف کثرت سے غیر مسلم محققین نے کیا ہے۔
ٹائمس آف انڈیا (دہلی اڈیشن) ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۰، صفحہ ۲ کے پہلے کالم میں ذاتی (personal) کے عنوان کے تحت یہ اعلان درج ہے کہ ـــــ میں، اشوک مدن، عمر ۳۰ سال، ولد شری اے ایل مدن، ساکن جی ۱۲/۲، مالویہ نگر، نئی دہلی، نے اپنے آزادانہ اختیار سے اسلام قبول کر لیا ہے اور اب سے میرا نام اختر مدن ہوگا:

I. Ashok Madan, aged 30, son of Shri A.L. Madan, resident of G-12/2, Malviya Nagar, New Delhi, have embraced Islam on my own free choice and will henceforth be known as Akhtar Madan. (C-59254)

یہ کوئی اتفاقی یا استثنائی خبر نہیں۔ اس طرح کے واقعات اس ملک میں اور ساری دنیا میں ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کہ زمین پر چلنے پھرنے والی کچھ روحیں اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام کے دائرہ میں داخل نہ ہو جائیں۔
یہ جو ہو رہا ہے، کیا وہ مسلمانوں کی کسی تبلیغی کوشش کے نتیجہ میں ہو رہا ہے۔ ہرگز نہیں۔ آج مسلمان ساری دنیا میں ایک ارب کی تعداد میں آباد ہیں۔ ان کے درمیان اسلام کے نام پر بے شمار بڑی بڑی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر واحد سرگرمی جس سے خدا کی زمین تقریباً خالی ہے، وہ دعوت و تبلیغ کی سرگرمی ہے۔ خدا کے بندوں تک خدا کا دین پہنچانے کا کام واحد کام ہے جس کو کرنے والا آج زمین کی پیٹھ پر کوئی نہیں۔
اس کے باوجود اسلام کیوں پھیل رہا ہے۔ جواب یہ ہے کہ خود اپنی طاقت کے ذریعہ۔ خدا اور مذہب کا جذبہ انسان کی فطرت میں پیوست ہے۔ وہ اپنے فطری جذبہ کے تحت خدائی مذہب کی تلاش میں نکلتا ہے۔ مگر چونکہ دوسرے مذاہب انسانی آمیزش کے نتیجہ میں بگڑ چکے ہیں، اس لیے ان متلاشیوں کی تسکین دوسرے مذاہب میں نہیں ہوتی۔ اس کے بعد جب وہ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہی وہ چیز ہے جس کو ان کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔ اسلام کا غیر محرّف ہونا اور اس کا تاریخی طور پر ثابت شدہ مذہب ہونا، وہ خصوصیت ہے جس نے اسلام کے اندر یہ طاقت پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنے آپ پھیلتا رہے، خواہ کسی نے اس کی تبلیغ کی کوشش کی ہو یا نہ کی ہو۔

مطلوبِ فطرت

ایک فارسی شاعر کا شعر ہے کہ صحرا کے تمام ہرن اپنا سر اپنے ہاتھ پر لیے پھرتے ہیں کہ تم کسی دن آؤ اور ان کا شکار کرو :

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف — بامید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

شاعر نے یہ شعر جس معنی میں بھی کہا ہو ، مگر ایک معنی میں وہ نہایت صحیح ہے ۔ اور وہ انسان کی فطری طلب ہے ۔ ہر انسان کے اندر فطری طور پر یہ طلب موجود ہے کہ وہ اپنے خالق کو پائے اور اس کا پرستار بن جائے ۔ یہ طلب ہر آدمی کے اندر اس طرح پیوست ہے کہ وہ اس کو نکال نہیں سکتا ۔

تمام مذاہب جن کو سچے پیغمبروں نے پیش کیا ، وہ اسی مطلوب خدا کا تعارف تھے ۔ مگر پچھلے مذاہب میں تبدیلی اور آمیزش کی وجہ سے ان کا خالص پن باقی نہ رہا ۔ اب صرف اسلام ہے جس میں خدا کا صحیح اور بے آمیز تعارف موجود ہے ۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آج تمام دنیا کے انسان اسلام کی تلاش میں ہیں ۔

انسان کے اندر خدا کی پیدائشی طلب ہے ، اور اسلام وہ واحد مذہب ہے جس میں خدا کا تعارف اور اس کی مرضی کسی ملاوٹ کے بغیر موجود ہے ۔ ان دونوں باتوں کو ملائیے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ اسلام کے پاس سب سے قیمتی چیز اسلام ہے ۔

اسلام گویا فاتحِ عالم ہے ۔ اسلام فاتحِ انسانیت ہے ۔ اسلام کی صورت میں اہلِ اسلام کے پاس ایک ایسی چیز موجود ہے جو عصاءِ موسیٰ سے بھی زیادہ طاقت ور ہے ۔ وہ اس کے ذریعہ ہر آدمی کے دل کو مسخر کر سکتے ہیں ۔ خواہ وہ کسی بھی ملک کا رہنے والا ہو ، اور خواہ وہ کوئی بھی زبان بولتا ہو ۔

اس دنیا میں ہر انسان آہوئے فطرت ہے ۔ ہر انسان اس سچائی کی تلاش میں ہے جس کے بغیر اس کی شخصیت ناتمام ہے ۔ اسلام اسی ابدی سچائی کا مستند ترین اڈیشن ہے ۔ اس اعتبار سے ہر انسان گویا اس انتظار میں ہے کہ اسلام کے حاملین آئیں اور اس کے سامنے خدا کے سچے دین کو پیش کریں ، اور اس کی روح اس کو عین اپنا مطلوب سمجھ کر اسے اختیار کرلے ۔

زید بن عمرو بن نُفیل بن عبد العزیٰ (م ۶۰۶ء) قدیم مکہ کے ایک باشندہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سال پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ عہدِ جاہلیت کے ان افراد میں سے تھے جن کو حنیف کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کو متلاشیٔ حق کہا جاسکتا ہے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے :

اَرَبًّا وَاحِداً اَمْ اَلْفَ رَبٍّ   اَدِیْنُ اِذَا تُقُسِّمَتِ الْاُمُوْرُ

میں ایک رب کی یا ہزار رب کی عبادت کروں، جیساکہ انھیں بانٹ دیا گیا ہے

وہ اپنے آبائی مذہب سے غیر مطمئن تھے۔ حق کی تلاش میں وہ عرب کے باہر شام وغیرہ کے علاقوں میں گھومتے رہے۔ مگر انھیں حق نہیں ملا۔ وہ یہ کہتے ہوئے مرگیے کہ اے اللہ، اگر میں جانتا کہ تیرا سب سے پسندیدہ طریقہ کیا ہے تو میں اسی طرح تیری عبادت کرتا مگر میں اس کو نہیں جانتا، پھر وہ اپنی سواری ہی پر سجدہ کر لیتے (اللّٰھم انی لو اعلم احبّ الوجوہ الیک عبدتک بہ ولکنی لا اعلم ثمّ یسجد علی رحلتہ) البدایۃ والنہایۃ ۲/۲۳۷

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو بتاتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے شروع تک دنیا کی حالت کیا تھی۔ اس وقت پوری انسانیت حق سے محروم تھی۔ ہر ایک سچائی سے محرومی کا احساس اپنے اندر لیے ہوئے تھا۔ جن لوگوں کی طلب زیادہ شدید تھی، وہ زید بن عمرو کی مانند بے چین تھے۔ اور جن لوگوں کی طلب اتنی شدت کے ساتھ نہیں ابھری تھی وہ زبانِ حال سے دینِ حق کے طالب بنے ہوئے تھے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کے ایک بہترین شخص محمد بن عبد اللہ کو چُنا اور ان کو اپنا پیغمبر مقرر کیا تاکہ وہ عرب کو اور تمام اہلِ عالم کو امرِ حق سے آگاہ کریں۔ فرشتہ کے ذریعہ خدا کا کلام آپ پر اتارا گیا اور آپ نے اس کی تبلیغ و اشاعت کے کام میں ہمہ تن اپنے آپ کو وقف کردیا۔

آج دوبارہ انسان قدیم حنفا کی طرح ہی آواز دے رہا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس کام کے لیے اٹھیں، جو انسان کی اس پکار کا جواب فراہم کریں۔ انسانیت آج سب سے زیادہ ایسے ہی لوگوں کے انتظار میں ہے۔

صداقت اسلام

مشہور مغربی مورخ فرینکلن بامر (Franklin Baumer) نے موجودہ دور کو پریشانیوں کا دور (Age of anxiety) قرار دیا ہے۔ سائنس کے ظہور کے بعد انیسویں صدی میں یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ بہتر زندگی اور اچھے معاشرہ کی تعمیر کے لیے سائنس کافی ہے۔ سائنس کے ذریعہ انسان کو مادی ترقی بھی حاصل ہوگی اور اسی کے ذریعہ اخلاقی اور روحانی ترقی بھی۔ مگر سو سال کے تجربہ کے بعد شدید ناکامی ہوئی۔ سائنس نے مادہ کو مشین میں تبدیل کیا، مگر وہ برے انسان کو اچھا انسان نہ بنا سکی۔ مثال کے طور پر سائنس نے انسان کو جو نئی طاقت دی، اس کا استعمال انسان نے دو عالمی جنگوں کی صورت میں کیا جس نے انسانی دنیا میں ایسی تباہی برپا کی جس کی مثال ساری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

چنانچہ بیسویں صدی میں عام طور پر اس کا اعتراف کر لیا گیا کہ سائنس انسانی معاشرہ کی تعمیر و ترقی کے لیے کافی نہیں۔ آئن سٹائن نے کہا کہ سائنس پلوٹونیم کی فطرت کو بدل سکتی ہے، مگر سائنس انسان کے دل کی برائی کو دور نہیں کر سکتی :

Science can denature plutonium but it cannot
denature the evil in the heart of man.

کچھ اور لوگوں نے براہ راست اور متعین صورت میں مذہب کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ کارل ینگ نے جدید معاشرہ کے ہزاروں لوگوں کا تجربہ کرنے کے بعد کہا کہ ہم جو کچھ بھگت رہے ہیں اس لیے بھگت رہے ہیں کہ ہم خدا سے دور ہو گئے ہیں :

We continue to suffer because we are
alienated from God.

موجودہ زمانہ میں جو نئی چیزیں ظہور میں آئی ہیں ان میں سے ایک ذرائع ہیں، اور دوسرے نظریات۔ یہ ذرائع اپنی ابتدائی صورت میں انسانیت کے لیے بے حد مفید تھے۔ مگر جدید نظریات نے انسانوں میں جو ذہن اور مزاج پیدا کیا وہ صحیح نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفید چیزیں بھی عملاً تباہی کا سبب بن گئیں۔ آج دنیا کو ایسے نظریہ کی ضرورت ہے جو انسان کے اندر صالح مزاج کی تخلیق کر سکے۔

اسلام کی صداقت کا ایک ناقابل انکار ثبوت یہ بھی ہے کہ اسلامی انقلاب سے جو نظامات وجود میں آئے، وہ ہمیشہ انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوئے۔ اور غیر اسلامی انقلاب سے جو نظامات وجود میں آئے، وہ ہمیشہ انسانیت کے لیے مضر ثابت ہوئے۔

مثلاً جدید آزاد دنیا میں سائنس، جمہوریت، شہری آزادی وہ چیزیں ہیں جو اسلامی انقلاب کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ چیزیں انسانیت کے لیے خیر ثابت ہوئیں۔ اگرچہ غلط استعمال کی بنا پر ان سے انسانیت کو بعض نقصانات بھی پہنچے۔ مگر اصولی اعتبار سے یہ چیزیں سراپا خیر تھیں۔

اس کے برعکس نیشنلزم، کمیونزم، نازی ازم وغیرہ وہ نظامات ہیں جو غیر اسلامی فکر اور غیر اسلامی انقلاب کے نتیجہ میں ظہور میں آئے۔ یہ چیزیں انسانیت کے لیے سراپا شر ثابت ہوئیں۔ ان کا معاملہ یہ ہے کہ ان کو جتنا زیادہ کامل صورت میں نافذ کیا جائے اتنا ہی زیادہ ان کا نقصان بڑھتا چلا جائے گا۔ ان کے نقصان میں اگر کچھ کمی ہوگی تو صرف اس وقت جب کہ انھیں ناقص صورت میں نافذ کیا گیا ہو۔

آپ پھل دار درخت بوئیں تو اس سے ہمیشہ پھل ہی ملے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ کانٹے دار درخت بوئیں تو اس سے ہمیشہ کانٹے نکلیں گے۔ یہی اسلام اور غیر اسلام کا معاملہ ہے۔ اسلام کا جزء یا کُل جب بھی زندگی میں رائج کیا جائے گا، وہ زندگی میں تعمیری نتیجے پیدا کرے گا۔ اور غیر اسلام کو جب بھی رائج کیا جائے گا، وہ زندگی میں اپنے تخریبی نتیجے دکھائے گا، خواہ اس کو جزئی طور پر رائج کیا گیا ہو یا کلی طور پر۔

موجودہ زمانہ میں انسان نے فطرت کے مطالعہ سے جو چیزیں دریافت کیں اور جو صنعتی تمدن بنایا وہ قدرت کی نشانیاں تھیں۔ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ان کی حیثیت خدا کی نعمت کی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں انسان کی ذہنی تشکیل کے لیے جو نظریات ظہور میں آئے وہ انسان کے اپنے دماغ کی پیداوار تھے۔ اس طرح جدید دور ایک تضاد میں مبتلا ہو گیا۔ ذرائع کے اعتبار سے اس کے پاس خدائی ذرائع تھے۔ مگر انسان کے اعتبار سے غیر خدائی انسان۔

اسلام اس تضاد کو ختم کرنے والا ہے۔ اسلام خدا کی طرف سے آیا ہوا دین ہے۔ انسان کو اسلامی فکر پر لے آنا گویا اس کو خدائی انسان بنانا ہے۔ اسلام کے پھیلنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ذرائع خدائی ہیں اسی طرح انسان بھی خدائی ہو جائیں۔ اس تضاد کو ختم کرنے ہی میں انسانی فلاح کا راز چھپا ہوا ہے۔

تاریخی تائید

چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جب اسلام کا ظہور ہوا، اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت عیسائیوں کی سلطنت تھی۔ اس سلطنت کے دو بڑے حصے تھے۔ ایک مغربی حصہ اور دوسرا مشرقی حصہ۔ مغربی حصہ (یورپ) کو رومن ایمپائر کہا جاتا تھا اور اس کا پایہ تخت روم (اٹلی) تھا۔ مشرقی حصہ (ایشیا اور افریقہ) کو بازنطینی ایمپائر کہا جاتا تھا اور اس کا پایہ تخت قسطنطنیہ (ترکی) تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں شام کی سرحد پر رومیوں سے مسلمانوں کا فوجی ٹکراؤ شروع ہوا۔ اس ٹکراؤ میں مسلمان کامیاب رہے۔ ایک صدی کے اندر اندر انھوں نے مسیحی سلطنت کے مشرقی حصہ کو تقریباً پورا کا پورا فتح کر لیا جس میں ان کے مقدس مذہبی مقامات (شام فلسطین) بھی شامل تھے۔

اس کے بعد مسلمانوں نے ایک طرف سسلی اور اسپین کی جانب سے پیش قدمی شروع کی اور بڑھتے بڑھتے فرانس کے اندر داخل ہو گئے۔ دوسری طرف وہ ترکی کی جانب سے مشرقی یورپ میں داخل ہوئے اور آگے بڑھتے ہوئے ویانا (آسٹریا) تک جا پہنچے۔ اس طرح انھوں نے مسیحی (رومی) سلطنت کے مشرقی بازو پر تقریباً پورا کا پورا قبضہ کر لیا۔ اور اسی کے ساتھ اس کے مغربی بازو کے بھی ایک حصہ کو کاٹ لیا۔

مشہور صلیبی لڑائیاں مغربی عیسائیوں کی طرف سے ان کی اسی شکست کا ردعمل تھیں۔ عیسائی دنیا ایک غیر قوم کے ہاتھ سے اپنی اس ذلت اور شکست کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ یورپ کی مسیحی سلطنتوں نے متحد ہو کر مسلم دنیا پر حملہ کر دیا۔

یہ صلیبی لڑائیاں (crusades) وقفہ وقفہ سے تقریباً دو سو سال (۱۲۷۱-۱۰۹۵ء) تک جاری رہیں۔ اس درمیان میں عیسائیوں کو وقتی اور جزئی کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ مگر سلطان صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں بالآخر مسلمانوں نے فتح پائی۔ اور مسیحیوں کو ان کی سابقہ دنیا سے باہر نکال دیا گیا۔ پیرس سائیکلوپیڈیا (Pears Cyclopaedia) نے اس سلسلے میں بہت بامعنی تبصرہ کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

Millions of lives and an enormous amount of treasure were sacrificed on these enterprises, and when all was done Jerusalem remained in the possession of the "infidels"

لاکھوں جانیں اور بے شمار دولت ان مہموں میں قربان کر دی گئی۔ اور جب سب کچھ ہو چکا تو یروشلم بدستور "بددینوں" کے قبضہ میں پڑا ہوا تھا۔

مسٹر ولفریڈ بلنٹ (Wilfred Blunt) نے اپنے ایک مقالہ (ٹائم لندن، ۲ اپریل ۱۹۷۶ء) میں اسلام کا ذکر کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں :

There is, perhaps, nothing more amazing in the whole long history of mankind than the extent and rapidity of the dissemination of Islam.

شاید پوری انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ تعجب خیز واقعہ اور کوئی نہیں ہے جتنا کہ انتہائی وسعت اور تیز رفتاری کے ساتھ اسلام کا پھیلنا۔

دین اسلام کو جو قوت اور وسعت حاصل ہوئی، اسی کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ اسلام کی حفاظت اس عالم اسباب میں ممکن ہو جائے۔ اس سے پہلے جو آسمانی مذاہب آئے وہ سب ضائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان پیغمبروں کو ماننے والے تھوڑے تھے۔ ان کے مخالفین تعداد میں بھی زیادہ تھے اور ہر قسم کی قوت و طاقت پر بھی انھیں کا قبضہ تھا۔ ان مخالفین نے سابق مذاہب کو ان کی اصل صورت میں باقی رہنے نہیں دیا۔ انھوں نے ان کتابوں میں اپنی منشا کے مطابق تحریف کر دی۔ اسلام کی پشت پر جو طاقت ور حکومت قائم ہوئی وہ اس بات کی ضمانت بن گئی کہ کوئی اس کو ضائع نہ کر سکے۔ کوئی اس میں انسانی کلام کی آمیزش نہ کر سکے۔

اسلام کے ساتھ طاقت کو جمع کرنے اور اس کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دینے سے اور بہت سے فائدے حاصل ہوئے۔ اس کی وجہ سے وہ تمام خطرات اور اندیشے ختم ہو گئے جو دشمنوں کی طرف سے دین خداوندی کو پیش آتے تھے۔ قرآن کے بعد کے زمانہ میں توحید پرستوں کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اگر وہ خدا کے فرماں بردار بنے رہیں تو یہ فرماں برداری بذات خود ان کی کامل حفاظت کی ضمانت بن جائے گی۔ کسی دشمن سے انھیں کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔

دنیا اسلام کی تلاش میں

ایف ایچ بریڈلے (F.H. Bradley) ۱۸۴۶ میں لندن میں پیدا ہوا، اور ۱۹۲۴ میں آکسفورڈ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ دورِ جدید کے ممتاز فلسفیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بریڈلے نے اپنی کتاب (Essays on Truth and Reality) میں لکھا ہے کہ آج دنیا کو ایک نیا مذہب (New religion) درکار ہے۔ وہ مذہب جو ہمیں ایسا عقیدہ عطا کرے جو تمام انسانی مفادات کا تعین کرنے والا ہو۔ اور ضروری تناسب کے ساتھ اس کے جواز کی بنیاد ہو۔ اسی کے ساتھ وہ ایسا شعور دے جس سے انسان اس پر پورا اعتماد کر سکے (صفحہ ۴۴۶)

اسی کے ساتھ بریڈلے نے موجودہ مذاہب پر اپنا عدم اطمینان ظاہر کیا۔ اس نے یہ اعلان کیا کہ مذہب کوئی آخری چیز نہیں :

Religion is not a final and ultimate matter. (II/220)

اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ "مذہب" سے بریڈلے کی مراد مروّجہ مذاہب ہیں، تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ باعتبار حقیقت "نئے مذہب" سے اس کی کیا مراد ہے۔ باعتبار حقیقت اس سے مراد غیر محرف مذہب ہے۔ مذہب کے نام سے وہ صرف رائج الوقت مذہبوں کو جانتا ہے، اگر وہ مذہب کا تحریف اور آمیزش سے پاک اڈیشن دیکھ لیتا تو "نئے مذہب" کے بجائے وہ غیر محرف مذہب کا لفظ استعمال کرتا۔

موجودہ زمانہ کے انسان کا مطالعہ کیجئے تو وہ عجیب تضاد میں مبتلا نظر آئے گا۔ ایک طرف وہ مذہب کی ضرورت کا اقرار کرے گا۔ اسی کے ساتھ وہ موجودہ مذاہب سے اپنی بے اعتمادی ظاہر کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نفسیاتی اعتبار سے مذہب جیسی ایک چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ مگر جب وہ موجودہ مذاہب کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو اس کی نفسیاتی طلب کا جواب نظر نہیں آتے۔

اس پیچیدگی کا سبب مذاہب کی تحریف ہے۔ آج کے انسان کو محرف مذاہب اپنے نفسیاتی تقاضے کے مطابق نظر نہیں آتے، لیکن اگر اس کے سامنے مذہب کا غیر محرف نسخہ رکھ دیا جائے

تو وہ اس کو عین اپنی نفسیاتی طلب کے مطابق پائے گا اور فوراً اس کو قبول کرے گا۔

مغربی دنیا میں، اور مجموعی طور پر ساری دنیا میں "مذہب کی طرف واپسی" کا جو رجحان پیدا ہوا ہے، وہ حقیقتہً "اسلام کی طرف واپسی" کا رجحان ہے۔ کیونکہ اب مذہب کی نمائندگی کے لیے صحیح اور مستند نسخہ صرف وہی ہے جو اسلام کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اسلام کے سوا جو دوسرے مذاہب ہیں، وہ سب کے سب محرّف ہو چکے ہیں۔ بالفاظ دیگر، خالص تاریخی اعتبار سے وہ معتبر نہیں ہیں۔ اب تلاش مذہب کا صرف ایک ہی جواب باقی رہ گیا ہے، اور وہ بلاشبہہ صرف اسلام ہے۔

لوگوں کی تلاش مذہب، حقیقت کے اعتبار سے تلاش اسلام ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے یہاں میں ایک مثال دوں گا۔ ڈاکٹر لنشی کانت چٹوپادھیا بنگال کی ایک ہندو فیملی میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھے اور بیک وقت کئی زبانیں جانتے تھے۔ پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد ان کے اندر تلاش حق کا جذبہ ابھرا۔ اب انھوں نے مطالعہ شروع کر دیا۔

سب سے پہلے انھوں نے فلسفہ پڑھا۔ مگر انھوں نے محسوس کیا کہ فلسفہ صرف سوال تک پہنچاتا ہے، وہ جواب کے بارے میں ہماری رہنمائی نہیں کرتا۔ اس کے بعد انھوں نے مذاہب کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے ہندو مذہب اور اس کی مختلف شاخوں کو پڑھا، مگر وہ انھیں مطمئن نہ کر سکا۔ کیونکہ انھوں نے پایا کہ ہندو مذہب سارا کا سارا مائتھالوجی پر قائم ہے۔ ایسے کسی مذہب کی صداقت پر عقلی اعتبار سے یقین کرنا ممکن نہیں۔

اس کے بعد انھوں نے مسیحیت اور یہودیت وغیرہ مذاہب کا مطالعہ کیا مگر یہاں بھی ان کو اطمینان نہیں ملا۔ کیونکہ یہ تمام مذاہب انھیں تاریخ کے معیار پر پورے اترتے نظر نہیں آئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جو چیز تاریخی طور پر ثابت شدہ نہ ہو اس کے حقیقی ہونے پر وہ کیونکر یقین کر سکتے ہیں۔

آخر میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے پایا کہ یہاں ہر چیز ثابت شدہ ہے یہاں ہر بات تاریخ کے معیار پر پوری اتر رہی ہے، اسلام کا پیغمبر مکمل معنوں میں ایک تاریخی شخصیت ہے نہ کہ محض افسانوی یا اعتقادی شخصیت، یہ دیکھ کر وہ بے اختیار پکار اٹھے۔ اف، کیسا عجیب ہے یہ پانا کہ آدمی تلاش کرتے کرتے آخر کار ایک سچے تاریخی پیغمبر کو پا لے جس پر وہ یقین کر سکے:

Oh! what a relief to find, after all, a truly historical prophet to believe in.

نظریاتی برتری

اسلام دین رحمت ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں رحمۃ للعالمین (انبیاء ۱۰۷)
کہا گیا ہے۔ یعنی سارے عالم کے لیے رحمت۔ اس کے باوجود آپ کی معاصر قوم سے آپ کی لڑائیاں پیش
آئیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ رحمت اور سلامتی تھے تو آپ نے دوسروں سے جنگ
کیوں کی۔ کیوں نہ ایسا ہوا کہ آپ کا مشن رحمت اور امن سے شروع ہوتا اور رحمت اور امن ہی پر وہ
تمام ہو جاتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی لڑائیاں حقیقۃً زمانہ کے خانہ میں جاتی ہیں نہ کہ خود آپ کے خانہ
میں۔ آپ جس زمانہ میں آئے اس وقت دنیا میں بادشاہت کا زمانہ تھا۔ اس وقت ڈیموکریسی اور
آزادی کا کوئی تصور نہ تھا۔ مطلق العنان بادشاہ یا سردار ہر جگہ راج کر رہے تھے۔ یہی زمانی حالت
جنگ کا سبب بن گئی۔ اگر اس وقت آج کی طرح ڈیموکریسی موجود ہوتی تو شاید سرے سے جنگ
کی نوبت ہی نہ آتی۔

اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ مثال امریکہ کی تحریک آزادی اور انڈیا کی تحریک آزادی
کے تقابل سے سامنے آتی ہے۔

امریکہ میں انیسویں صدی کے آغاز میں آزادی کی جنگ ہوئی۔ امریکہ کے ساحلی مقامات پر انگریزوں
کا قبضہ تھا۔ امریکی لوگ ان کو اپنے ملک سے نکال دینا چاہتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں فریقوں کے
درمیان خونیں لڑائیاں ہوئیں۔ کثیر تعداد میں جانی نقصان کے بعد امریکہ کو انگریزوں سے آزادی
نصیب ہوئی۔

انھیں انگریزوں کے خلاف انڈیا نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں آزادی کی تحریک چلائی۔ یہ پوری
تحریک عدم تشدد کے اصول پر چلائی گئی۔ تحریک کامیاب رہی۔ معروف اسلحہ کے استعمال کے بغیر
انڈیا آزاد ہو گیا۔

اس فرق کا سبب حقیقۃً امریکی لیڈروں کی تشدد پسندی یا مہاتما گاندھی کی امن پسندی نہیں۔ بلکہ
زمانہ کا فرق ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں میں آزادی اور ڈیموکریسی کے نظریات ابھی بہت زیادہ عام

نہیں ہوئے تھے۔ وہ ابھی مستحکم اور تسلیم شدہ نظریات نہیں بنے تھے۔ اس وقت ابھی قدیم بادشاہی دور کی روایات باقی تھیں۔ اس بنا پر قتال کی نوبت آگئی۔

اس وقت امریکہ میں اگر کوئی گاندھی جیسا اہنساوادی لیڈر پیدا ہوتا تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اہنسا کی بنیاد پر تحریک چلاکر کامیاب ہونے کے لیے زمانہ کی مساعدت کی ضرورت ہے۔ اور اس قسم کی زمانی مساعدت اس وقت تک کسی کو حاصل نہ تھی۔

مگر بیسویں صدی کے نصف اول میں جب گاندھی اٹھے تو آزادی اور ڈیموکریسی کے نظریات مسلّم سیاسی نظریات بن چکے تھے۔ چنانچہ انھیں زمانہ کی کامل مساعدت حاصل ہوئی اور وہ عدم تشدد کی بنیاد پر تحریک چلاکر برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے ارشادات میں خود بھی اس کے اشارے موجود ہیں کہ اسلام کی ابدی تحریک کو دو مختلف دوروں سے سابقہ پیش آئے گا۔

دور اوّل کا اشارہ قرآن میں اس طرح موجود ہے کہ اس میں ظالموں سے دفاعی جنگ لڑنے کی ہدایت کی گئی ہے (اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا) چنانچہ اس ہدایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے جارح اور ظالم عناصر سے دفاعی جنگ کی۔

دوسرے دور کا اشارہ ہم کو حدیث میں ملتا ہے۔ صحیح مسلم (کتاب الفتن واشراط الساعة) میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعد کے زمانہ میں اہلِ ایمان کی ایک تعداد غزوہ کرے گی۔ مگر وہ نہ ہتھیار سے لڑیں گے اور نہ تیر ماریں گے۔ وہ صرف لا الٰہ الا اللہ کہیں گے اور قلعہ کی دیواریں گر جائیں گی (فلم يُقاتِلوا بسلاح ولم يَرمُوا بسَهم، قالوا لا الٰه الا الله والله اكبر فيسقط احدُ جانبيها۔ ثم يقولون الثانيةُ لا الٰه الا الله والله اكبر فيسقط جانبها الآخر۔ ثم يقولون الثالثة لا الٰه الا الله والله اكبر فَيُفرَجُ لهم فيدخلونها فيغنمون)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دور آخر میں عالمی حالات میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہوں گی کہ افکار ونظریات اسلحہ کے قائم مقام بن جائیں گے۔ اس فکری دور میں اہل اسلام کے لیے ممکن ہو جائے گا کہ وہ اسلام کی فکری طاقت اور اس کی نظریاتی برتری کو لے کر اٹھیں اور محض اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں پر کامیابی حاصل کر لیں۔

دین فطرت

کراچی سے ایک انگریزی ہفت روزہ یقین انٹرنیشنل کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ ۲۲ اگست ۱۹۹۱ کے ایک مضمون کا عنوان ہے : میں نے کیوں اسلام قبول کیا (Why did I embrace Islam?)

یہ ایک نومسلم مسٹر چیمپین (Darly Champion) کی کہانی ہے۔ وہ ساوتھ آسٹریلیا کے شہر ایڈیلیڈ (Adelaide) میں ایک مسیحی خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ان کے اندر تلاش حق کا جذبہ تھا۔ ۱۲ سال کی عمر میں اسکول پارٹی کے ساتھ ایک بار وہ ایک مقامی مسجد میں گئے۔ یہ مسجد سو سال پہلے ان افغانیوں نے بنائی تھی جو ساربان (camel driver) کے طور پر یہاں لائے گئے تھے۔ اس مسجد کی سادگی کو دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئے اور ان کے اندر یہ شوق پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے مذہب کا مطالعہ کریں۔

بعد کو وہ میڈیا انڈسٹری میں داخل ہو گئے۔ اس سلسلہ میں انھیں سڈنی آنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں ان کی ملاقات کچھ مسلمانوں سے ہوئی۔ ان سے انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ حاصل کر کے پڑھا۔ مزید مطالعہ کے بعد وہ یکم جون ۱۹۸۴ کو سڈنی کی ایک مسجد میں گئے اور کلمہ شہادت ادا کر کے اسلام قبول کر لیا۔ آسٹریلیا میں ڈھائی لاکھ (250,000) مسلمان ہیں۔ ان میں تقریباً دو سو نومسلم ہیں۔

موصوف نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام قمر القلب رکھا ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے کیوں اسلام قبول کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ میں نے اسلام کو از سر نو دریافت کیا۔ میرے بارہ میں آپ نے جو کچھ سنا ہے وہ تبدیلیٔ مذہب کا قصہ نہیں ہے بلکہ وہ اس مذہب کو دوبارہ دریافت کرنے کا قصہ ہے جو میری فطرت میں پہلے سے موجود تھا :

I didn't embrace Islam, I re-discovered Islam in myself. What you have heard is not a tale of conversion, but a story of rediscovery of my natural self embodied in Islam.

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ ہر آدمی کا اپنا مذہب ہے۔ اسلام کو قابل قبول بنانے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ لوگوں سے معتدل تعلقات قائم کیے جائیں اور اسلام کے مثبت پیغام سے انھیں باخبر کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کھنچ کر اسلام کی طرف آجائیں گے۔

مسلمان اگر مغربی علوم اور مغربی ٹکنالوجی میں مہارت پیدا کریں اور اس کے ذریعہ مغربی قوموں کو دوبارہ زیر کر کے دنیا میں اپنی جگہ حاصل کرنے کی کوشش کریں تو عملاً یہ تدبیر ان کے لیے سودمند نہ ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے کئی سو سال سے مغرب اس میدان میں مسلسل ترقی کرتا رہا ہے۔ اور مسلمانوں کا حال یہ رہا ہے کہ ان صدیوں میں وہ صرف مغرب سے ناکام روایتی لڑائی لڑتے رہے ہیں۔ اس مدت میں انھوں نے جدید علوم اور ٹکنالوجی میں کوئی ترقی نہیں کی۔ اس کے نتیجہ میں دونوں قوموں کا فرق اتنا زیادہ ہو چکا ہے کہ اب تقریباً ناممکن ہو گیا ہے کہ عام حالات میں اس کو دور کیا جا سکے۔

ایلون ٹافلر نے اپنی مشہور کتاب (Future Shock) میں لکھا ہے کہ مغربی دنیا انڈسٹریل ایج سے گزر کر اب سپر انڈسٹریل ایج میں داخل ہو رہی ہے۔ مسلمان چونکہ ابھی تک انڈسٹریل ایج میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسلمان اگر اب سے اس رخ سے اپنا سفر شروع کریں تو ہزار کوشش کے بعد جب وہ انڈسٹریل ایج میں داخل ہوں گے تو دنیا سپر انڈسٹریل ایج میں داخل ہو چکی ہوگی اور وہ بدستور پیچھے کے پیچھے رہیں گے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ اپنے احیار کے لیے دوسرا راستہ تلاش کریں۔

یہ دوسرا راستہ صرف دعوت کا ہے۔ مسلمانوں کے لیے احیاء ثانی کی جدوجہد کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ خدا کے دین کے داعی بن کر اٹھیں۔ لوگ مادیات کو فتح کر رہے ہیں۔ مسلمان لوگوں کے دلوں کو فتح کریں۔ لوگ زمین پر قبضہ کر رہے ہیں۔ مسلمان لوگوں کی روح اور دماغ پر قبضہ کریں۔ یہی واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا مسلمانوں کے لیے زندگی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

اسلام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک ایسی طاقت دے دی ہے جو ہر دوسری طاقت کے اوپر ہے، جو ہر دوسری طاقت کو مسخر کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی دعوت مسلمانوں کا دینی فریضہ بھی ہے اور وہی ان کے مسئلہ کا واحد حل بھی۔

اسلام آدمی کے فطری تقاضے کا جواب ہے۔ اسلام میں زندگی کا متوازن قانون ہے۔ اسلام میں وہ صحیح ترین رہنمائی ہے جس کو اختیار کر کے انسانیت کا قافلہ اپنی منزل کی طرف کامیاب سفر کر سکے۔ اسلام کی تعلیمات ان تضادات سے پاک ہیں جو دوسرے نظاموں میں پائی جاتی ہیں۔ اسلام وہ شاہراہ فراہم کرتا ہے جس میں دنیا کی بھی فلاح ہے اور آخرت کی بھی فلاح۔

مانع جرم

ایک مفکر کا قول ہے :

It is not the severity of punishment that acts
as a deterrent. It is its inevitability.

یعنی سزا کی سختی آدمی کو جرم سے نہیں روکتی۔ یہ سزا کی ناگزیریت ہے جو مانع جرم کا کام کرتی ہے۔

یہ قول بہت با معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اس قدر سرکش ہے کہ صرف سزا کا امکان اس کے لیے اتنا طاقتور محرک نہیں کہ وہ اس کو جرم سے روک دے۔ آدمی جرم سے صرف اس وقت رُکتا ہے جب کہ اس کو یقین ہو کہ اگر اس نے جرم کیا تو وہ کسی حال میں اس کے انجام سے بچ نہیں سکے گا۔

مثال کے طور پر ایک شخص جنگل میں بے ہتھیار چلا جا رہا ہے۔ اتنے میں وہ دیکھتا ہے کہ قریب کی جھاڑی میں ایک زندہ شیر موجود ہے۔ ایسے موقع پر وہ سانس روک لے گا اور نہایت آہستگی کے ساتھ آگے بڑھ جائے گا۔ کوئی بھی بے ہتھیار آدمی جنگل کے کھلے ہوئے شیر کو نہیں چھیڑتا۔ مگر یہی انسان جب انسانی بستی میں آتا ہے تو وہ دوسرے انسانوں کو چھیڑتا ہے۔

اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو یقین ہے کہ اگر اس نے جنگل کے شیر کو چھیڑا تو اس کے بُرے انجام سے وہ بچ نہیں سکتا۔ اس کے برعکس اپنے جیسے انسان کو چھیڑنے میں یہ اندیشہ نہیں ہوتا۔ یہاں اس کو بھروسہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی تدبیر سے وہ اپنے آپ کو اس کے انجام سے بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

انسان کی یہ نفسیات بتاتی ہے کہ انسان کو جرم سے باز رکھنے کی صرف ایک ہی ممکن تدبیر ہے۔ وہ یہ کہ اس کے اندر اس حقیقت واقعہ کا یقین پیدا کیا جائے کہ اس کے اوپر ایک خدا ہے جو ہر آن اس کو دیکھ رہا ہے۔ آدمی کسی حال میں اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ انسانی قانون میں یہ ناگزیریت نہیں، اس لیے انسانی قانون پوری طرح مانع جرم نہیں بنتا۔ مگر خدائی قانون میں ناگزیریت ہے۔ اس لیے صرف اسی کے اندر یہ طاقت ہے کہ وہ آدمی کو جرم سے باز رہنے پر مجبور کر سکے۔

موجودہ زمانہ میں جرم کے موضوع پر گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ سے جو حقیقتیں سامنے آئی ہیں وہ واضح طور پر اسلام کے نظریہ کی تصدیق کرتی ہیں۔

ایک اطالوی ڈاکٹر لومبروسو (Cesare Lombroso) نے انیسویں صدی میں کچھ لوگوں کے سروں کی پیمائش کی۔ اس کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ غیر مجرم لوگوں کے مقابلہ میں مجرم لوگوں کے دماغ (Brain) جسامت میں چھوٹے ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر جو شخص مجرم ہوتا ہے وہ پیدائشی طور پر مجرم ہوتا ہے۔ مگر اب یہ نظریہ نہیں۔ آج یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ تربیت نہ کہ فطرت وہ چیز ہے جو کسی کو مجرم بناتی ہے:

Nurture, not nature, is responsible for criminal behaviour. o

حال میں امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے جرم اور فطرتِ انسانی:

Crime and Human Nature
by Prof. James Q. Wilson and Prof. Richard Herrnstein
Published by Simon and Schuster, New York

اس کتاب میں جرم اور مجرم کا مطالعہ کرتے ہوئے جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مجرم فوری مقصد کو سامنے رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے اس ذہن کی وجہ سے ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ مستقبل کے بارہ میں سوچیں یا باقاعدہ منصوبہ بنائیں:

Criminals tend to be now-oriented personalities, which make planning or even thinking about the future difficult.

جرم کی اس نفسیات پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام عین مطابقِ حقیقت نظریہ ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں جدید تہذیب کا نظریہ سراسر حقیقت کے خلاف ہے۔ اسلام آخرت رُخی ذہن بناتا ہے اور جدید تہذیب دنیا رُخی ذہن بناتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی ذہن کی ساری توجہ "تب" پر ہوتی ہے اور جدید تہذیب کی ساری توجہ "اب" پر۔ اس طرح گویا اسلامی فکر مجرمانہ نفسیات کی جڑ کو کاٹ رہا ہے، جب کہ جدید تہذیب کا مادی ذہن مجرمانہ نفسیات کی پرورش کرنے والا ہے۔

نئے دور کے کنارہ پر

امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے۔ یہ ان لوگوں کے بارہ میں ہے جو بہت زیادہ دولت مند ہیں۔ اس میں ۳۰ بڑے بڑے دولت مندوں کے مفصل انٹرویو درج کیے گیے ہیں۔ یہ وہ امریکی سرمایہ دار ہیں جن کا سرمایہ ۱۹۸۷ کے اندازہ کے مطابق ۲۵۴ ملین ڈالر تھا۔ کتاب کا نام یہ ہے :

The Ultra Rich, by Vance Packard, Little, Brown; 358 pages.

ان سرمایہ داروں کے پاس ممکن مسرفانہ خرچ سے بھی زیادہ رقم ہے۔ ان کے پاس اتنے بڑے بڑے مکانات ہیں جن کے اندر ہوائی جہازوں کے اترنے کے لیے رن وے (Runway) تک موجود ہے۔ وغیرہ (ٹائم ۱۳ فروری ۱۹۸۹)

تاہم وہ اپنی دولت سے پریشان ہیں۔ ایک دولت مند نے کہا کہ میرا مکان مجھ کو ایک وسیع قسم کا سرسبز پنجرہ (Verdant cage) معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور دولت مند نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں اس کو کیا کروں :

I don't know what the hell to do with it.

ان دولت مندوں کو اکتاہٹ کے علاوہ اور بھی مسائل درپیش ہیں۔ مثلاً ایک دولت مند نے کہا کہ اس کے بچے جلد ہی خود کروڑپتی (Millionaires) ہو جائیں گے۔ وہ اپنی ۴۰۳ ملین ڈالر کی دولت کا کوئی حصہ انھیں دینا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ زیادہ دینا ان کو خراب کر دے گا :

Giving more just spoils them.

مصنف وانس پیکارڈ جو خود اقتصادیات کا عالم ہے، اس نے تفصیلی جائزہ کے بعد اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تھوڑے سے افراد کے درمیان زیادہ دولت کا اجتماع بہت برا ہے۔ یہ سرمایہ داری کی اچھی صحت کے لیے خطرناک ہے۔ اس کے علاج کے لیے مصنف نے ایک تجویز پیش کی ہے ——— ایک خاص مقدار، مثلاً ۲۵ ملین ڈالر کے بعد، پوری دولت پر ٹیکس لگانا :

Taxing net worth above a certain level (say, $ 25 million).

سرمایہ دارانہ نظام میں نفع پر ٹیکس کا اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت جس شخص کے پاس دولت ایک بار آجائے وہ مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں دولت کے ارتکاز (Concentration of Wealth) کی خرابی پیدا ہوتی ہے۔ یہ خرابی موجودہ سرمایہ دارانہ ممالک میں آخری حد تک آچکی ہے۔

پوری دولت پر سال بہ سال ٹیکس لگانا ایک اسلامی تصور ہے۔ یہ عین وہی چیز ہے جس کو شریعت اسلامی میں زکوٰۃ کہا گیا ہے۔ مغربی ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں نے وہاں کے سنجیدہ لوگوں کو کسی نئے معاشی اصول کا متلاشی بنادیا ہے۔ حتی کہ اب وہ زکوٰۃ کا نام لیے بغیر زکوٰۃ کے اصول کی اہمیت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔

آج وہ بہترین وقت آگیا ہے جب کہ مغربی ملکوں کے سامنے اسلام کے معاشی اصولوں کو پیش کیا جائے اور وہ اس کو موجودہ سرمایہ داری کا نعم البدل سمجھ کر اسے قبول کرلیں، اور اسی کے ساتھ پورے اسلام کو بھی۔

آج کی دنیا ایک نئے دور کے آغاز کے کنارے کھڑی ہے۔ یہ وہی دور ہے جس کا متعین نام "اسلامی نظام" ہے۔ تاہم دنیا کو اس طرف لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ صرف ایک ہے۔ اور وہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ انھوں نے غیر مسلم اقوام سے اپنے جھوٹے قومی مسائل کے لیے جھوٹی لڑائی چھیڑ رکھی ہے۔ اس لڑائی سے انھیں کچھ بھی حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ دوسری طرف یہ عظیم نقصان ہے کہ ان کے ان قومی جھگڑوں کی وجہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ناقابل بیان تلخی پیدا ہوگئی ہے۔ اس بنا پر وہ اسلام کے بارے میں سنجیدہ غور و فکر کے قابل نہیں رہے ہیں۔ اگر مسلمان صرف اتنا کریں کہ وہ کچھ نہ کریں یعنی دوسری قوموں سے قومی اور مادی جھگڑے ختم کردیں تو اسلام خود اپنی طاقت سے پھیلنے لگے گا، بغیر اس کے کہ اس کو پھیلانے کی براہ راست جدوجہد کی گئی ہو۔

اسلام کے عقائد عین فطری تقاضے کے مطابق ہیں۔ اسی طرح اسلام کا عملی نظام بھی فطرت کے اصولوں پر قائم ہے۔ اسلام کو اہل عالم کی نظر میں قابل قبول بنانے کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ اسلام کو سادہ اور بے آمیز شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کردیا جائے۔

دنیا انتظار میں ہے

مشہور انگریز مورخ آرنلڈ ٹوائن بی کی ۲۶۳ صفحات کی ایک کتاب ہے جس کا نام "تہذیب کا امتحان" ہے۔ مصنف کے الفاظ میں یہ کتاب انسان کے حال اور مستقبل کے بارہ میں ایک مورخ کے نقطۂ نظر (Standpoint of a historian) کو بیان کرتی ہے :

Arnold J. Toynbee, *Civilization on Trial*, London 1948

کتاب میں مصنف نے ایک بات یہ لکھی ہے کہ جدید تہذیب نے مادی اعتبار سے انسان کو بہت کچھ دیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے بہت سے مسائل بھی پیدا کئے ہیں جن کا حل بظاہر اس کے پاس نہیں۔ ان مسائل میں سے دو چیزیں ــــ نسلی امتیاز اور شراب ہیں۔ مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ ان دونوں برائیوں کو ختم کرنے میں مغربی تہذیب ناکام ہو چکی ہے، اور اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے دونوں برائیوں کو ختم کرنے میں پوری کامیابی حاصل کی۔

ہم اسلام میں کچھ ایسے اصول پاسکتے ہیں جو کہ اگر نئے سماج کے اندر رائج کئے جائیں تو ان کا نہایت مفید اثر قریبی مستقبل میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ ہمارے موجودہ سماجی تعلقات میں دو کھلے ہوئے خطرے موجود ہیں، ایک نفسیاتی اور دوسرا مادی۔ یہ خطرے ہماری موجودہ مغربی سوسائٹی کے اہم اجزاء بن گئے ہیں۔ وہ ہیں ــــ شراب اور نسلی امتیاز۔ ان دونوں برائیوں کو ختم کرنے کے لئے اسلام اہم خدمت انجام دے سکتا ہے۔ اگر یہاں اسلام کو اختیار کر لیا جائے تو وہ اخلاقی اور سماجی اعتبار سے نہایت مفید ثابت ہوگا۔ مسلمانوں میں نسلی امتیاز کا ختم ہو جانا اسلام کا عظیم اخلاقی کارنامہ ہے۔ اور آج کی دنیا میں اسلام کے ان اصولوں کی تبلیغ شدید ضرورت بن گئی ہے (صفحہ ۲۰۵)

We can, however, discern certain principle of Islam which, if brought to bear on the social life of the new cosmopolitan proletariat, might have important salutary effects on 'the great society' in a nearer future. Two conspicuous sources of danger – one psychological and the other material – in the present relations of this cosmopolitan proletariat with the dominant element in our modern Western society are race consciousness and alcohol; and in the struggle with each of these evils the Islamic spirit has a service to render which might prove, if it were accepted, to be of high moral and social value.

The extinction of race consciousness as between Muslims is one of the outstanding moral achievements of Islam, and in the contemporary world there is, as it happens, crying need for the propagation of this Islamic virtue. (p. 205)

شراب کی ثابت شدہ خرابیوں کی بنا پر ۱۹۱۹ میں امریکہ کے دستور میں ۱۸ ویں ترمیم منظور کی گئی ۔ اس کے مطابق ، شراب کو مکمل طور پر ممنوع قرار دیا گیا ۔ مگر حکومت کے تمام ذرائع کو استعمال کرنے کے باوجود ملک سے شراب ختم نہیں ہوئی ۔ بلکہ غیر قانونی شراب کا کاروبار بہت بڑے پیمانے پر سارے ملک میں پھیل گیا ۔ آخر کار حکومت نے ہار مان لی ۔ ۱۹۳۳ میں دستور میں ۲۱ ویں ترمیم کی گئی ۔ اس کے مطابق شراب کو دوبارہ ملک میں جائز قرار دے دیا گیا ۔ (VIII/233)

اس کے برعکس اسلام میں جب ہجرت کے بعد شراب کی باقاعدہ حرمت کا حکم (المائدہ ۹۰) آیا اور مدینہ میں اس حکم کی منادی کی گئی تو فوراً ہی لوگوں نے شراب چھوڑ دی ۔ جس کے پاس شراب کا ذخیرہ تھا اس کو اس نے زمین میں بہا دیا ۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں اس تاریخی واقعہ کا اعتراف اس طرح کیا گیا ہے کہ اسلام میں ساتویں صدی میں شراب پر مذہبی کنٹرول کا بالکل مختلف طریقہ اختیار کیا گیا ۔ قرآن نے سادہ طور پر شراب کی مذمت کی اور اس کا نتیجہ محمد کے پیروؤں پر ایک موثر پابندی کی صورت میں ظاہر ہوا ، عرب میں بھی اور دوسرے ملکوں میں بھی :

Quite a different kind of religious control was adopted later in Islam: the Qur'an simply condemned wine, and the result was an effective prohibition wherever the devout followers of Muhammad in Arabia and other lands prevailed. (1/441-42).

انسانوں میں بظاہر رنگ اور نسل وغیرہ کا فرق پایا جاتا ہے ۔ تاریخ کے پچھلے زمانوں سے اب تک بہت سے لوگوں نے اس فرق کو امتیاز کے ہم معنی سمجھ لیا اس کے نتیجہ میں اعلیٰ نسل اور ادنیٰ نسل کا تصور پیدا ہوا ۔ قرآن میں اس تصور کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے اعلان کیا گیا کہ مختلف انسانی گروہوں میں فرق کا سبب امتیاز نہیں ہے بلکہ اس کا سبب تعارف (الحجرات ۱۳) ہے ۔ اسی کے ساتھ اسلام نے عملی طور پر بے امتیاز سماج کا اعلیٰ نمونہ قائم کیا ۔ مثلاً نماز کے لئے اذان پکارنے کا کام حبشی بلال کے سپرد کیا گیا ۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۵/ ۳۶۱) میں اعتراف کیا گیا ہے کہ اسلام نے جب مختلف ممالک افریقہ وغیرہ) فتح کئے تو کسی بھی مسلم ملک میں نسل کی بنیاد پر ذات پات کا نظام قائم نہ ہوسکا :

None of the Muslim countries ever developed a racial caste system.

اسلام کی مذکورہ حیثیت اتنی واضح ہے کہ غیر مسلم مفکرین اور مورخین بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تاہم اس کو موجودہ زمانہ میں واقعہ بنانے کی محنت ابھی باقی ہے۔

آرنلڈ ٹوائن بی (۱۸۸۹ ۔ ۱۹۷۵) کی مذکورہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۸ میں چھپی۔ گویا یورپ کے اس ممتاز مورخ نے یہ بات بیسویں صدی کے وسط میں کہی تھی۔ اب بیسویں صدی ختم ہو رہی ہے۔ تقریباً ۵۰ سال گزر گئے، مگر مسلمان اب تک اس پکار کے لئے نہیں اٹھے۔ البتہ اسی مدت میں سیاسی ہنگاموں، قومی جھگڑوں اور گولی اور بم کے دھماکوں کے لئے وہ بار بار نہایت جوش و خروش کے ساتھ اٹھتے رہے ہیں۔

یہ بلاشبہ ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے تمام مسلم رہنما اور دانش ور کسی ایک یا دوسری صورت میں یہی جرم کر رہے ہیں۔ دنیا ان سے امن مانگ رہی ہے اور وہ اس کو جنگ دے رہے ہیں۔ دنیا رحمت کی طالب ہے اور وہ اس کو مصیبت پیش کر رہے ہیں۔ دنیا محبت کے انتظار میں ہے اور وہ اس کو نفرت کی خوراک دینا چاہتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دوسری قوموں سے چوٹ پہنچی ۔ اس چوٹ کو وہ سہہ نہ سکے۔ وہ ردعمل میں مبتلا ہو کر ان کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کو جاننا چاہئے کہ اس چوٹ کو سہنا ہی دعوت الی اللہ کی قیمت ہے۔ جو لوگ مدعو کی زیادتیوں پر صبر نہ کر سکیں وہ کبھی دعوت کا کام نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگ اگر دعوت اور داعی کا نام لیتے ہیں تو یہ بات ان کے جرم کے خانہ میں لکھی جانے والی ہے نہ کہ انعام کے خانہ میں۔ جن لوگوں نے دعوت کی قیمت ہی ادا نہ کی ہو وہ دعوت کا انعام آخر کس طرح پا سکتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، ٹوائن بی (Arnold J. Toynbee) نے اپنی کتاب تہذیب کی آزمائش (Civilization on Trial) میں لکھا ہے کہ جدید دنیا، اپنی تمام مادی ترقیوں کے باوجود دو سنگین برائیوں میں مبتلا ہے جن سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت اسے نظر نہیں آتی۔ یہ دونوں برائیاں، شراب اور نسلی امتیاز ہیں۔ مگر اسلام کے پاس اس کا حل موجود ہے اور اسلام نے عملاً ان برائیوں کا خاتمہ کر کے اس کو تاریخی طور پر ثابت کر دیا ہے۔ آج کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ دنیا کو اسلام کے اس روشن پہلو سے واقف کرایا جائے۔

عظمت صحابہ

عظمتِ صحابہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن میں خیرِ امت (آل عمران ۱۱۰) کہا گیا ہے۔ انبیاء و رسل کے بعد وہ تمام انسانوں میں سب سے بہتر گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں (هم خير اجيال البشرية خلا الانبياء والمرسلين)

صحابہ یا اصحاب رسول کی یہ غیر معمولی عظمت کیوں ہے۔ یہ کوئی پراسرار کرامت کی بات نہیں، یہ ایک معلوم اور ثابت شدہ حقیقت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قول و عمل سے تاریخ میں ایسی مثال قائم کی جیسی مثال کبھی کسی انسانی گروہ نے قائم نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ اعلیٰ اور افضل گروہ قرار پائے۔

ان کا سب سے پہلا اور انوکھا کارنامہ وہ ہے جس کو معرفتِ حق کہا جاسکتا ہے۔ لوگ سچائی کے مظاہر کو جانتے ہیں، صحابہ نے سچائی کو حقیقت کے اعتبار سے جانا۔ لوگ مانی ہوئی سچائی کو مانتے ہیں، انھوں نے سچائی کو خود اپنی بصیرت سے دریافت کیا۔ لوگ اس سچائی کی قدردانی کرتے ہیں جو گنبد کی سطح پر نظر آتی ہو، انھوں نے اس سچائی کی قدر کی جو ابھی صرف مجرد روپ میں تھی۔

لوگ اس سچائی کے چیمپین بنتے ہیں جس کے ساتھ مادی وزن اکٹھا ہو گیا ہو، انھوں نے اپنے آپ کو اس سچائی کے لیے وقف کیا جو ہر قسم کے مادی وزن سے یکسر خالی تھی۔ لوگ اس سچائی کی علم برداری کرتے ہیں جس کی پشت پر ایک باعظمت تاریخ بن چکی ہو، انھوں نے ایک بے تاریخ سچائی کا ساتھ دیا اور ہر قسم کی نفسیاتی اور جسمانی قربانی دے کر خود اس کی ایک شاندار تاریخ بنائی۔

اصحاب رسول تمام انسانی نسلوں کے لیے رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ وہ قیامت تک پیدا ہونے والے اپنے بندوں کے لیے ایک نمونہ قائم کرے۔ اصحاب رسول نے اپنی غیر معمولی قربانیوں کے ذریعہ یہ درجہ حاصل کیا کہ وہ تمام انسانیت کے لیے ابدی نمونۂ حیات قرار پائے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کے ہر مرحلہ میں حق پر ثابت قدم رہے۔ جنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں وہی روش اختیار کی جو انصاف اور صداقت پر مبنی تھی۔ وہ آزاد ہوتے ہوئے اصولوں

کے پابند بن گئے۔ اختیار رکھتے ہوئے انھوں نے سچائی کے سامنے اپنے کو بے اختیار کر لیا۔ ان کے لیے بے راہ روی کے مواقع موجود تھے مگر وہ بے راہ رو نہیں ہوئے۔ انھوں نے ہر معاملہ میں اپنے آپ کو راست روی کے اعلیٰ معیار پر پوری طرح قائم رکھا۔

پوری انسانی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی پیغمبر کو اس کے ہم عصر لوگوں نے پہچانا ہو۔ پچھلے پیغمبروں کو افراد ملے مگر انھیں جماعتیں نہ مل سکیں۔ اصحاب رسول کا یہ انوکھا کارنامہ ہے کہ انھوں نے جماعت کی سطح پر اپنے ہم عصر پیغمبر کو پہچانا اور بڑی تعداد میں اس کے مشن کو اپنا کر اس کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ ان کے ساتھ بار بار وہ واقعات پیش آئے جن کو عذر بنا کر لوگ بدک جاتے ہیں اور ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، مگر انھوں نے کسی عذر کو عذر نہیں بنایا، وہ ہر قسم کی ناخوش گوار باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ کی حمایت کرتے رہے، یہاں تک کہ اسی حال میں اس دنیا سے چلے گئے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں کی حیثیت سے مبعوث کیا تھا۔ یہ سادہ طور پر صرف تقرر کا معاملہ نہ تھا، بلکہ ایک مشکل ترین منصوبہ کو بر روئے کار لانے کا معاملہ تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک وسیع الاثر انقلاب برپا کر کے وہ تاریخی اسباب ظہور میں لائے جائیں جس کے بعد آپ کی نبوت ہمیشہ کے لیے ایک مسلّم نبوت کی حیثیت اختیار کر لے۔ آپ کا دین ناقابل شکست حد تک ایک محفوظ دین بن جائے۔ آپ کی ذات اور آپ کا کارنامہ تاریخ میں اس طرح ثبت ہو جائے کہ کوئی مٹانے والا اس کو مٹانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ منصوبہ اسباب کی دنیا میں اور انسانی آزادی کے ماحول میں مکمل کرنا تھا۔ اس پہلو نے اس منصوبہ کو آخری حد تک ایک انتہائی مشکل منصوبہ بنا دیا۔ اصحاب رسول نے اپنے آپ کو پوری طرح اس منصوبہ الٰہی میں شامل کیا۔ اس کی خاطر انھوں نے اپنی جان کو جان اور اپنے مال کو مال نہیں سمجھا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی انا کو کچلا۔ اپنے تاج کو اپنے پیروں کے نیچے روندا۔ اپنی محبوب چیزوں کو چھوڑ کر وہ اس کی طرف بڑھے۔ انھوں نے نہ ماننے والی بات کو مانا۔ انھوں نے ناقابل برداشت کو برداشت کیا۔ پیغمبر کو پانے کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ کسی بھی شرط اور کسی بھی تحفظ کے بغیر وہ آپ کے شریک کار بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصحاب رسول انسانی تاریخ کے ایک منفرد گروہ تھے۔ اصحاب رسول کی عظمت اس سے زیادہ ہے کہ کوئی شخص اس کو لفظوں میں بیان کر سکے۔

فطری اوصاف

ابتدائی دور کے سماج (primitive society) کے بارہ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جو مطالعہ کیا گیا، اس میں یہ مان لیا گیا تھا کہ یہ لوگ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے کمتر (mentally and morally inferior) تھے۔ مگر بیسویں صدی میں علم الانسان (Anthropology) کے علماء نے جو تحقیقات کی ہیں، اس کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ابتدائی دور کا انسان نہایت اعلیٰ انسان تھا۔ تہذیبی سازوسامان میں بظاہر وہ پیچھے تھا۔ مگر انسانی اوصاف کے اعتبار سے وہ معیاری انسان کی حیثیت رکھتا تھا۔ (VII/382)

اس جدید تحقیق کے بعد سماجیات میں ایک نیا شعبۂ فن وجود میں آیا ہے جس کو پریمیٹوزم (Primitivism) کہا جاتا ہے۔ اس فن میں ابتدائی دور کے انسان کا مطالعہ اس اعتبار سے کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی صفات کے اعتبار سے آئیڈیل انسان تھا اور آج کے انسان کو اسی کی پیروی کرنا چاہیے (VIII/212)

یہ نظریہ اسلام کے تصور تاریخ کے عین مطابق ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ابتدائی دور کے لوگ امت واحدہ تھے (البقرہ ۲۱۳) یعنی وہ اس واحد صحیح راستہ پر تھے جو خدا نے ان کے لیے انسانِ اوّل (آدم) کی پیدائش کے وقت مقرر کر دیا تھا۔ ایک عرصہ کے بعد وہ اس راستہ سے ہٹ گیے۔ ان میں بگاڑ اور اختلاف پیدا ہو گیا۔ جب انسانی آبادی پر بگاڑ کا دور شروع ہوا تو خدا نے پیغمبر بھیجنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

ابتدائی دور کا انسان صحیح کیوں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فطرت پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو فطرت بنائی ہے، وہ انتہائی معیاری صفات کی حامل ہے۔ جب تک آدمی اپنی اس پیدائشی فطرت پر تھا، وہ اعلیٰ انسانی صفات سے متصف تھا، اس کے بعد تمدن کا دور شروع ہوا۔ اس مصنوعی تمدن نے انسان کو بگاڑنا شروع کیا۔ اب انسان کی فطرت دب گئی اور اس پر مصنوعی تمدنی صفات غالب آگئیں۔

فطرت کا یہی بگاڑ ہے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بعد کے دور میں آنے والے پیغمبروں کا انکار کیا جاتا رہا۔

اس بگاڑ کی بنا پر انسانی فطرت اور دینِ خداوندی میں مطابقت باقی نہ رہی۔ انسان اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی وجہ سے پیغمبروں کو پہچاننے اور ان کی آواز پر لبیک کہنے والا نہ بن سکا۔ یہ صورت حال ہزاروں سال تک جاری رہی۔

حضرت ابراہیم کا پیغام جب اہل عراق کو متاثر نہ کر سکا تو انسان کی نااہلی آخری طور پر واضح ہو گئی۔ اب اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ منصوبہ بندی کی گئی کہ انسان کو دوبارہ غیر تمدنی دنیا کی طرف واپس لے جایا جائے۔ اس منصوبے کے مطابق، حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسماعیل کو عرب کے صحرا میں بسا دیا گیا جہاں اس وقت صرف فطرت کا ماحول تھا۔ فطرت کے مناظر کے سوا وہاں کوئی اور چیز موجود نہ تھی۔

اس صحرائی ماحول میں ایک ایسی نسل کی تیاری شروع ہوئی جو تمدن سے مکمل طور پر منقطع ہو کر پرورش پا سکے۔ توالد و تناسل کے ذریعہ یہ نسل بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ڈھائی ہزار سال میں ایک نئی قوم بن کر تیار ہو گئی۔ اس نئی قوم کے ہر فرد میں وہ اعلیٰ فطری اوصاف پوری طرح موجود تھے جو ابتدائی دور کے انسان میں پائے جاتے تھے۔ یہی فطری یا انسانی اوصاف اس صحرائی قوم کی شناخت بن گیے۔

قدیم عربوں میں اعلیٰ انسانیت کو بتانے کے لیے کچھ الفاظ رائج تھے۔ مثلاً الفتوة، المروءة، الرجولية، وغیرہ۔ اردو میں اس کو جواں مردی یا مردانگی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے عربوں کی مراد عین وہی چیز ہوتی تھی جس کو آج "ابتدائی انسانی اوصاف" کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنو اسماعیل کی یہ صحرائی قوم قدیم ابتدائی سماج کا ایک احیاء تھا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے "معادن عرب" کے بارہ میں پوچھا گیا۔ فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہوں گے (خیارکم فی الجاهلية خيارکم فی الاسلام) دور اول کے عرب اہل اسلام کے غیر معمولی اوصاف بھی اسی کا نتیجہ تھے۔ انس بن مالکؓ صحابہ کے بارہ میں کہتے ہیں کہ خدا کی قسم، ہم جھوٹ نہیں بولتے تھے اور نہ ہم جانتے تھے کہ جھوٹ کیا ہے (والله ما كنّا نكذبُ ولا كنّا ندري ما الكذب)

عرب کے صحرا میں اعلیٰ فطری اوصاف سے متصف جو انسان تیار کئے گئے تھے، انھیں کے منتخب افراد ایمان لا کر اصحاب رسول بنے۔ یہ ایک بہترین خام مادہ تھا جو اسلام کی معرفت اور پیغمبر کی رفاقت سے جلا پا کر چمک اٹھا (تفصیل کیلئے: حقیقتِ حج ۵۴-۵۸)

خیر امت

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ (آل عمران ۱۱۰)

تم بہترین گروہ ہو جس کو لوگوں کے واسطے نکالا گیا ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں خیر امت (بہترین گروہ) سے مراد صحابہ کا گروہ ہے۔ "اخرجت" کے معنی اظہرت یا اوجدت کے ہیں۔ یعنی اس گروہ کو خصوصی اہتمام کے ساتھ نکال کر میدان میں لایا گیا ہے۔ یہ اس صحرائی منصوبہ کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ سے صحابہ کی وہ انوکھی جماعت حاصل کی گئی جس کو پروفیسر ڈی ایس مارگولینتھ (۱۹۴۰-۱۸۵۸) نے ہیروؤں کی ایک قوم (a nation of heroes) کا نام دیا ہے۔

اصحاب رسول کون لوگ تھے۔ یہ بنو اسماعیل کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نسل کے جد اعلیٰ اسماعیل بن ابراہیمؑ ہیں۔ چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم نے اپنے چھوٹے بچہ اسماعیل اور ان کی ماں ہاجرہ کو عراق سے نکالا اور ان کو لے جا کر حجاز (عرب) کے صحرا میں چھوڑ دیا۔

اس وقت یہ علاقہ ایک بے آب وگیاہ علاقہ تھا۔ وہاں کوئی انسانی آبادی نہ تھی۔ یہ مکمل طور پر فطرت کی ایک دنیا تھی۔ صحرا اور پہاڑ، زمین اور آسمان، سورج اور چاند، بس اس قسم کی چیزیں تھیں جن کے درمیان کسی شخص کو اپنے رات اور دن کو گزارنا تھا۔ یہاں شہریت اور تمدن کا کوئی نشان نہ تھا۔ چاروں طرف صرف فطرت کی پُرہیبت نشانیاں پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ مزید یہ کہ یہاں آرام اور عیش نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ یہاں زندگی سراپا چیلنج تھی۔ آدمی مجبور تھا کہ مسلسل چیلنج کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اس پُرمشقت ماحول میں زندہ رہنے کی کوشش کرے۔

تمدن کی خرابیوں سے دور اس سادہ ماحول میں توالد وتناسل کے ذریعہ ایک نسل بننا شروع ہوئی۔ یہ ایسے لوگ تھے جن کے حالات نے انھیں انسانی تکلفات سے دور کر رکھا تھا۔ وہ مصنوعی اخلاق سے بالکل ناآشنا تھے۔ وہ ایک ہی رہنمائی کو جانتے تھے، اور وہ فطرت کی رہنمائی تھی۔ فطرت بلاشبہہ انتہائی معیاری معلّم ہے، اور صحرا کی یہ نسل اسی معیاری معلّم کے تحت بن کر تیار ہوئی۔

آل عمران کی مذکورہ آیت میں خیر امت کی دو خاص صفتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے ہیں۔ یعنی خلافِ حق بات کو برداشت نہ کرنا اور حق سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہونا، یہ ان کا مستقل مزاج ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنے گرد وپیش سے غیر متعلق رہ کر زندگی گزارتے ہیں یا جن کا رویہ ذاتی مصالح کے تحت متعین ہوتا ہے۔ بلکہ وہ کامل طور پر حق پسند ہیں۔ حق اور ناحق کی بحث میں نہ پڑنا، یا ناحق سے سمجھوتہ کر کے زندہ رہنا ان کے لیے ممکن نہیں۔

ان کی دوسری صفت یہ بتائی کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ صاحب معرفت لوگ ہیں۔ وہ ظواہر میں گم رہنے والے لوگ نہیں ہیں۔ انھوں نے حقیقت اعلیٰ کو دریافت کیا ہے۔ ان کا شعور پائے ہوئے انسانوں کا شعور ہے۔ انھوں نے مخلوقات کی دنیا کے پیچھے اس کے خالق کا جلوہ دیکھ لیا ہے۔

یہ دونوں صفتیں بے حد نادر صفتیں ہیں۔ حق پسند اور صاحب معرفت وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو بے حد سنجیدہ ہوں۔ جو اصول کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہوں نہ کہ خواہش کی بنیاد پر۔ جو حقائقِ مادی کے بجائے حقائقِ معنوی کو اپنی توجہات کا محور بنائے ہوئے ہوں۔ جو مفاد کے بجائے صداقت کے لیے جینے والے ہوں۔ جو دباؤ کے بغیر اپنے آزادانہ فیصلہ کے تحت صحیح رویہ اختیار کر لیں۔ جو دلیل سے چپ ہو جائیں، بغیر اس کے کہ ان کو چپ کرنے کے لیے کوئی طاقت استعمال کی گئی ہو۔

اس دنیا میں سب سے بڑا قول حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے، اور اس دنیا میں سب سے بڑا عمل حقیقتِ واقعہ سے مطابقت۔ اور اصحاب رسول بلاشبہ ان نادر انسانوں میں سے تھے جو اس معیارِ انسانیت پر آخری حد تک پورے اترے۔

یہ وہ انسان کامل ہے جس کی انسانیت پوری طرح محفوظ ہوتی ہے۔ جو اپنی تخلیقی فطرت پر قائم رہتا ہے۔ یہی وہ زندہ فطرت والا انسان ہے جو عرب کے صحرائی ماحول میں ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ تیار کیا گیا۔ اور صحابہ کا گروہ وہ منتخب انسانی گروہ ہے جس کو اس مخصوص انسانی نسل سے چن کر نکالا گیا۔

صحابہ وہ لوگ تھے جو دوسروں کی خیر خواہی کے لیے جئے۔ جن کی ساری کوشش یہ تھی کہ وہ لوگوں کو جہنم سے بچا کر جنت میں پہنچا دیں۔ اسی لیے وہ خیر امت قرار پائے۔

ایک شہادت

اخرج ابن ابی الدنیا عن ابی اراکۃ یقول : صلیت مع علی رضی اللہ عنہ صلاۃ الفجر، فلما انفتل عن یمینہ مکث کأنّ علیہ کابۃٌ ، حتی اذا کانت الشمس علی حائط المسجد قِیدَ رُمح صلیّ رکعتین ثم قلب یدہ فقال : واللہ لقد رأیت اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فما اری الیوم شیئاً یُشبھھم؛ لقد کانوا یصبحون صُفراً شُعثاً غُبراً بین اعینھم کامثال رُکب المعزی ۔ قد باتوا للہ سُجّداً وقیاماً ، یتلون کتاب اللہ ، یتراوحون بین جباھھم و اقدامھم ، فاذا اصبحوا فذکروا اللہ مادوا کما یمید الشجر فی یوم الریح وھملت اعینھم حتی تبتل ثیابھم ، واللہ لکأنّ القوم باتوا غافلین ۔ ثم نھض فما رُئِیَ بعد ذلک مفترّاً یضحک حتی قتلہ ابن مُلجم عدوّ اللہ الفاسق ۔

ابن ابی الدنیا نے روایت کی ہے ۔ اسماعیل السدی کہتے ہیں کہ میں نے ابواراکہ تابعی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے خلیفہ چہارم علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی ۔ پھر جب انھوں نے اپنے چہرہ کو دائیں طرف پھیرا تو وہ اس طرح رہے جیسے کہ ان کے اوپر شدید غم ہو ۔ یہاں تک کہ جب دھوپ مسجد کی دیوار پر ایک نیزہ کے برابر آگئی تو انھوں نے اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھی ۔ پھر انھوں نے اپنے ہاتھ کو پلٹتے ہوئے کہا ۔ خدا کی قسم ، میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا ہے ۔ آج میں کوئی چیز ان کے مشابہ نہیں دیکھتا ۔ وہ زرد رو ، پراگندہ بال اور غبار آلود حالت میں صبح کرتے تھے ۔ ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بکری کے گھٹنے جیسا نشان ہوتا ۔ وہ اپنی رات اللہ کے لیے سجدہ اور قیام میں گزارتے ۔ وہ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ، وہ اپنی پیشانیوں اور قدموں کے درمیان باری باری عمل کرتے ۔ جب وہ صبح کرتے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ، اس وقت وہ ہلتے جس طرح درخت ہوا کے چلنے کے وقت ہلتا ہے ۔ ان کی آنکھیں آنسو بہاتیں ، یہاں تک کہ ان کے کپڑے بھیگ جاتے ۔ خدا کی قسم ، آج کے لوگوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی رات غفلت میں گزاری ۔ علی رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ، پھر وہ وہاں سے اٹھ گئے ۔ اس کے بعد وہ کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھے گئے ،

یہاں تک کہ دشمن خدا ابن ملجم نے ان کو قتل کر دیا (البدایہ والنہایہ ۸/۶)

"خالی ہاتھ، پراگندہ بال اور غبار آلود ہونا" اس بات کی علامت ہے کہ وہ دنیا سے آخری حد تک بے رغبت تھے اور آخرت کی طرف آخری حد تک متوجہ ہو چکے تھے۔ دین کی فکر میں وہ اس حد تک گم ہو چکے تھے کہ اہل دنیا اگر دیکھیں تو سمجھیں کہ یہ مجنون لوگ ہیں۔

ذکر اور عبادت اور تلاوت ان کی محبوب ترین چیز ہو چکی تھی۔ لمبے قیام میں انھیں تسکین ملتی تھی۔ ان کے طویل سجدوں کا نشان ان کی پیشانیوں پر نمایاں نظر آتا تھا، وہ اندر سے باہر تک خدا کے نور میں نہائے ہوتے تھے۔ ان کی زندگی تمام تر خدا کے لیے وقف ہو چکی تھی۔

"اللہ کی یاد کے وقت وہ اس طرح ہلتے جیسے درخت تیز ہوا میں ہلتا ہے" یہ اس کیفیت کا ذکر ہے جو تھرتھراہٹ کے وقت ان کے جسم کی ہوتی تھی۔ اللہ کی یاد ان کے سینہ میں بھونچال کی طرح اٹھتی تھی۔ اس سے ان کی روح کے اندر ایک بجلی دوڑ جاتی اور ان کے جسم پر تھرتھری کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ وہ اللہ کے خوف سے بار بار کانپ اٹھتے تھے۔

"ان کی آنکھیں آنسو بہاتیں اور ان کے کپڑے بھیگ جاتے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لیے خدا کا ذکر کوئی تلفظ لسانی کا عمل نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک قلبی عمل ہوتا تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے چند الفاظ میں اصحاب رسول کا جو خاکہ بتایا ہے، وہ نہایت کامل اور جامع خاکہ ہے۔ ان مختصر لفظوں میں اصحاب رسول کی وہ تمام بنیادی صفات آجاتی ہیں جن سے وہ متصف تھے اور جنھوں نے ان کو پوری نسل انسانی میں انبیاء کرام کے بعد سب سے اونچا درجہ دیدیا۔

اصحاب رسول بھی مومن تھے جس طرح دوسرے لوگ مومن ہوتے ہیں۔ مگر اصحاب رسول کا ایمان ان کے لیے ایک انتہائی سنجیدہ فیصلہ تھا۔ حتی کہ اس نے انھیں دیوانہ بنا دیا۔ ان کا ایمان ان کے پورے وجود میں چمک اٹھا تھا۔ اللہ کی یاد ان کے لیے ایک روحانی زلزلہ کے ہم معنی تھی۔ آخرت کو ماننا ان کے لیے ایک ایسی طوفان خیز حقیقت پر یقین کرنا تھا جو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بن کر بہہ نکلے۔

اصحاب رسول تاریخ کے سب سے زیادہ زندہ انسان تھے اور تاریخ کی سب سے زیادہ انقلابی جماعت۔

والذین معہ

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضوانا۔ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود۔ ذلک مثلھم فی التوراۃ۔ ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار۔ وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجراً عظیما (الفتح ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم ان کو رکوع میں اور سجدہ میں دیکھو گے۔ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے سجدہ کے اثر سے، ان کی یہ مثال تورات میں ہے۔ اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھیتی، اس نے اپنا انکھوا نکالا۔ پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر وہ اور موٹا ہوا۔ پھر اپنے تنے پر کھڑا ہو گیا۔ وہ کسانوں کو بھلا لگتا ہے تاکہ ان سے کافروں کو جلائے۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ نے ان سے معافی کا اور بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔

قرآن کے یہ الفاظ اصحاب رسول کے بارہ میں ہیں۔ اصحاب رسول کی تاریخی اہمیت کی بنا پر ان کی صفات قدیم آسمانی صحیفوں میں درج کر دی گئی تھیں۔ موجودہ محرف تورات میں اب بھی موجود ہے کہ وہ لاکھوں قدسیوں (saints) میں سے آیا (استثنا ۳۳ : ۲) موجودہ انجیل میں یہ پیشین گوئی ان الفاظ میں ملتی ہے : خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے۔ اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پہلے پتی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیار دانے۔ پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا (مرقس ۴ : ۲۶-۲۹) وہ رائی کے دانے کی مانند ہے کہ جب زمین میں بویا جاتا ہے تو زمین کے سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ مگر جب بو دیا گیا تو اگ کر سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے اور ایسی ڈالیاں نکالتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کے سایہ میں بسیرا کریں (۳۲)

اس آیت کے پہلے حصہ میں تورات کے حوالہ سے صحابہ کی انفرادی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اور اس کے دوسرے حصہ میں انجیل کے حوالے سے ان کی اجتماعی صفات۔

- اصحاب رسول کی پہلی شخصی صفت یہ بتائی کہ وہ منکروں پر سخت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پر ایمان نے ان کو ایک بااصول انسان بنا دیا ہے۔ جو لوگ دین خدا کے منکر ہیں یا بے اصول زندگی گزار رہے ہیں، ان کے ساتھ مصالحت کا معاملہ کرنا ان کے لیے ممکن نہیں۔ ذاتی مفاد کی خاطر کبھی وہ بے اصولی کا رویہ اختیار نہیں کرتے۔

"وہ آپس میں مہربان ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ اختلاف اور شکایت کے مواقع پیش آنے کے باوجود وہ ہمدردی اور مہربانی کے رویہ پر قائم رہتے ہیں۔ غیر اہل دین کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اصولی ٹکراؤ کا مسئلہ پیش آتا ہے، وہاں وہ بالکل بے لچک ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے ہم مذہب لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے شکایت کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں، مگر وہ شکایتوں اور تلخیوں کو نظر انداز کرکے حسن سلوک کی روش پر قائم رہتے ہیں۔

"وہ رکوع اور سجدہ میں رہتے ہیں" یعنی وہ نماز قائم کرنے والے ہیں۔ ان کے دن اور ان کی راتیں اللہ کے آگے جھکنے میں اور اس کی عبادت گزاری میں بسر ہوتی ہیں۔

"وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کے طالب ہیں" یعنی ان کے لیے سب سے زیادہ محبوب و مطلوب چیز وہ ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ وہ اللہ کی یاد میں اور اللہ سے دعا و التجا میں اپنے لمحات گزارتے ہیں۔

"ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے" یعنی ان کے دل کا اللہ کے لیے جھکاؤ ان کے چہروں پر تواضع اور سنجیدگی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ خدا کے ساتھ گہری وابستگی ان کے چہروں پر ربانی جھلک کی صورت میں نظر آتی ہے ——— یہ ان کے انفرادی اوصاف ہیں۔

صحابہ کے انفرادی اوصاف کے ذکر کے بعد ان اوصاف کے اجتماعی انجام کو بیج کی مثال سے بتایا گیا ہے۔ بیج زمین میں بو دیا جائے تو وہ بڑھتے بڑھتے درخت بن جاتا ہے۔ اسی طرح مذکورہ اوصاف جب افراد انسانی میں پیدا ہو جائیں تو وہ بیرونی دنیا کو متاثر کرنے لگتے ہیں۔ یہ عمل جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس انقلاب تک پہنچ جاتا ہے جس کا کامل نمونہ اصحاب رسول کی صورت میں تاریخ میں قائم ہوا۔

اعترافِ حق

ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو عمر بن الخطاب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے منافق یہ گمان کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ مگر خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ وہ اپنے رب کے پاس گئے ہیں جیسا کہ موسیٰ بن عمران گئے تھے۔ وہ اپنی قوم سے چالیس دن کے لیے غائب ہو گئے تھے، پھر ان کی طرف واپس آئے جب کہ یہ کہا جانے لگا تھا کہ وہ مر گئے۔ خدا کی قسم، رسول اللہؐ ضرور اسی طرح لوٹ کر آئیں گے جس طرح موسیٰ لوٹ کر آئے۔ پھر آپ ان لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹیں گے جن کا یہ گمان ہے کہ آپ پر موت واقع ہوگئی ہے۔

ابوبکرؓ کو خبر ہوئی تو وہ آئے اور مسجد کے دروازے پر اترے۔ اس وقت عمرؓ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہے تھے۔ ابوبکر سیدھے آپ کے حجرہ میں گئے۔ ابوبکرؓ نے آپ کے چہرہ سے چادر اٹھائی اور اس کو بوسہ دیا، پھر کہا کہ میرے باپ اور ماں آپ پر قربان، اللہ نے جو موت آپ کے لیے مقدر کی تھی، وہ آپ پر آچکی۔ اس کے بعد اب آپ پر موت کی مصیبت آنے والی نہیں۔ اس کے بعد ابوبکرؓ نے آپ کے چہرے کے اوپر چادر ڈال دی اور باہر آئے۔ عمرؓ برابر لوگوں کے سامنے بول رہے تھے۔ ابوبکرؓ نے ان سے کہا کہ اے عمر ٹھہرو، خاموش ہو جاؤ۔ عمرؓ نے چپ ہونے سے انکار کیا۔ ابوبکرؓ نے جب دیکھا کہ عمر چپ ہونے پر تیار نہیں ہیں تو وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ لوگوں نے جب ابوبکر کی آواز سنی تو سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور عمر کو چھوڑ دیا۔

ابوبکر نے حمد وثنا کے بعد کہا کہ اے لوگو، جو شخص محمدؐ کی عبادت کرتا تھا تو محمد مر گئے۔ اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے، وہ کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کے بعد ابوبکر نے یہ آیت پڑھی :

وما محمد الا رسول قد خلت من	اور محمد بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت
قبله الرسل افأن مات او قتل	سے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں
انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ	یا قتل کر دیے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔
عقبیه فلن یضر الله شیئا	اور جو آدمی پھر جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا

وسیجزی اللّٰہ الشاکرین (آل عمران ۱۴۴)   اور اللہ شکر گزاروں کو بدلہ دے گا۔

راوی کہتے ہیں کہ جب ابوبکر نے یہ آیت پڑھی تو ایسا محسوس ہوا جیسے لوگ یہ جانتے ہی نہ تھے کہ قرآن میں یہ آیت بھی نازل ہوئی ہے۔ اب ابوبکرؓ سے اس آیت کو سن کر لوگوں نے اس کو اخذ کرلیا۔ اس کے بعد یہ آیت تمام لوگوں کی زبان پر تھی۔

راوی کہتے ہیں کہ عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم، جب میں نے ابوبکر کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو میں دہشت زدہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ میں زمین پر گر پڑا۔ اور میرے دونوں پاؤں میرا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ اور میں نے جان لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی (سیرۃ ابن ہشام ۴/۳۵-۲۲۴)

عمر فاروق اس وقت اتنے جوش میں تھے کہ ابوبکر صدیق کی باتوں سے چپ نہیں ہو رہے تھے۔ اس کے بعد جب انھوں نے قرآن کی ایک آیت پڑھ دی تو اچانک وہ ڈھ پڑے۔ حالانکہ ابوبکر صدیق پہلے بھی کچھ الفاظ بول رہے تھے، اور اب بھی انھوں نے کچھ الفاظ ہی اپنی زبان سے نکالے تھے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ پہلے الفاظ انسان کے الفاظ تھے، اور دوسرے الفاظ خدا کے الفاظ۔

اس سے اصحاب رسول کی ایک نہایت اہم صفت سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ اصحاب رسول اللہ کا حکم آتے ہی اس کے آگے ڈھ پڑنے والے لوگ تھے۔ عام انسان قیامت میں رب العالمین کو دیکھ کر اس کے آگے ڈھ پڑے گا۔ اصحاب رسول وہ لوگ تھے جو اسی دنیا میں رب العالمین کو دیکھے بغیر اس کے آگے ڈھ پڑے۔ منکرین خدا پر جو کچھ موت کے بعد بیتنے والا ہے، وہ اصحاب رسول پر موت سے پہلے کی زندگی میں بیت گیا۔ دوسرے لوگ جس چیز کو مجبوری کے تحت قبول کریں گے، اس کو اصحاب رسول نے خود اپنے آزادانہ فیصلہ کے تحت اختیار کرلیا۔

انسان کو موجودہ دنیا میں اسی خاص امتحان کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہاں انسان کو آزادی دی گئی ہے۔ مگر یہ آزادی برائے آزمائش ہے نہ کہ برائے انعام۔ اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون شخص ہے جو آزادی پاکر سرکش ہو جاتا ہے، اور کون ہے جو آزادی پانے کے باوجود اللہ کے آگے جھک جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اسی خدائی مطلوب کا عملی نمونہ تھے۔ انھوں نے خدا کے حکم کو عملاً اختیار کرکے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ آدمی کو کیسا بننا چاہیے، اور اپنی آزادی کو اسے کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔

بے نفسی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اگر کسی مسلمان کی موت کا وقت آجائے اور اس کو اپنے مال کے بارہ میں وصیت کرنا ہے تو اس کو چاہیے کہ دو معتبر آدمیوں کو گواہ بناکر وہ اپنی وصیت کرے۔ اس سلسلہ میں احکام بتاتے ہوئے فرمایا ہے کہ بعد کو گواہی دینے کے وقت اگر یہ بات علم میں آئے کہ ان دونوں گواہوں نے گواہی دینے میں کوئی حق تلفی کی ہے تو ان کی جگہ دوسرے دو شخص وراثت کے حق داروں میں سے کھڑے ہوں۔ جو میت سے زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہوں۔ یہ دوسرے دونوں آدمی قسم کھاکر کہیں کہ ہماری گواہی ان دونوں اولیٰ بالشہادۃ گواہوں کی گواہی سے زیادہ برحق ہے (المائدہ ۱۰۷)

اس آیت کا ایک ٹکڑا یہ ہے : مِنَ الَّذِینَ اسْتَحَقَّ عَلَیْھِمُ الاولیان (ان میں سے جن کا کہ حق دبا ہے جو سب سے قریب ہوں میت کے) اس آیت کے ایک لفظ (الاولیان) کی قرأت میں اختلاف ہے۔ الحسن نے اس کو الاوّلان پڑھا ہے۔ اور ابن سیرین نے اس کو الاوّلین پڑھا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہ ہے :

عن ابی مِجلَز اَن اُبیّ بن کعب قرأ (من الذین استحق علیھم الاولیان) فقال عمر عنہ کذبتَ۔ قال انتَ اکذب۔ فقال رجل۔ تکذّب امیرالمومنین۔ قال : انا اشد تعظیماً لحق امیرالمومنین منك۔ ولکن کذّبتُہ فی تصدیق کتاب اللہ، ولم اصدّق امیرالمومنین فی تکذیب کتاب اللہ۔ فقال عمر صدق (حیاۃ الصحابۃ ۲/۴۷-۵)

ابومجلز سے روایت ہے کہ ابی بن کعب نے یہ آیت پڑھی (من الذین استحق علیہم الاولیان) پس عمر نے ان سے کہا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ انھوں نے کہا کہ تم خود زیادہ جھوٹے ہو۔ یہ سن کر ایک شخص نے کہا کہ تم امیرالمومنین کو جھوٹا کہتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں تم سے زیادہ امیرالمومنین کے حق کی تعظیم کرتا ہوں۔ لیکن میں نے ان کو اللہ کی کتاب کی تصدیق کے معاملہ میں جھٹلایا ہے۔ میں نے کتاب اللہ کی تکذیب کے معاملہ میں امیرالمومنین کی تصدیق نہیں کی۔ عمر نے یہ سن کر کہا کہ انھوں نے سچ کہا۔

اس واقعہ میں ایک صحابی نے دوسرے صحابی پر سخت تنقید کی جو کہ وقت کا سربراہ سلطنت

تھا۔ مگر ناقد صحابی کا معاملہ یہ تھا کہ سخت ترین لفظوں میں تنقید کرنے کے باوجود زیرتنقید صحابی کے شخصی احترام میں ان کے اندر کوئی کمی نہیں آئی۔ اور دوسری طرف زیرتنقید صحابی کا معاملہ یہ تھا کہ اعلیٰ منصب پر ہونے کے باوجود انھوں نے اس سخت تنقید کو برا نہیں مانا۔

یہ صفت اجتماعی زندگی اور اجتماعی اتحاد کے لیے بے حد ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صفت کے بغیر نہ کوئی معاشرہ بہتر معاشرہ بن سکتا اور نہ اس کے اندر اتحاد کا ماحول قائم ہو سکتا ہے۔ مگر یہ قیمتی صفت انتہائی نادر اور انوکھی ہے۔ اور جماعت کی سطح پر معلوم تاریخ میں صحابہ کے علاوہ کہیں اور پائی نہیں گئی۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے کے خلاف بولنا پڑتا ہے۔ یہ بولنا زندگی کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ مگر بولنے والا معاملہ کو صاحبِ معاملہ سے الگ کر کے نہیں دیکھ پاتا۔ اس لیے وہ معاملہ پر تنقید کرنے کے ساتھ صاحبِ معاملہ سے بیزار بھی ہو جاتا ہے۔ مگر اصحاب رسول اس اعتبار سے ایک تاریخی استثنار تھے۔ اصحاب رسول کے درمیان تنقید کا عام رواج تھا۔ مگر تنقید کرنے والا ہمیشہ "بات" پر تنقید کرتا تھا۔ وہ زیرتنقید آدمی کی شخصیت سے نہ تو متنفر ہوتا تھا اور نہ اس کے احترام میں کوئی کمی کرتا تھا۔

یہی حال زیرتنقید شخص کا بھی تھا۔ وہ سخت سے سخت تنقید کو سنتا تھا۔ مگر وہ تنقید کی ظاہری سختی کو نظرانداز کرتے ہوئے اصل تنقید پر سوچنے لگتا تھا کہ وہ قابلِ قبول ہے یا ناقابلِ قبول۔

تنقید کی چوٹ بہت کڑی چوٹ ہے۔ اپنے خلاف تنقید سنتے ہی آدمی کے اندر ایک آگ سی لگ جاتی ہے، مگر صحابہ کرام اس سے بہت بلند تھے۔ صحابہ کا حال یہ تھا کہ وہ نہ صرف اپنے خلاف تنقید کو ٹھنڈے دماغ سے سنتے تھے، بلکہ ناقد کے سخت ترین الفاظ کی بھی انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

اس کی وجہ صحابہ کرام کی ربانیت تھی۔ ان کے ایمان نے ان کو ایسی بلند فکری سطح پر پہنچا دیا تھا کہ اس کے بعد ہر چیز انھیں ہیچ دکھائی دیتی تھی۔ وہ حقیقت اعلیٰ میں اتنا زیادہ گم ہو چکے تھے کہ وہ نہ ذاتی تعریف سے خوش ہوتے تھے اور نہ ذاتی تنقید پر غمگین۔ وہ ہر بات پر بات کی حیثیت سے غور کرتے تھے خواہ وہ ان کی پسند کی بات ہو یا ناپسندیدگی کی بات۔ وہ ہر واقعہ کو اس کی اصلیت کے اعتبار سے دیکھتے تھے نہ کہ اِس اعتبار سے کہ وہ ان کے موافق ہے یا ان کے خلاف۔

حمیت جاہلیہ نہیں

قرآن کی سورہ الفتح میں اللہ کی اس خصوصی نصرت کا ذکر ہے جو اصحاب رسول کو حاصل ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ انھوں نے صراط مستقیم کو پالیا۔ وہ دشمنوں کے ہاتھ سے محفوظ ہو گئے۔ زمین پر دین خداوندی کا اظہار ہوا۔ مخالفین کے علی الرغم انھیں فتح مبین حاصل ہوئی۔ اصحاب رسول کا وہ کون سا عمل تھا جس کے نتیجہ میں وہ اللہ کی اس خصوصی رحمت و نصرت کے مستحق قرار پائے، اس کا ذکر سورہ الفتح کی متعدد آیتوں میں موجود ہے۔ ایک آیت یہ ہے :

اذ جعل الذین کفروا فی قلوبھم الحمیۃ حمیۃ الجاھلیۃ فانزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین والزمھم کلمۃ التقوی وکانوا احق بھا واھلھا وکان اللہ بکل شیٔ علیما (الفتح ۲۶)

جب انکار کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی، جاہلیت کی حمیت۔ پھر اللہ نے اپنی طرف سے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اور اللہ نے ان کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا، اور وہ اس کے زیادہ حقدار اور اس کے اہل تھے۔ اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

اس آیت میں اصحاب رسول کے اس رویہ کا ذکر ہے جو انھوں نے واقعۂ حدیبیہ کے موقع پر اختیار کیا۔ اس رویہ کو یک طرفہ صبر، یا اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا کہہ سکتے ہیں۔

۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہنچ کر عمرہ ادا کریں۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تھے کہ مکہ کے مشرکین نے آگے بڑھ کر آپ کو روک دیا اور کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ انھوں نے اس معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔

آپ کو واپسی پر مجبور کرنے کے لیے انھوں نے مختلف قسم کی جارحانہ کارروائیاں کیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ہر موقع پر جوابی جارحیت سے بچتے رہے تاکہ دونوں فریقوں کے درمیان تصادم کی نوبت نہ آئے۔ اس دوران مکہ والوں کی طرف سے مختلف وفد بات چیت کے لیے آتے رہے۔ آخر کار یہ طے پایا کہ دونوں فریقوں کے درمیان لمبی مدت کا ایک معاہدہ ہو جائے

تاکہ دونوں اپنی اپنی حد پر رہیں اور کوئی کسی کے اوپر زیادتی نہ کر سکے۔

حدیبیہ کے واقعہ کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ آخری مرحلہ میں جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو قریش مکہ کے نمائندہ کی طرف سے نہایت اشتعال انگیز رویہ اختیار کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا۔ قریش کے نمائندہ نے کہا کہ ہم اس کو نہیں مانتے، آپ بسمک اللھم لکھئے۔ پھر آپ نے لکھوایا کہ "محمد رسول اللہ کی طرف سے"۔ قریش کے نمائندہ نے اس کو بھی رد کر دیا اور کہا کہ محمد بن عبد اللہ لکھئے۔ یہ باتیں بے حد جگر خراش تھیں مگر صحابہ پر اللہ نے "سکینت" اتاری اور وہ ان شرطوں پر راضی ہو گئے۔

اسی طرح قریش کے نمائندہ نے معاہدہ میں یہ لکھوایا کہ مکہ کا کوئی آدمی اسلام قبول کر کے مدینہ چلا جائے تو آپ اس کو ہماری طرف لوٹانے کے پابند ہوں گے۔ اور اگر مدینہ کا کوئی آدمی ہم پکڑ لیں تو ہم اس کو آپ کی طرف نہیں لوٹائیں گے۔ یہ یک طرفہ شرط توہین کی حد تک ناقابل برداشت تھی مگر اصحاب رسول نے اللہ کی خاطر اس کو بھی برداشت کر لیا۔ معاہدہ کی کتابت کے دوران مکہ کے ایک مسلمان ابو جندل وہاں آ گئے۔ ان کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور ان کا جسم زخمی ہو رہا تھا۔ قریش کے نمائندہ نے کہا کہ معاہدہ کے مطابق ابو جندل کو ہماری طرف واپس کیجئے۔ ابو جندل نے کہا کہ کیا میں کافروں کی طرف لوٹایا جاؤں گا تاکہ وہ مجھے فتنہ میں ڈالیں۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا مگر اپنے کھولتے ہوئے جذبات کو دبا کر اصحاب رسول اس مطالبہ پر بھی راضی ہو گئے۔

یہ صحابہ کی شخصیت کا ایک انوکھا پہلو تھا۔ وہ مسلسل اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہوئے۔ جارحیت کے باوجود انھوں نے جوابی کارروائی نہیں کی۔ عمرہ کو وقار کا مسئلہ بنائے بغیر وہ حدیبیہ سے واپسی پر راضی ہو گئے۔ انھوں نے فریق ثانی کی یک طرفہ شرطوں کو مان کر جنگ کی حالت کو امن کی حالت میں بدل دیا۔

واقعۂ حدیبیہ کے دوران فریق ثانی نے ناقابل برداشت حالات پیدا کیے۔ مگر اصحاب رسول ان کو برداشت کرتے رہے۔ مخالفین کی حمیت جاہلیہ کا جواب انھوں نے اسلامی سکینت کی صورت میں دیا۔ اصحاب رسول کا یہ رویہ اللہ تعالیٰ کو پسند آیا۔ اس نے اپنی اعلیٰ تدبیر سے ایسے راستے کھولے کہ اصحابِ رسول کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ مکہ کو فتح کر لیں۔ یہود کی جڑیں کاٹ دیں، اور پورے عرب میں اسلام کو ایک غالب دین کی حیثیت سے قائم کر دیں۔

وقافاً عند کتاب اللہ

قرآن کی ایک تعلیم وہ ہے جس کو اعراض کہا جاتا ہے۔ یعنی نادان لوگوں کی اشتعال انگیز باتوں پر مشتعل نہ ہونا، حتی کہ اگر اس قسم کی بات کو سن کر غصہ کی آگ بھڑک اٹھے تو اس کو شیطانی وسوسہ سمجھ کر اس سے پناہ مانگنا۔ اور ہر حال میں نظر انداز کرنے کے رویہ پر قائم رہنا۔ اس سلسلہ میں قرآن کا حکم یہ ہے :

خذ العفو وأمر بالعُرف واعرض عن الجاهلين۔ وإما ينزغنّك من الشيطان نزغ فاستعذ بالله انه سميع عليم۔ ان الذين اتقوا اذا مسّهم طائف من الشيطان تذكروا فاذا هم مبصرون۔ واخوانهم يمدونهم فى الغىّ ثم لا يُقصرون (الاعراف ۲۰۲ ـ ۱۹۹)

درگزر کرو اور نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔ اور اگر تم کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آئے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جو لوگ اللہ کا ڈر رکھتے ہیں، جب ان کو شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں۔ اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو لوگ شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں، پھر وہ کمی نہیں کرتے۔

صحیح البخاری، کتاب التفسیر (سورۃ الاعراف) میں باب خذ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاهلين کے تحت ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ یہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے :

عُبید اللہ بن عبد اللہ بن عُتبہ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن عباسؓ نے ان سے بیان کیا۔ عُیَینہ بن حِصن بن حُذیفہ مدینہ آئے اور اپنے بھتیجے الحر بن قیس کے مکان پر ٹھہرے۔ الحر بن قیس ان لوگوں میں سے تھے جن کو عمر اپنے قریب جگہ دیتے تھے۔ وہ ان کے مشیروں میں سے تھے۔ عیینہ نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ اے میرے بھتیجے، تم کو امیر المومنین کے یہاں قربت حاصل ہے۔ میری ان سے ملاقات کرادو۔ اس کے بعد الحر نے عمر سے ملاقات کی اجازت مانگی۔ انھوں نے اجازت دے دی۔

عیینہ جب عمرؓ کے یہاں پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اے خطاب کے بیٹے، خدا کی قسم تم ہم کو نہ کچھ

مال دیتے ہو اور نہ ہمارے درمیان انصاف کرتے ہو۔ عمر یہ سن کر غصہ میں آ گئے اور ان پر اقدام کرنا چاہا۔ اس وقت الحر بن قیس نے ان سے کہا کہ اے امیر المومنین، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے نبی کو یہ حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کو معاف کر دو اور معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو (الاعراف ۱۹۹) اور یہ آدمی بلاشبہ جاہلوں میں سے ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اس کے بعد عمر نے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا، جب کہ انھوں نے قرآن کی یہ آیت ان کے سامنے پڑھ دی۔ اور عمر خدا کی کتاب پر بہت زیادہ رک جانے والے تھے (واللهِ ماجاوزها عمر حين تلاها عليهِ وكانَ وقّافاً عندَ كتابِ الله)

یہ مثال اصحاب رسول کی ایک اہم صفت کو بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ اصحابِ رسول اللہ کی کتاب کے سامنے فوراً ٹھہر جانے والے (وقّافاً عندكتاب الله) تھے۔ خدا کا حکم سامنے آنے کے بعد وہ اپنے ہاتھ اور اپنے پاؤں اور اپنی زبان کو بلا تاخیر روک لینے والے تھے۔ ایک دلیلِ حق ان کے چلتے ہوئے قدموں میں بیڑی ڈال دینے کے لیے کافی تھی، خواہ اس کے پیچھے کوئی محسوس اور مادی طاقت موجود نہ ہو۔

یہ ایک انتہائی نادر صفت ہے جس کا مظاہرہ صحابۂ کرام کے ذریعہ دنیا کے سامنے ہوا۔ جب آدمی کے اندر غصہ بھڑک اٹھے۔ جب اس کے لیے "میں" کا مسئلہ پیدا ہو جائے تو اس وقت وہ کوئی دلیل سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام وہ لوگ تھے جن کو سخت ہیجانی حالت میں بھی قرآن کی ایک آیت خاموش کر دینے کے لیے کافی ہوتی تھی۔

موجودہ دنیا میں خدا کا حکم لفظ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ مگر ایک لفظی حکم سن کر ان کا یہ حال ہوتا تھا گویا کہ خود خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔

جس آدمی سے اختلاف پیدا ہوا ہے اس کے ساتھ عدل کا رویہ برتنا، جس آدمی نے انا پر چوٹ لگائی ہے اس کے مقابلہ میں صبر کر لینا، جس آدمی نے اپنے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے غصہ بھڑکا دیا ہے اس کے خلاف اپنے غصہ کو برداشت کر لینا، جس آدمی نے تحقیر و تذلیل کا انداز اختیار کیا ہے اس سے انتقام نہ لینا، یہ سب اعلیٰ ترین انسانی اوصاف ہیں۔ صحابہ کرام وہ مثالی لوگ ہیں جو ان اوصاف میں کمال کی حد تک پورے اترے۔

سنتِ خداوندی

غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب پر نظر ڈالی تو وہ تین سو سے کچھ زیادہ تھے۔ پھر آپ نے مشرکوں کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار سے زیادہ تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رو ہو کر سجدہ میں گر پڑے۔ اور آپ کے اوپر آپ کی چادر تھی۔ آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے:

اللهم أنجزلي ما وعدتني اللهم إن تهلك هٰذه العصابة من اهل الاسلام فلا تعبد بعد في الارض ابدا

(البدایۃ والنہایۃ ۳/۲۰۵)

اے اللہ، اس وعدہ کو پورا فرما جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔ اے اللہ، اگر تو اہل اسلام کے اس گروہ کو ہلاک کر دے تو اس کے بعد زمین پر کبھی تیری عبادت نہ ہو گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جیش اسامہ کی شام کی طرف روانگی اسلامی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس وقت عرب میں بغاوت پھیل گئی تھی۔ مگر خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق کے اس مومنانہ اقدام نے از سر نو اسلام کا دبدبہ قائم کر دیا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

والله الذي لا اله الا هو، لولا ان ابابكر استخلف ما عبد الله

(البدایۃ والنہایۃ ۶/۳۰۵)

اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اگر (رسول اللہ کے بعد) ابوبکر کو خلیفہ نہ بنایا جاتا تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔

یہ دونوں قول بظاہر بہت عجیب ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ نے جب یہ کہا تو سننے والے بولے کہ اے ابوہریرہ چپ رہو (مہ یا اباھریرۃ) مگر یہ الفاظ عین حقیقت واقعہ کا اظہار تھے۔

اصل یہ ہے کہ اس قول کا تعلق اللہ کی سنت سے ہے نہ کہ اللہ کی قدرت سے۔ اللہ کے لیے بلاشبہہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہواؤں کے ذریعہ تمام مشرکوں کو ہلاک کر دے اور ایک لفظ کُن کے ذریعہ تمام انسانوں کو اپنا عبادت گزار بنا دے۔ مگر موجودہ امتحان کی دنیا میں خود اللہ کے اپنے فیصلہ کی بنا پر ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں سارا کام اسباب وعلل کے پردہ میں انجام دیا جاتا ہے ـــــــ مذکورہ قول

کا مطلب یہ ہے کہ قانونِ الٰہی کے تحت ایسا نہیں ہوگا، نہ یہ کہ باعتبار امکان ایسا نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دعا کے وقت جو الفاظ نکلے، یا حضرت ابوہریرہ نے جو بات کہی، ان سے صحابہ کے گروہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ صحابہ عام قسم کے انسان نہ تھے۔ یہ ایک منفرد ٹیم تھی جو عرب کے صحرا میں خصوصی اہتمام کے ذریعہ تیار کی گئی تھی۔ اگر یہ انسان ضائع ہو جاتے تو دوبارہ تاریخ وہیں واپس چلی جاتی جہاں وہ صحابہ کے دور سے پہلے تھی۔

قرآن کے مطابق، اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ دنیا سے فتنہ ختم ہو، اور دینِ خداوندی کا عالمی اظہار ہو۔ یعنی دنیا سے شرک کے غلبہ کا دور ختم ہو جائے، اور توحید کے غلبہ کا دور قائم ہو جائے۔ یہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ کیونکہ اس کو مکمل طور پر اسباب کے دائرہ میں انجام دینا تھا۔ یہ گویا ایک خدائی واقعہ کو انسانی سطح پر ظہور میں لانا تھا۔

اس کے لیے ایسے حقیقت شناس انسان درکار تھے جو ایک ہم عصر پیغمبر کو پہچان کر ہمہ تن اس کے ساتھی بن جائیں۔ اس کے لیے ایسے پختہ کردار لوگ مطلوب تھے جو ایک بار عہد کرنے کے بعد پھر کبھی اس سے نہ پھریں، خواہ اس راہ میں ان کا سب کچھ لٹ جائے۔ اس کے لیے ایسا بامقصد گروہ درکار تھا جو مقصدِ حق کے سوا ہر دوسری چیز کو ثانوی حیثیت دے دے۔ اس کے لیے ایسے بہادر انسانوں کی ضرورت تھی جو چٹانوں سے ٹکرا جائیں اور اس وقت تک نہ رکیں جب تک اپنے مشن کو مکمل نہ کرلیں۔ اس کے لیے ایسے اعلیٰ ظرف افراد درکار تھے جو اختلاف کے باوجود متحد رہیں اور شکایت کے باوجود اپنا تعاون ختم نہ کریں۔

اصحابِ رسول اسی قسم کے نادر انسان تھے۔ وہ خاص اسی مقصد کے لیے ڈھائی ہزار سالہ تربیتی کورس کے تحت بنائے گئے تھے۔ اگر ان کے ذریعہ مذکورہ مشن اپنی تکمیل تک نہ پہنچتا تو دوبارہ ایک اور ابراہیمی شخصیت کی ضرورت ہوتی اور تاریخ کو پھر ڈھائی ہزار سال تک انتظار کرنا پڑتا تاکہ مطلوبہ نوعیت کی ایک ٹیم بنے اور اس کو استعمال کر کے خدا کے دین کا عالمی اظہار کیا جائے۔

اصحابِ رسول انسانی تاریخ کے وہ منتخب افراد تھے جن کی ذات پر انسانی ارادہ اور خدائی منصوبہ دونوں ایک ہو گیا تھا۔ ایسے افراد تاریخ کے ہزاروں سال کے عمل کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اگر وہ اپنے مقصد کی تکمیل سے پہلے ختم ہو جائیں تو تاریخ کا سفر رک جائے گا۔

یس کو حذف کرنا

غزوۂ بدر ۲ھ میں پیش آیا۔ اچانک صورت حال کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین مکہ کے مقابلہ کے لیے نکلنا پڑا۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ کیونکہ اس مقابلہ کے لیے مہاجرین کی تعداد ناکافی تھی، انصار کا معاملہ یہ تھا کہ اپنی بیعت کی رو سے وہ صرف مدینہ کے اندر آپ کی حمایت کے پابند تھے۔ مدینہ سے باہر نکل کر دشمنوں سے مقابلہ کرنا ان کے واجبات بیعت میں شامل نہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اے لوگو، مجھے مشورہ دو۔ اس کے جواب میں مہاجرین میں سے کچھ لوگوں نے اٹھ کر آپ کو اپنی پوری حمایت کا یقین دلایا۔ آپ نے کئی بار کہا کہ اے لوگو مجھے مشورہ دو، اور ہر بار مہاجرین اٹھ کر جواب دیتے رہے۔

آخر انصار کو احساس ہوا کہ غالباً آپ ہمارا خیال جاننا چاہتے ہیں۔ یہ احساس ہوتے ہی فوراً ان کے سردار اٹھے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، شاید آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ انھوں نے کہا کہ اب ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ہم آپ کو اکیلا چھوڑ دیں۔ اے خدا کے رسول، آپ جو چاہتے ہیں، اس کو کر گزریئے۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم اگر آپ یہاں سے روانہ ہوں اور چلتے چلتے سمندر میں داخل ہو جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ سمندر میں داخل ہو جائیں گے۔ ہم میں سے کوئی شخص پیچھے نہ رہے گا (البدایہ والنہایہ ۳/۶۳-۲۶۲)

اسی طرح صلح حدیبیہ (۶ھ) کے بعد جب امن ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ اطراف عرب کے حاکموں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کریں۔ آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم میں سے کچھ لوگوں کو دعوتی پیغام کے ساتھ عجمی بادشاہوں کی طرف بھیجوں۔ پس تم لوگ میرے ساتھ اختلاف نہ کرو جس طرح بنو اسرائیل نے عیسیٰ بن مریم کے ساتھ اختلاف کیا۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، ہم آپ سے کسی معاملہ میں کبھی اختلاف نہ کریں گے۔ آپ ہم کو حکم دیجئے اور ہم کو جہاں چاہے وہاں بھیجئے (البدایہ والنہایہ ۴/۲۶۸)

یہ واقعات اصحاب رسول کی ایک نہایت اہم خصوصیت کو بتا رہے ہیں۔ یہ خصوصیت ہے ـــــ

"میں" کو حذف کرکے کسی شخص کا ساتھ دینا۔

ساری تاریخ کا یہ تجربہ ہے کہ لوگ ابتدائی جذبہ کے تحت کسی کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں مگر جب ناموافق باتیں پیش آتی ہیں تو وہ فوراً اختلاف کرکے الگ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اصحاب رسول (انصار) بدر کی لڑائی کے موقع پر یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے داخلی دفاع کا عہد کیا ہے، ہم نے خارجی مقابلہ کا آپ سے عہد نہیں کیا (البدایہ والنہایہ ۲۶۲/۳) مگر انھوں نے اس پہلو کو نظر انداز کرکے آپ کا ساتھ دیا۔ جب کہ یہ ساتھ دینا بظاہر موت کے غار میں کودنے کے ہم معنی تھا۔ کیونکہ دشمن کے پاس ایک ہزار افراد کی طاقتور اور مسلح فوج تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ۳۱۳ آدمیوں کی نسبتاً کمزور جماعت۔

اسی طرح حکمرانوں کے نام دعوتی وفود بھیجنے کے سلسلہ میں وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ ابھی تو عرب میں بھی اسلام پوری طرح نہیں پھیلا۔ ابھی داخلی استحکام کے اعتبار سے ہمارے سامنے بے شمار مسائل ہیں۔ ایسی حالت میں بیرون ملک وفود بھیجنے کا کیا موقع ہے۔

مگر اصحاب رسول نے اس قسم کے ہر خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔ انھوں نے عذر کو عذر نہیں بنایا۔ انھوں نے "میں" کو حذف کرکے آپ کا ساتھ دیا۔ انھوں نے اجتماعی مفاد کے لیے انفرادی تقاضوں کو نظر انداز کر دیا۔ اختلاف اور شکایت کے ہر معاملہ کو اللہ کے حوالے کرکے وہ اس پر راضی ہو گئے کہ وہ رسول خدا کی قیادت کے تحت اسلام کی خدمت کرتے رہیں، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جائیں۔

ایک مفکر نے کہا کہ اگر تمہارے پاس بہترین عذر ہے تب بھی تم اس کو استعمال نہ کرو:

If you have a good excuse don't use it.

مغربی مفکر نے یہ بات بطور آئیڈیل کہی تھی۔ مگر اس آئیڈیل کو پہلی بار جن لوگوں نے عملی واقعہ بنایا وہ اصحاب رسول تھے۔ انھوں نے اختلاف کو نظر انداز کرکے اتحاد کیا۔ انھوں نے شکایتوں کو بھلا کر ساتھ دیا۔ انھوں نے اپنی ذات کو حذف کرکے اپنے آپ کو اجتماعیت سے وابستہ کیا۔ وہ اپنے جذبات کو دبا کر مقصد کی تکمیل میں لگے رہے۔ انھوں نے پانے کی امید کے بغیر دیا۔ انھوں نے کریڈٹ لینے کے خیال کو اپنے ذہن سے نکال کر قربانیاں دیں۔ عام لوگ جس حد پر رک جاتے ہیں ان حدوں پر رکے بغیر وہ آگے بڑھ گئے۔

اصحاب رسولؐ

خالد بن ولید اور عبد الرحمٰن بن عوف کے درمیان کسی بات پر اختلاف پیدا ہوا۔ اس موقع پر حضرت خالد کی زبان سے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے لیے کچھ سخت کلمات نکل گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا :

لا تَسبُّوا اصحابی ، لا تسبوا اصحابی۔ فوالذی نفسی بیدہ لو انَّ احدکم اَنفقَ مثلَ اُحُدٍ ذَهَباً ما بلغ مُدَّ احدِهم ولا نصیفه (مسلم ، باب تحریم سب الصحابہ)

میرے اصحاب کو برا نہ کہو ، میرے اصحاب کو برا نہ کہو ، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ، اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کر دے تو وہ ان کے ایک مد یا اس کے نصف کے برابر بھی نہیں پہنچے گا۔

صحابہ کرام کی وہ کیا خاص صفت تھی جس کی بنا پر انھیں یہ امتیازی مقام ملا۔ قرآن کے لفظوں میں وہ تھی ــــــ مشکل گھڑیوں میں اتباع کرنا (التوبہ ۱۱۷) فتح کا دور آنے سے پہلے قربانیاں پیش کرنا (الحدید ۱۰)

آج پیغمبر اسلام کی رسالت ایک ثابت شدہ رسالت ہے۔ آپ کا نام بلند ترین عظمت کا نشان بن چکا ہے۔ آج آپ کے نام پر اٹھنے والے کو ہر قسم کی عزت اور ہر قسم کے مادی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایسا آدمی فوراً قوم کے درمیان قائد کا مقام پالیتا ہے۔ مگر جس وقت صحابہ کرام نے آپ کا ساتھ دیا ، اس وقت یہ تمام امکانات ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ ابھی واقعہ بن کر لوگوں کے سامنے نہیں آئے تھے۔

صحابہ کرام کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حال کے پیغمبر کو اس کے مستقبل کی عظمتوں کے ساتھ دیکھا۔ انھوں نے بظاہر ایک عام انسان کو اس کے پیغمبرانہ جوہر کے ساتھ دریافت کیا۔ انھوں نے اس وقت پیغمبر کا ساتھ دیا جب کہ پیغمبر کا ساتھ دینے کا مطلب پوری قوم میں نکو بن جانا تھا۔ جب پیغمبر کی حمایت کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آدمی اپنی قوم اور اپنی برادری کی حمایت سے محروم ہو جائے۔

صحابہ کرام کا ایمان ایک دریافت تھا۔ آج کے مسلمانوں کا ایمان ایک قومی تقلید ہے۔ ان

دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آسمان اور زمین میں۔

لبید بن ربیعہ (م ۴۱ھ) عرب کے بڑے شاعروں میں سے تھے۔ وہ اصحاب معلقات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے شاعری کیوں چھوڑ دی۔ انھوں نے جواب دیا : ابعد القرآن (کیا قرآن کے بعد بھی)

حضرت لبید کا یہ قول آج بظاہر کوئی غیر معمولی قول نظر نہیں آتا۔ کیونکہ آج لوگوں کے ذہنوں پر قرآن کی عظمت اتنی زیادہ چھائی ہوئی ہے کہ یہ بالکل ایک فطری بات معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص قرآن کے اعلیٰ ادب سے متاثر ہو کر شاعری کو چھوڑ دے۔ مگر اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ حضرت لبید نے ایسا کیا، اس وقت یہ ایک انتہائی غیر معمولی بات تھی۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں قرآن کی حیثیت ایک عام کتاب کی سی تھی۔ اس وقت وہ لوگوں کے درمیان ایک نزاعی کتاب بنی ہوئی تھی، اس وقت تک قرآن کی پشت پر وہ واقعاتی عظمتیں اور تاریخی صداقتیں جمع نہیں ہوئی تھیں جو آج اس کی پشت پر جمع ہو چکی ہیں۔

صحابہ کرام وہ لوگ تھے جنھوں نے دور عظمت سے پہلے قرآن کو پہچانا۔ جنھوں نے اس وقت اپنے آپ کو اسلام کے لیے وقف کیا جب کہ اسلام ہر قسم کے مادی مفادات سے خالی تھا۔ جو اس وقت پیغمبر کے حامی بنے جب کہ پیغمبر کے نام پر کسی قسم کی قیادت نہیں ملتی تھی۔ جنھوں نے محرومی کی قیمت پر دین خداوندی کو اپنایا اور بے قدر ہو کر اس کی کامل قدر دانی کی۔ انھوں نے "بے اسلام" میں اسلام کی تصویر دیکھی۔

اصحاب رسول کا امتیازی مقام ان کے امتیازی عمل کی بنا پر ہے۔ ان کا یہ امتیازی عمل، ایک لفظ میں، یہ تھا کہ انھوں نے ساتھ نہ دینے والے حالات میں ساتھ دیا۔

اصحاب رسول نے بے اعترافی کے حالات میں اعتراف کیا۔ انھوں نے ناقدری کے حالات میں قدر دانی کی۔ انھوں نے التباس کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو پہچانا۔ انھوں نے بے عظمت چیز کو عظمت کے روپ میں دیکھا۔ انھوں نے وہاں بینا ہونے کا ثبوت دیا جہاں لوگ اندھے بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے وہاں سچائی کی آواز سنی جہاں کان والوں کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

نہیں میں ہے کو دیکھنا

خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ۱۴ھ میں ایران فتح ہوا۔ اس وقت ایران کا بادشاہ یزدگرد اور اس کا سپہ سالار رستم تھا۔ سعد بن ابی وقاصؓ کی قیادت میں جو مسلم لشکر ایران میں داخل ہوا، اس کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار سے کچھ زیادہ تھی، جب کہ رستم کی فوج کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔ اس کے باوجود اہلِ اسلام کی فتوحات کی خبریں سن کر ایرانی حکمراں خائف تھے۔ انھوں نے سعد بن ابی وقاصؓ کو پیغام بھیجا کہ بات چیت کے لیے اپنا سفیر روانہ کریں۔

اس سلسلہ میں صحابۂ کرام کے کئی وفد مدائن گئے اور رستم اور یزدگرد سے بات کی۔ ان لوگوں نے انتہائی بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔ مثلاً ربعی بن عامر ایرانی دربار میں داخل ہوئے تو وہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تخت تک چلے گئے۔ انھوں نے اپنا نیزہ قالین میں گاڑ کر اس سے اپنے گھوڑے کو باندھ دیا۔ انھوں نے ایرانی حکمرانوں سے نہایت بے باکی کے ساتھ گفتگو کی جس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

آخری مرحلہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایرانی شہنشاہ یزدگرد ان کی باتیں سن کر بگڑ گیا۔ اس نے غصہ ہو کر مسلم وفد سے کہا کہ اگر یہ دستور نہ ہوتا کہ سفیر قتل نہ کیے جائیں تو میں تم لوگوں کو قتل کر دیتا۔ تمہارے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔ تم اپنے سردار (سعد بن ابی وقاص) کے پاس جاؤ اور ان کو بتا دو کہ میں رستم کو ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ تمہاری طرف بھیج رہا ہوں جو تم لوگوں کو قادسیہ کی خندق میں دفن کر دے گا۔

پھر یزدگرد نے پوچھا کہ تمہارے وفد کا سب سے معزز شخص کون ہے۔ تاکہ میں اس کے سر پر مٹی کا ٹوکرا رکھ کر اس کو یہاں سے واپس کروں۔ لوگ اس سوال پر چپ رہے۔ آخر وفد کے ایک عام رکن عاصم بن عمرو کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ تم جس کو چاہتے ہو وہ شخص میں ہوں۔ تم مٹی میرے سر پر رکھ دو۔ یزدگرد نے لوگوں سے پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں وہ ہمارے معزز شخص ہیں۔

اس کے بعد یزدگرد نے مٹی سے بھرا ہوا ایک ٹوکرا منگایا اور اس کو ان کے سر پر رکھ دیا۔ اور حکم دیا کہ ان لوگوں کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ عاصم بن عمرو مٹی کا ٹوکرا لیے ہوئے محل کے باہر آئے۔ اس کو انھوں نے اپنی سواری پر رکھا اور تیزی سے روانہ ہو کر وہاں پہنچ گئے جہاں سعد بن ابی وقاص ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے خیمہ میں داخل ہو کر مٹی کا ٹوکرا سردار کے سامنے رکھ دیا اور ان کو واقعہ بتایا۔ راوی کہتے ہیں:

فقال : اَبشروا فقد واللّٰہ اعطانا اللّٰہ اقالید ملکھم وتفاءلوا بذلك اخذ بلادھم۔ ثم لم یزل امر الصحابۃ یزداد فی کل یوم علواً وشرفاً ورفعۃ وینحط امر الفرس سفلا وذلا وھنا

سعد بن ابی وقاص نے کہا کہ تم کو خوش خبری ہو۔ خدا کی قسم، اللہ نے ہمیں ان کے اقتدار کی کنجیاں دیدیں۔ اور مٹی سے انھوں نے نیک فال لیا کہ ان کا ملک ہمیں حاصل ہوگا۔ اس کے بعد صحابہ ہر روز بلندی اور شرف اور رفعت میں بڑھتے رہے اور ایرانی پستی اور ذلت اور ناکامی میں گرتے چلے گئے۔

مسلم وفد کو محل سے نکال دینے کے بعد یزدگرد نے یہ واقعہ رستم کو بتایا۔ اور مٹی کا ٹوکرا سر پر رکھنے کے معاملہ کو ان کی حماقت قرار دیا۔ رستم نے کہا کہ نہیں، وہ آدمی احمق نہیں تھا، خدا کی قسم وہ لوگ تو ہمارے ملک کی کنجیاں اٹھا لے گئے (واللّٰہ ذھبوا بمفاتیح ارضنا) البدایہ والنہایہ ۷/۴۳-۴۲

سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے حالات میں گھر کر سوچنا، دوسرا ہے حالات سے اوپر اٹھ کر سوچنا۔ ایک ہے نفرت اور محبت جیسے جذبات کے تحت رائے قائم کرنا، دوسرا ہے نفرت اور محبت جیسے جذبات سے بلند ہو کر رائے قائم کرنا۔ عام طور پر لوگ حالات سے متاثر ہو کر سوچتے ہیں، وہ فوری جذبات کے زیر اثر اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ مگر صحابہ کرام ان چیزوں سے اوپر تھے۔ وہ حالات اور جذباتی محرکات سے اوپر اٹھ کر خود اپنے فیصلہ کے تحت یہ طے کرتے تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

صحابہ کی اس صفت نے ان کو بے پناہ حد تک طاقت ور بنا دیا تھا۔ انھیں مٹی دی جاتی اور وہ اس کو فتح کے تاج کی طرح قبول کر لیتے تھے۔ جس واقعہ کو لوگ بے عزتی کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں، اس سے وہ عزت کا مفہوم نکال لیتے تھے۔ جو تجربہ لوگوں کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے، اس سے وہ اپنے لیے یقین کی غذا حاصل کر لیتے تھے۔

صحابہ انسانی تاریخ کے وہ انوکھے افراد تھے جو عُسر میں یُسر کا راز پا لیتے تھے۔ جو ناکامی سے کامیابی کو نچوڑتے تھے۔ جو شکست کے واقعہ کو فتح کے واقعہ میں تبدیل کر دیتے تھے۔ جو مایوسی کی تاریکی میں امید کی روشنی دیکھ لیتے تھے۔ رکھنے والا ان کے سر پر مٹی کا ٹوکرا رکھتا تھا، اور وہ سمجھتے کہ اس نے خود ہی اپنا ملک ہمارے حوالے کر دیا ہے۔

بلند نظری

۱۷ھ کے آخر میں شام اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں طاعون کی وبا پھیلی۔ ۱۸ھ میں یہ وبا نہایت شدید ہوگئی۔ اس وقت شام کی مسلم فوجوں کے سپہ سالار ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ مسلمان جہاں ہیں وہیں ٹھہرے رہیں۔ حضرت ابو عبیدہ اس مرض میں مبتلا ہوئے اور اسی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ان کے بعد معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اس علاقہ کی مسلم فوجوں کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔ ان کی پالیسی بھی وہی رہی جو حضرت ابو عبیدہ کی پالیسی تھی۔ حضرت معاذ بن جبل اس مرض میں مبتلا ہوئے اور ان کا بھی اسی مرض میں انتقال ہوگیا۔

اس کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس علاقہ کی مسلم افواج کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنی پالیسی بدلی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنی موجودہ جگہ کو چھوڑ دیں۔ مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں :

فلما مات استخلف على الناس عمرو بن العاص فقام فيهم خطيبا فقال - ايها الناس، إن هذا الوجع اذا وقع فانما يشتعل اشتعال النار فتحصنوا منه في الجبال - فقال ابو وائل الهذلي - كذبت والله - لقد صحبت رسول الله صلى الله عليه وسلم وانت شر من حماري هذا - فقال والله ما ارد عليك ما تقول

(البداية والنهاية ۷/۹۰)

پھر جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو عمرو بن العاص لوگوں کے اوپر سردار مقرر ہوئے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر لوگوں کے درمیان تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اے لوگو، یہ بیماری جب آتی ہے تو وہ آگ کی طرح بھڑک اٹھتی ہے۔ پس تم لوگ پہاڑوں میں اپنے آپ کو اس سے محفوظ کر لو۔ یہ سن کر ابو وائل ہذلی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ خدا کی قسم تم نے جھوٹ کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی ہے۔ اور تم میرے اس گدھے سے بھی زیادہ برے ہو۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ خدا کی قسم تم جو کہہ رہے ہو اس کا میں کوئی جواب نہیں دوں گا۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ صحابۂ کرام کے درمیان کتنی سخت تنقیدوں کا رواج تھا۔ ان کے

یہاں اظہار رائے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ لوگ نہ صرف آپس میں ایک دوسرے پر تنقید کرتے تھے بلکہ حاکموں اور سرداروں کے اوپر بھی آزادانہ تنقید کی جاسکتی تھی۔ اور نہ حاکم اس کو برا مانتا تھا اور نہ عام لوگ۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب رسول کتنے زیادہ بڑے دل والے لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اتنی زیادہ بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ کیونکہ اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ ——— جتنا بڑا دل، اتنی ہی بڑی کامیابی۔

اس دنیا میں خود تخلیقی فطرت کے تحت ایسا ہے کہ لوگوں کی سوچ الگ الگ ہوتی ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ باصلاحیت ہو اتنا ہی زیادہ وہ منفرد انداز سے سوچتا ہے۔ ایسی حالت میں کوئی طاقتور ٹیم بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد میں تنقید کو برداشت کرنے کا مادہ ہو۔ خاص طور پر سربراہ کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ سخت ترین تنقید کو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سنے۔ وہ اختلاف اور اتفاق سے اوپر اٹھ کر لوگوں کے ساتھ معاملہ کرے۔

جو لوگ اپنے اندر یہ صفت رکھتے ہوں، وہی اپنے گرد اعلیٰ انسانوں کی ٹیم جمع کر سکتے ہیں اور ان کو ساتھ لے کر کوئی بڑا کام انجام دے سکتے ہیں۔ جن لوگوں کے اندر یہ صفت نہ ہو ان کے گرد صرف سطحی اور خود غرض اور منافق قسم کے لوگ جمع ہوں گے، اور سطحی اور خود غرض اور منافق قسم کے لوگوں کی جماعت اس دنیا میں کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتی۔

اصحاب رسول وہ بلند نظر اور اعلیٰ فطرت انسان تھے جن کو نہ تعریف خوش کرتی تھی اور نہ تنقید کو سن کر وہ برہم ہوتے تھے۔ خدا کو انھوں نے ایسی عظیم ترین حقیقت کے طور پر پایا تھا کہ اس کے بعد ان کے لیے ہر دوسری چیز چھوٹی ہو گئی تھی۔ وہ برتر خدا میں جینے والے لوگ تھے۔ اس لیے تنقید و اختلاف جیسی چیزیں ان کے ذہنی سکون کو برہم نہیں کرتی تھیں۔

اصحاب رسول کا ایک ایک شخص ہیرو تھا۔ مگر ان کی یہی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ سب مل کر ایک مستحکم دیوار بن گئے۔ ان کے ساتھ ہر قسم کی ناخوش گوار باتیں پیش آئیں، مگر وہ ان کے اتحاد کو توڑ نہ سکیں۔ وہ ان کے استحکام میں رخنہ ڈالنے والی ثابت نہیں ہوئیں۔ اس قسم کی تمام خرابیاں اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، اور اختلاف کو پہلے ہی وہ اپنے لیے ایک ناقابل لحاظ چیز بنا چکے تھے۔

بے لاگ انصاف

اسلام کے چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے :

علی بن ابی طالبؓ جب خلیفہ تھے ، ایک روز وہ بازار کی طرف نکلے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک نصرانی وہاں ایک زرہ بیچ رہا ہے۔ حضرت علی نے پہچان لیا کہ یہ ان کی وہی زرہ ہے جو اس سے پہلے کھو گئی تھی۔ انھوں نے نصرانی سے کہا کہ یہ زرہ میری ہے۔ نصرانی نے انکار کیا۔ حضرت علی نے کہا کہ پھر مسلمانوں کے قاضی کے پاس چلو ، وہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔

اس وقت کوفہ میں مسلمانوں کے قاضی شُریح بن الحارث تھے۔ وہ ۷۷ھ تک اس عہدہ پر رہے۔ چنانچہ دونوں وہاں گئے۔ جب قاضی شریح نے امیر المومنین کو دیکھا تو وہ اپنے مقام سے اٹھ گئے اور حضرت علی کو اپنے مقام پر بٹھایا۔ اور قاضی شریح خود ان کے سامنے نصرانی کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

حضرت علی نے کہا کہ اے شریح ، میرے اور اس کے درمیان فیصلہ کرو۔ شریح نے کہا کہ اے امیر المومنین ، آپ کیا کہتے ہیں۔ حضرت علی نے کہا کہ یہ میری زرہ ہے۔ کچھ دن پہلے وہ مجھ سے کھو گئی تھی۔ پھر قاضی شریح نے نصرانی سے کہا کہ تم کیا کہتے ہو۔ نصرانی نے کہا کہ امیر المومنین جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ یہ زرہ میری زرہ ہے۔

قاضی شریح نے حضرت علی سے کہا کہ کیا آپ کے پاس کوئی دلیل (بینہ) ہے۔ کیونکہ دلیل اور شہادت کے بغیر آپ زرہ کو اس کے ہاتھ سے نہیں لے سکتے۔ حضرت علی نے کہا کہ شریح نے سچ کہا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی طرف سے دو گواہ پیش کیے۔ ایک اپنے لڑکے حسن کو ، اور دوسرے اپنے غلام قنبر کو۔ قاضی شریح نے کہا کہ حسن کے علاوہ کوئی اور گواہ لائیے۔ حضرت علی نے کہا کہ کیا تم حسن کی شہادت کو رد کرتے ہو۔ کیا تم کو یہ حدیث نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حسن اور حسین جنّت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔

قاضی شریح نے کہا کہ قنبر کی گواہی میں قبول کرتا ہوں مگر حسن کی گواہی میں قبول نہیں کر سکتا۔

کیونکہ خود آپ سے میں نے یہ سنا ہے کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں۔ اس کے بعد حضرت علی نے قاضی شریح کے فیصلہ کو قبول کر لیا۔

اس واقعہ کا نصرانی کے اوپر بہت اثر ہوا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم اے امیر المومنین، یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ آپ کے اونٹ سے وہ گر گئی تھی۔ پھر میں نے اس کو اٹھا لیا۔ پھر نصرانی نے کہا کہ اسلام کی یہ بات بہت عجیب ہے کہ امیر المومنین خود میرے ساتھ قاضی کے پاس آئے۔ قاضی اس کے خلاف فیصلہ کرے اور وہ اس فیصلہ پر راضی ہو جائے۔

اس کے بعد نصرانی نے کلمۂ اسلام پڑھ کر کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ حضرت علی نے کہا کہ جب تم نے اسلام قبول کر لیا تو یہ زرہ اب تمہاری ہے۔ اسی کے ساتھ اس کو سات سو درہم اور ایک گھوڑا دیا۔ اس کے بعد وہ شخص حضرت علی کا ساتھی بن گیا۔ یہاں تک کہ جنگ صفین میں لڑتے ہوئے شہید ہوا (حیاۃ الصحابہ ۱/۳۵-۲۳۴)

قدیم زمانہ میں ہمیشہ حکمراں کو قانون سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔ یہ ناقابل تصور تھا کہ ایک حکمراں کو عدالت میں معمولی انسان کی طرح کھڑا کیا جا سکے۔ موجودہ جمہوری زمانہ میں اگرچہ خالص قانونی اعتبار سے حکمراں اور عوام کو برابر سمجھا جاتا ہے۔ تاہم آج بھی عملی طور پر یہ ناممکن ہے کہ ایک برسر اقتدار شخص کو عدالت میں بلایا جائے اور جج کی کرسی پر بیٹھنے والا آدمی عام انسانوں کی طرح اس کے اوپر قانون کا نفاذ کرے۔

پوری معلوم تاریخ میں یہ صرف اصحاب رسول ہیں جنھوں نے یہ استثنائی مثال قائم کی کہ ان کے ایک حاکم کو عدالت میں لایا جائے اور ایک عام انسان کی طرح مقدمہ چلا کر اس کے معاملہ کا فیصلہ کیا جائے۔

انسانی ضمیر یہ چاہتا ہے کہ ہر آدمی یکساں طور پر قانون کے سامنے جواب دہ ہو۔ مگر انسانی ضمیر کی یہ طلب حقیقی معنوں میں صرف ایک ہی دور میں عملی واقعہ بن سکی، اور وہ بلاشبہہ اصحاب رسول کا دور ہے۔

بادشاہ پر یکساں انصاف کی بات اصحاب رسول سے پہلے صرف افسانہ کی کتابوں میں تھی۔ اصحاب رسول نے اس کو افسانہ سے اٹھا کر حقیقی زندگی کا واقعہ بنا دیا۔

سیاسی بے غرضی

۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آپ کے بعد مسلمانوں کا امیر کون ہو۔ اس وقت مدینہ میں مسلمانوں کے دو بڑے گروہ تھے۔ مہاجرین اور انصار۔ انصار کا خیال تھا کہ امارت ان کا حق ہے۔ کیونکہ رسول اور مہاجر صحابہ کو جب مکہ چھوڑنا پڑا تو انصار نے اس پورے قافلہ کو اپنے شہر مدینہ میں جگہ دی۔ وہ ہر اعتبار سے ان کے مددگار بن گئے۔ ان کی حیثیت اس وقت اگرچہ ایک "لٹے ہوئے قافلہ" کی تھی مگر انصار نے ان کی عزت اور احترام میں کوئی کمی نہیں کی۔ انصار کی مسلسل حمایت اور قربانی کے ذریعہ اسلام مضبوط ہوا اور اس کی شاندار تاریخ بنی۔ ان اسباب کی بنا پر انصار کا یہ خیال تھا کہ امارت ان کا حق ہے۔ انصار کے لوگ اس معاملہ کو طے کرنے کے لیے اپنے قبیلہ کی چوپال (سقیفہ بنی ساعدہ) میں جمع ہوئے۔

یہاں تک معاملہ پہنچ چکا تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے مہاجرین کو خبر ہوئی۔ وہ فوراً سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے۔ کیونکہ اس معاملہ میں معمولی غفلت بھی نہایت دور رس نتیجہ پیدا کرنے کا سبب بن سکتی تھی۔ انصار کا یہ خیال درست تھا کہ ان کو مخصوص فضیلتیں حاصل ہیں۔ مگر دینی فضیلت ایک الگ چیز ہے اور سیاسی قیادت اس سے مختلف دوسری چیز۔ دینی فضیلت کسی بھی شخص کے اندر ہو سکتی ہے۔ مگر سیاسی قیادت صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے حق میں قیادت کے تاریخی اسباب جمع ہوئے ہوں۔

حضرت ابوبکر سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے۔ تو وہاں انصار کے بزرگ قائد سعد بن عبادہ بھی موجود تھے۔ حاضرین کا رجحان یہ تھا کہ سعد بن عبادہ کو امیر المومنین بنایا جائے۔ حضرت ابوبکر نے سعد بن عبادہ سے کہا کہ کیا تم کو یاد نہیں کہ تمہاری موجودگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ : قریش ولاة هذا الامر۔ اور الناس تبع لقریش۔ یعنی عرب میں سیاسی سرداری صرف قریش ہی کر سکتے ہیں۔ عرب کے لوگ ان کے سوا کسی اور کی ماتحتی قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے۔ حضرت ابوبکر نے انصار سے کہا کہ تمہاری دینی خدمت اور اسلام کے اندر تمہارا مقام مسلّم ہے۔ لیکن عرب کے لوگ قریش کی قیادت کے سوا کسی اور کی قیادت سے آشنا نہیں ہیں۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تقریر کے بعد تمام انصار اس پر راضی ہو گئے کہ

مہاجرین (قریش) میں سے کسی شخص کو امیر بنایا جائے۔ یہ ایک بے حد انقلابی فیصلہ تھا جس کی معلوم انسانی تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔

انصار پہلے اس معاملہ کو صرف "مدینہ" کے حالات کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے، اب انھوں نے اس معاملہ کو پورے ملک کے نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ ان کے بے لاگ ذہن اور حقیقت پسندانہ مزاج نے انھیں بتایا کہ مدینہ میں اگرچہ مقامی طور پر انصار کو سیادت حاصل ہے مگر وسیع تر سطح پر پورا عرب کسی قریشی سردار ہی کی سرداری قبول کر سکتا ہے۔ انصار نے اس معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ یا سیاسی حق تلفی کا مسئلہ نہیں بنایا۔ چنانچہ انھوں نے فوراً حضرت ابو بکر کی تجویز کو مان لیا۔

عرب میں اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوا اس میں بلاشبہ انصار کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اس میں ان کی عظیم قربانیاں شامل تھیں۔ ایسی حالت میں یہ عین فطری تھا کہ غلبہ حاصل ہونے کے بعد انصار یہ چاہیں کہ امیر المومنین کا عہدہ ان کے پاس ہو یا کم از کم اقتدار میں قابلِ لحاظ حد تک انھیں شریک کیا جائے۔ چنانچہ ایک انصاری نے جب دیکھا کہ امیر کا عہدہ انصار کو دینے پر اختلاف ہے تو اس نے کہا کہ ایک امیر تم میں سے ہو اور ایک امیر ہم میں سے (منا امیر ومنکم امیر) مگر وسیع تر مصالح کو جاننے کے بعد تمام انصار مہاجرین (قریش) کی امارت پر راضی ہو گئے۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ سیاسی قیادت کا عہدہ یک طرفہ طور پر مہاجرین کو دے دیا جائے، اور انصار کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

کسی نظام کو چلانے کے لیے اس قربانی کی بے حد اہمیت ہے۔ مگر یہ قربانی صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں جو اپنے اندر سیاسی بے غرضی کی صفت رکھتے ہوں۔ انصار نے اس نادر صفت کا ثبوت دیا۔ اگر ان کے اندر سیاسی بے غرضی کی یہ غیر معمولی صفت نہ ہوتی تو پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد انصار اور مہاجرین میں ٹکراؤ شروع ہو جاتا۔ اسلام کی تاریخ بننے سے پہلے ہی مدینہ میں دفن ہو جاتی۔ مگر انصار نے اپنے سیاسی حق سے یک طرفہ طور پر دستبردار ہو کر اسلام کی تاریخ کو آگے بڑھا دیا۔

تحریک اپنے آغاز میں ہو تو اس میں عہدہ کی کشش نہیں ہوتی۔ مگر جب وہ کامیابی کے مرحلہ میں پہنچتی ہے تو اس میں عہدہ اور اقتدار کی کشش شامل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر تحریک میں کامیابی کے بعد مناصب کی رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ اصحاب رسول تاریخ کے پہلے گروہ ہیں جو عظیم کامیابی کے مرحلہ تک پہنچے مگر انھوں نے مناصب کو دوسروں کے حوالے کر کے اپنے لیے بے منصب حیثیت قبول کر لی۔

حکومت کے باوجود

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور آخری انجام ڈرنے والوں کے لیے ہے (تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوّا في الارض ولا فسادا والعاقبة للمتقين) القصص ۸۳

اس طرح کی آیتیں اور احکام قرآن میں بہت ہیں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ زمین میں بڑا کون بنتا ہے اور کون ہے جو زمین میں فساد کرتا ہے۔ اگرچہ ایک عام انسان بھی اپنے دائرہ میں علو اور فساد کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مگر یہ کام زیادہ بڑے پیمانہ پر وہ لوگ کرتے ہیں جن کو زمین میں اقتدار ملا ہوا ہو۔ جن کو وہ اختیار حاصل ہو جس کے بل پر کوئی شخص زمین کو فساد سے بھر دیتا ہے۔

اس اعتبار سے صحابہ کرام کا گروہ تاریخ کا واحد گروہ ہے جو اس مطلوب انسانی قدر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اقتدار ملا، مگر اقتدار نے ان کے اندر گھمنڈ پیدا نہیں کیا۔ ان کو زمین میں بڑائی ملی، مگر انھوں نے ایک عام آدمی کی طرح دنیا میں زندگی گزاری۔ وہ اعلیٰ اختیارات کے مالک تھے، مگر اختیار پانے کے باوجود وہ مفسد اور ظالم نہیں بنے۔ یہاں خلیفہ دوم عمر فاروق کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے جو اس معاملہ میں ایک علامتی مثال کی حیثیت رکھتا ہے:

عن الفضل بن عميرة، انّ الاحنف بن قيس قدم على عمر بن الخطاب في وفد من العراق۔ قدموا عليه في يوم صائف شديد الحر وهو محتجز بعباءة يهنأ بعيرا من ابل الصدقة۔ فقال: يا احنف ضع ثيابك وهلمّ فاعن امير المومنين على هذا البعير فانه لمن ابل الصدقة، فيه حق لليتيم والمسكين والارملة۔ فقال رجل من القوم۔ يغفر الله لك يا امير المومنين، فهلا تأمر عبدا من عبيد الصدقة فيكفيك هذا۔ قال عمر: واىّ عبد هو أعبد منى۔ (تاریخ عمر بن الخطاب، لابن الجوزی، صفحہ ۱۷)

فضل بن عمیرہ کہتے ہیں کہ احنف بن قیس ایک عراقی وفد کے ساتھ عمر بن الخطاب کے پاس مدینہ آئے۔ وہ گرمی کے موسم میں آئے تھے جب کہ گرمی بہت سخت تھی۔ عمر اپنی کمر پر ایک جبہ باندھے ہوئے تھے۔ اور ایک

اونٹ کی مالش کر رہے تھے جو کہ بیت المال کا اونٹ تھا۔ انھوں نے کہا کہ اے احنف، اپنے کپڑے اتار دو اور اس اونٹ کے معاملہ میں امیر المومنین کی مدد کرو، کیونکہ یہ بیت المال کا اونٹ ہے۔ اس میں یتیم اور مسکین اور بیواؤں کا حصہ ہے۔ لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ آپ کو معاف کرے اے امیر المومنین، کیوں نہیں آپ نے بیت المال کے غلاموں میں سے کسی غلام کو حکم دے دیا، وہ آپ کی طرف سے اس کام کو انجام دے دیتا۔ عمر نے جواب دیا: مجھ سے زیادہ غلام کون ہے۔

اقتدار پانے کے بعد آدمی بگڑ جاتا ہے۔ یہ مظہر اتنا عام ہے کہ لارڈ ایکٹن (۱۹۰۲-۱۸۳۴) کا یہ قول ضرب المثل بن گیا ہے کہ اقتدار بگاڑتا ہے اور کامل اقتدار بالکل ہی بگاڑ دیتا ہے:

Power corrupts and absolute power corrupts absolutely.

مگر تاریخ میں گروہ کے اعتبار سے صحابہ کرام کی مثال ایک استثنائی مثال ہے کہ ان کو زمین پر اقتدار ملا، لیکن اقتدار ان کو بگاڑنے والا نہ بن سکا۔ انھیں لوگوں کے اوپر حکومت حاصل تھی، مگر وہ محکوموں میں سے ایک محکوم بن کر لوگوں کے درمیان رہے۔ صحابہ کے دور میں خلیفہ اور امرا اور حکام کے یہاں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

صحابہ کرام تاریخ کی واحد مثال بن گئے جن کے حوالہ سے حکمرانوں کو سادہ اور معمولی زندگی گزارنے کی تلقین کی جائے۔ ۱۹۳۷ میں پہلی بار ہندستان میں کانگرس کی وزارت بنی تو مہاتما گاندھی نے اپنے انگریزی اخبار میں کانگریسی وزیروں کو سادہ زندگی کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا کہ میں آپ لوگوں کے سامنے رام چندر اور کرشن کا حوالہ نہیں دے سکتا، کیونکہ وہ تاریخی شخصیتیں نہیں ہیں۔ میں مجبور ہوں کہ سادگی کے نمونہ کے لیے ابو بکر اور عمر کا نام پیش کروں۔ وہ اگرچہ بہت بڑی سلطنت کے مالک تھے مگر انھوں نے مفلسوں کی طرح زندگی گزاری (ہریجن، ۲۷ جولائی ۱۹۳۷)

حکومت و اقتدار کے باوجود معمولی زندگی گزارنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ تمام مشکل کاموں میں سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس معیار پر وہ لوگ پورے اترتے ہیں جن کے لیے عہدہ اعزاز کی چیز نہ ہو بلکہ ذمہ داری کی چیز ہو۔ جو زندگی کے ذرائع کو سامان راحت نہیں بلکہ سامان آزمائش سمجھتے ہوں۔ جو اپنے نفس کی خواہش پر چلنے کے بجائے اپنے ایمانی شعور کے تحت عمل کرتے ہوں۔ صحابہ کرام وہ ربانی لوگ تھے جنھوں نے اس مشکل طریقہ کو اس کی تمام مشکلوں کے باوجود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔

معاہدہ کی پابندی

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب دوسری قوم سے تمہارا کوئی معاہدہ ہو تو تم اس معاہدہ پر قائم رہو۔ ایسا نہ کرو کہ اوپر اوپر معاہدہ کی حالت باقی رکھو اور اندر سے خفیہ طور پر اسے توڑ دو۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم کو کسی قوم سے بدعہدی کا ڈر ہو تو ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو، ایسی طرح کہ تم اور وہ دونوں برابر ہو جائیں۔ بے شک اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا (الانفال ۵۸)

یعنی تم کو دشمن کے خلاف جو کارروائی کرنا ہے، معاہدہ کو بالاعلان توڑنے کے بعد کرو نہ کہ معاہدہ کو باقی رکھتے ہوئے۔ اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے دورِ صحابہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ کچھ لفظی فرق کے ساتھ احمد، الترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ تینوں روایتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہاں ہم اس کا ترجمہ درج کرتے ہیں :

سُلیم بن عامر کہتے ہیں کہ امیر معاویہ اور رومی حکومت کے درمیان ایک میعادی عہد نامہ تھا۔ معاویہ اپنی فوج کو لے کر رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ سرحد کے قریب جا کر ٹھہریں اور اچانک ان کے اوپر حملہ کر دیں، معاویہ جب سرحد پر پہنچے تو ایک شخص گھوڑے پر سوار ہو کر ظاہر ہوا اور بلند آواز سے کہنے لگا کہ اللہ اکبر، اللہ اکبر، اسلام میں عہد کو پورا کرنا ہے، عہد کو توڑنا نہیں ہے (اللہ اکبر اللہ اکبر وفاء لا غدر)

لوگوں نے دیکھا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عَمرو بن عنبسہ تھے۔ اس کے بعد امیر معاویہ نے ان کو اپنے خیمہ میں بلایا۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ کا مطلب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو وہ نہ اس کی کوئی گرہ باندھے اور نہ اس کی کوئی گرہ کھولے، یہاں تک کہ اس کی مدت پوری ہو جائے۔ یا پھر وہ عہد کو برابری کے ساتھ اس کی طرف پھینک دے (مَن کان بینہ وبین قوم عہد فلا یشدّ عقدۃ ولا یحلّھا حتی ینقضی امدُھا او ینبذ الیھم علی سواء) تفسیر ابن کثیر ۲/۳۲۰، الجامع لاحکام القرآن ۸/۳۲

اس وقت امیر معاویہؓ سرحد روم پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور اگلی صبح کو حملہ کرنے والے تھے۔ مگر اس انتباہ کے بعد وہ حملہ سے رک گئے اور اپنی فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا (قال : فرجعَ

معاویۃُ بالناس) مشکاۃ المصابیح، الجزء الثانی، صفحہ ۱۱۶۵

بین اقوامی دنیا میں ہمیشہ سے یہ رواج چلا آرہا تھا کہ جس قوم سے دشمنی ہو جاتی تھی، اس کے بارہ میں لوگ کسی اخلاقی اصول کی پیروی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ ایسی قوم سے بظاہر امن اور صلح کا معاہدہ کرنے کے باوجود اندر اندر اس کے خلاف کارروائی جاری رکھتے تھے۔

اسلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو جو نمونہ قائم کرنا تھا، اس میں یہ بھی شامل تھا کہ بین اقوامی تعلقات میں اخلاقی اصولوں کو پوری طرح نبھایا جائے۔ مثلاً کسی قوم سے معاہدہ ہو تو اس معاہدہ کی آخری حد تک پابندی کی جائے۔ اور اگر اس قوم کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو تب بھی کوئی کارروائی صرف اس وقت کی جائے جب کہ اس قوم کو اس سے مطلع کر دیا جائے۔ تاکہ معاہدہ کے دوسرے فریق کو بخوبی طور پر معلوم ہو جائے کہ اب دونوں کے درمیان سابقہ حالت باقی نہیں ہے۔

یہ بلاشبہہ ایک بے حد اہم اصول تھا۔ مگر اس کو عملی طور پر قائم کرنے کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ کیونکہ یہ خود اپنے مفاد کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر دشمن کو پیشگی طور پر بتا دیا جائے کہ تمہارے ساتھ امن کی حالت ختم ہو چکی ہے اور اب ہم تمہارے اوپر حملہ کرنے والے ہیں تو ایسی حالت میں دشمن چوکنا ہو جائے گا۔ وہ تیاری کر کے سخت مقابلہ کرے گا۔ حتیٰ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارا اقدام ہمارے لیے الٹا ثابت ہو جائے۔

اس صورت حال میں اس بین اقوامی اصول کو عملاً قائم کرنے کے لیے ایک بے حد بااصول قوم درکار تھی۔ جو ہر دوسرے پہلو کو نظرانداز کر کے اصول کو اعلیٰ ترین حیثیت دینے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ جو ہر نقصان کو گوارا کر لے مگر اصول کی خلاف ورزی گوارا نہ کرے۔

مذکورہ واقعہ ایک مثال ہے جو بتاتا ہے کہ اصحاب رسول نے اس حوصلہ کا ثبوت دیا۔ وہ اس کے لیے مطلوبہ قربانی دینے پر راضی ہو گئے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ تاریخ میں پہلی بار بین اقوامی تعلقات میں یہ اصول عملاً قائم ہوا کہ دو قوموں میں بگاڑ اور عناد ہو تب بھی اخلاقی روایات کو نہ توڑا جائے۔ دشمن سے مقابلہ میں بھی سچائی اور شرافت کے خلاف عمل نہ کیا جائے۔

ہر اصول کی ایک قیمت ہے۔ لوگ قیمت دینا نہیں چاہتے، اس لیے وہ اس پر عمل بھی نہیں کرتے۔ صحابہ نے ہر اصول کی مطلوبہ قیمت ادا کی، اسی لیے وہ ہر اصول پر عمل کرنے میں کامیاب رہے۔

تاریخ ساز

خلیفہ چہارم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ اسلامی تاریخ کی مختلف کتابوں میں مذکور ہے۔ امام جمال الدین ابو الفرج بن الجوزی (م ۵۹۷ ھ) نے اپنی کتاب تاریخ عمر بن الخطاب میں اس واقعہ کو نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ ذیل میں اس کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ ہم عُمر بن الخطاب کے پاس تھے کہ ان کے یہاں اہل مصر کا ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ اے امیر المومنین، میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تمہارا کیا معاملہ ہے مصری نے کہا کہ مصر کے حاکم عَمرو بن العاص نے مصر میں گھوڑوں کی دوڑ کرائی۔ اس میں ایک گھوڑا بڑھ گیا جو میرا تھا۔ پھر جب لوگ آ آ کر میرے گھوڑے کو دیکھنے لگے تو عمرو بن العاص کے لڑکے محمد اٹھے۔ انھوں نے کہا کہ کعبہ کے رب کی قسم، میرا گھوڑا بڑھ گیا۔ جب وہ میرے قریب آئے اور میں نے ان کو پہچانا تو میں نے کہا کہ کعبہ کے رب کی قسم، میرا گھوڑا۔ اس پر محمد بن عمرو یہ کہتے ہوئے مجھے کوڑے سے مارنے لگے کہ یہ لو، اور میں شریفوں کی اولاد ہوں (خذها، خذها، وانا ابن الاكرمين)

راوی کہتے ہیں کہ خدا کی قسم، عُمر نے اس کے سوا اور کچھ نہ کیا کہ انھوں نے مصری سے کہا کہ بیٹھو پھر انھوں نے عَمرو بن العاص کے نام خط لکھا کہ جب تم کو میرا یہ خط پہنچے تو تم فوراً مدینہ آجاؤ اور اپنے ساتھ اپنے لڑکے محمد کو بھی لے آؤ۔ راوی کہتے ہیں کہ جب خط پہنچا تو عمرو بن العاص نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ کیا تم سے کوئی بات سرزد ہوئی ہے، کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے۔ محمد نے کہا کہ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر کیا وجہ ہے کہ عمر تمہارے بارہ میں ایسا لکھ رہے ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر دونوں چل کر عمر کے پاس آئے۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ خدا کی قسم، اس وقت ہم لوگ عمر کے پاس منیٰ میں تھے کہ اتنے میں عمرو بن العاص آئے۔ ان کے جسم پر ایک ازار اور ایک چادر تھی۔ پھر عمر ان کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ ان کے لڑکے کو دیکھیں، تو وہ اپنے باپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ عمر نے کہا کہ مصری کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ میں یہ ہوں۔ عمر نے کہا کہ یہ کوڑا لو، شریف زادہ کو مارو، شریف زادہ کو مارو۔ راوی کہتے ہیں کہ مصری نے ان کو مارا یہاں تک کہ ان کو خون آلود کر دیا (فضربه حتى اثخنه)

پھر عمرؓ نے کہا کہ عمرو بن العاص کے سر پر بھی مارو۔ کیوں کہ خدا کی قسم، ان کے لڑکے نے انھیں کی بڑائی کے بل پر تم کو مارا تھا۔ مصری نے کہا کہ اے امیر المومنین، جس نے مجھ کو مارا تھا اس کو میں نے مارلیا۔ عمر نے کہا کہ خدا کی قسم، اگر تم ان کو مارتے تو ہم تمہارے اور ان کے بیچ میں حائل نہ ہوتے۔ یہاں تک کہ تم خود ہی ان کو چھوڑ دو۔ پھر انھوں نے عمرو بن العاص سے کہا کہ اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا (یا عمرو، متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا)

اس کے بعد عمرؓ مصری کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ اطمینان کے ساتھ واپس جاؤ۔ اگر تمہارے خلاف پھر کوئی بات پیش آئے تو مجھے لکھو (انصرف راشدا فان رابك ريب فاكتب الي) ابوالفرج بن الجوزی، تاریخ عمر بن الخطاب، مطبعة التوفیق الادبیۃ، القاہرہ صفحہ ۹۹۔ ۱۰۰

یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ساری انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ صحابہ کرام کون لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے خدا کے دین کی تاریخ بنائی۔ صحابہ سے پہلے خدا کے دین کی حیثیت ایک فکری تحریک کی تھی، صحابہ کے بعد خدا کے دین کی حیثیت ایک حقیقی اور عملی تاریخ کی ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ اس کے دین کی پشت پر ایک تاریخی نمونہ قائم ہوجائے۔ مگر یہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ دینی افکار کی بنیاد پر ایک عالمی انقلاب برپا ہو۔ اس قسم کے ایک دور رس انقلاب کے بغیر مذکورہ قسم کا واقعہ تاریخ کے صفحات میں لکھا نہیں جاسکتا۔

مذکورہ واقعہ بلاشبہہ خدائی انصاف اور انسانی مساوات کی عظیم الشان مثال ہے۔ مگر اس مثال کو ظہور میں لانے کے لیے بے پناہ قربانیوں کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے وہ ہمہ گیر انقلاب لایا جائے جو رسولؐ کی قیادت میں صحابۂ کرام لے آئے۔ پھر اس کے لیے ضرورت تھی کہ سماج میں صحابہ جیسے مثالی انسانوں کا غلبہ قائم ہو۔ پھر اس کے لیے ضروری تھا کہ جو خلیفہ ایک حاکم کے بیٹے کے جرم پر اس کو کوڑا مارنے کا حکم دے رہا ہے وہ خود اپنے بیٹے کے جرم پر اسی طرح اس کو کوڑا مار چکا ہو۔

اصحاب رسول نے یہ ساری مہنگی قیمت ادا کی۔ وہ اپنی ذات کے لیے جینے کے بجائے خدا کے دین کے لیے جئے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ان کے ذریعہ سے خدا کے دین کی مطلوب عملی تاریخ بنے۔

بہتر حکمراں

افلاطون (۴۲۸-۳۴۸ ق م) قدیم یونان کے تین بڑے فلسفیوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے دو فلسفی سقراط اور ارسطو ہیں۔ اس کی ایک مشہور کتاب "ریپبلک" ہے۔ یہ آئیڈیل ریاست سے بحث کرتی ہے اور مکالمات کی صورت میں ہے۔ اچھے حکمراں کیسے بنتے ہیں، اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے افلاطون نے جو بات کہی ہے، اس کا ترجمہ انگریزی میں اس طرح کیا گیا ہے :

(Unless philosophers bear kingly rule... or those who are now called kings and princes become genuine and adequate philosophers, there will be no respite from evil.

جب تک فلاسفہ بادشاہت کا عہدہ نہ سنبھالیں، یا جو لوگ آج بادشاہ اور شہزادے کہے جاتے ہیں وہ واقعی فلسفی نہ ہو جائیں، اس وقت تک برے بادشاہوں سے نجات ملنے والی نہیں۔

افلاطون کے اس نظریہ کے بعد ایسے متعدد افراد حکمراں ہوئے ہیں جن کو فلسفی بادشاہ (philosopher-king) کہا جاتا ہے۔ مثلاً رومی بادشاہ مارکس ارلییس (Marcus Aurelius) روس کی ملکہ کیتھرین دوم (Catherine II) پروشیا کا فریڈرک دوم (Frederick II) مقدونیہ کا ڈیمٹریس (Demetrius) اور عہد حاضر میں سنگاپور کا لی کوان ایو (Lee Kuan Yew) فلسفی حکمراں تھے۔ مگر وہ بہتر حکمراں ثابت نہ ہو سکے۔

خود یونانی فلسفیوں کے کچھ شاگرد بادشاہ کے عہدے تک پہنچے۔ مثلاً ارسطو اسکندر رومی کا معلم تھا۔ اسی طرح ڈیمیٹریس ارسطو کے مدرسۂ فلسفہ کا تربیت یافتہ تھا۔ مگر یہ فلسفی حکمراں دوسروں سے بہتر حکمراں ثابت نہ ہو سکے۔ پیٹر گرین (Peter Green) کے الفاظ میں، جو ہوا وہ یہ تھا کہ کچھ نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار فلسفیوں کو بھی بگاڑ دیتا ہے :

What happened was, nothing happened... Power, it appeared, could corrupt even philosophers (*Time* magazine, May 13, 1991).

کارل مارکس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تمام خرابیوں کی جڑ ملکیت کا اقتصادی نظام ہے۔ انفرادی ملکیت کے نظام میں ایک مالک ہوتا ہے اور دوسرا مملوک۔ اس بنا پر جو مالک ہے وہ مملوک کا

استحصال کرتا ہے۔ اگر انفرادی ملکیت کے نظام کو ختم کر کے "سب کی ملکیت" کا نظام قائم کر دیا جائے تو ہر قسم کے ظلم وجبر کی جڑ کٹ جائے۔ اس کے بعد نہ کوئی مالک ہوگا اور نہ کوئی مملوک، پھر کون کس کا استحصال کرے گا۔ کون کس کے اوپر ظلم کرے گا۔

۱۹۱۷ میں روس میں مارکسی انقلاب آیا اور مذکورہ قسم کا بے ملکیتی نظام بزور قائم کر دیا گیا۔ مگر بعد کے حالات نے بتایا کہ مارکس کا تجویز کیا ہوا بے ملکیتی نظام تاریخ کا سب سے زیادہ ظالمانہ نظام تھا۔ اور وہاں کے حکمراں تمام حکمرانوں سے زیادہ جابر اور متشدد۔ نام نہاد اجتماعی ملکیت کے نظام نے ظلم وجبر میں مزید اضافہ کر دیا۔

اسی طرح بیسویں صدی کے نصف اول میں ایشیا اور افریقہ میں بہت بڑے پیمانہ پر نوآبادیاتی نظام کے خلاف آزادی کی تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کے علم برداروں کا کہنا تھا کہ تمام ظلم وفساد کا سبب بدیشی راج ہے۔ اگر ملک میں دیش کے لوگوں کا راج قائم کر دیا جائے تو ظالمانہ حکمرانی کا اپنے آپ خاتمہ ہو جائے گا۔ قومی آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہوئی اور ہر ملک میں خود ملک کے افراد حکومت کے عہدوں کے مالک ہو گئے۔ مگر ظلم وجبر کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ ملکی افراد بدستور ظالم حکمراں بنے رہے۔ جو ظلم پہلے بدیشیوں کے ہاتھ سے ہوتا تھا، وہ اب دیش والوں کے ہاتھ سے ہونے لگا۔

خدا کا دین (اسلام) مذکورہ قسم کے تمام دعووں کو غلط بتاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کے اندر حقیقی اصلاح صرف ایک چیز سے پیدا ہوتی ہے، اور وہ اللہ کا خوف ہے۔ اللہ کے ڈر کے سوا کوئی چیز نہیں جو ایک بااقتدار انسان کو عدل اور حق کے معیار پر قائم رکھ سکے۔

صحابہ سے پہلے یہ دعویٰ، عام انسان کی نظر میں، صرف ایک دعویٰ تھا۔ کیوں کہ خالص تاریخی اعتبار سے وہ ثابت شدہ نہیں بنا تھا۔ ان سے پہلے مدوّن تاریخ میں کوئی ایسی معلوم مثال نہ تھی جو اس نظریہ کو واقعاتی طور پر ثابت کرتی ہو۔

صحابہ نے اس نظریہ کے حق میں واقعاتی مثال قائم کی۔ ان کو اقتدار ملا، مگر وہ اُس بگاڑ سے محفوظ رہے جس میں ہر دور کے حکمراں مبتلا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک دعویٰ ہے اور اصحاب رسول اس کی دلیل۔ اسلام ایک نظریہ ہے اور اصحاب رسول اس نظریہ کے حق میں عملی تصدیق۔

نئے دور کے نقیب

خلیفہ دوم عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ایران فتح ہوا۔ مسلمانوں کی مسلح فوجوں کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص تھے۔

اس زمانہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایرانی بادشاہ یزدگرد کی ہدایت پر اس کے سپہ سالار رستم نے حضرت سعد کو یہ پیغام بھیجا کہ صلح کی بات چیت کے لیے اپنے آدمیوں کا ایک وفد بھیجئے۔ اس دوران جو لوگ ایرانی حکمرانوں سے بات کرنے کے لیے ان کے یہاں گئے، ان میں سے ایک حضرت ربعی بن عامر تھے۔

ربعی بن عامر رستم کے دربار میں پہنچے۔ اس نے اپنے دربار کو نہایت شاندار طور پر سجایا تھا۔ قیمتی قالین، عالی شان تخت، سونا چاندی اور ہیرے اور جواہر کے آرائشی سامانوں سے وسیع خیمہ جگمگا رہا تھا۔ رستم اپنے سر پر سنہری تاج پہنے ہوئے اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔

ربعی بن عامر کے جسم پر نہایت معمولی کپڑا تھا۔ وہ ایک تلوار لٹکائے ہوئے اور ایک چھوٹے گھوڑے پر سوار ہو کر اندر داخل ہوئے۔ وہ گھوڑے سے اترے نہیں، یہاں تک کہ وہ رستم کے تخت تک پہنچ گئے۔ تخت کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترے اور قالین میں اپنا نیزہ گاڑ کر اس سے اپنے گھوڑے کو باندھ دیا۔ رستم کے آدمیوں نے اس بے باکانہ انداز پر اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں خود سے نہیں آیا ہوں۔ بلکہ تمہارے بلانے پر آیا ہوں۔ اگر تم مجھ کو میرے حال پر رہنے دو تو ٹھیک ہے، ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا۔

رستم نے اپنے آدمیوں کو روکا اور کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، ان سے تعرض نہ کرو۔ رستم نے مختلف سوالات کیے جس کا انھوں نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ رستم کے ایک سوال کا جواب انھوں نے ان الفاظ میں دیا :

قال : اللهُ ابتعثنا لنخرجَ مَن شاءَ من عبادةِ العباد الى عبادة الله۔ و من ضيق الدنيا الى سعتها

انھوں نے کہا کہ اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ اللہ کے بندوں میں سے جس کو وہ چاہے ہم اس کو بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت

ومن جور الأديان الى عدل الاسلام۔	کی طرف لے آئیں، اور دنیا کی تنگی سے دنیا کی وسعت کی
فارسلنا بدينه الى خلقه	طرف، اور مذہبوں کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف۔
لندعوهم اليه۔ فمن قبل	پس اللہ نے ہم کو اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف
ذلك قبلنا منه ورجعنا عنه۔	بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس کی طرف بلائیں۔ پس جو
ومن ابى قاتلناه ابدا حتى نفضى	اس کو قبول کرے ہم بھی اس سے قبول کرلیں گے اور
الى موعود الله (البدایۃ والنہایۃ ۷/۳۹)	اس سے واپس چلے جائیں گے۔ اور جو کوئی انکار
	کرے اس سے ہم لڑیں گے، یہاں تک کہ اس کو
	اللہ کے وعدہ تک پہنچا دیں۔

صحابی کے یہ الفاظ کوئی سادہ الفاظ نہ تھے۔ اس میں دراصل اس عظیم انقلاب کی طرف اشارہ تھا جو اصحاب رسول کے ذریعہ لایا گیا اور جس نے عالمی سطح پر انسانی تاریخ کو بدل دیا۔ اس کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب "اسلام دورِ جدید کا خالق" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی صورت حال یہ تھی کہ ساری دنیا میں نسلی بادشاہت کا رواج تھا۔ اس بادشاہت نے ہر جگہ جبر کی وہ فضا پیدا کر رکھی تھی جس کو ہنری پرین نے شاہانہ مطلقیت (imperial absolutism) کہا ہے۔ ایک شخص جس کے سر پر حکومت کا تاج ہو وہ سب کا آقا تھا، اور تمام لوگ اس کے غلام۔

مشرکانہ مذہب اور مطلق شہنشاہیت دونوں نے مل کر فطرت کے سائنسی مطالعہ کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فطرت میں چھپی ہوئی خدا کی تمام نعمتیں بے دریافت اور غیر استعمال شدہ بنی ہوئی تھیں۔

مذہب میں مذہبی پیشواؤں کا مکمل قبضہ تھا۔ وہ دنیا میں خدا کے نمائندہ بن کر انسانوں کو اپنا بندہ بنائے ہوئے تھے۔ ان کے گھڑے ہوئے مصنوعی مذہب کے نیچے پوری انسانیت پس رہی تھی۔ اس پیشوائی نظام سے اختلاف کرنے والے کو سخت ترین سزا دی جاتی تھی تاکہ لوگ دبے رہیں اور اس سے بغاوت کی جرأت نہ کر سکیں۔ اللہ کو مطلوب تھا کہ اس حالت کو بدلا جائے۔ اصحاب رسول نے غیر معمولی قربانیوں کے ذریعہ جبر کے اس نظام کو توڑا۔ انھوں نے انسان کے اوپر خدائی رحمتوں کا وہ دروازہ کھول دیا جو ہزاروں سال سے ان کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

نمونۂ انسانیت

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اصحابی کالنجوم بایّھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی بھی تم پیروی کروگے تم ہدایت پا جاؤ گے)

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اسلام کا نمونہ ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہم جان سکتے ہیں کہ ہمیں اللہ کی رضا کو پانے کے لیے اس دنیا میں کیا کرنا چاہیے۔ ایک تابعی نے اسی حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کیا : والقدوۃ ھم۔ یعنی صحابہ ہی تو نمونہ ہیں۔

ایمان کیا ہے اور مومن کسے کہتے ہیں، اس کا نہایت واضح بیان قرآن میں موجود ہے۔ اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مزید یہ اہتمام فرمایا کہ سچے ایمان کا عملی نمونہ دنیا میں قائم کر دیا۔ یہ عملی نمونہ اسی انسانی گروہ کے ذریعہ قائم کیا گیا ہے جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب رسول کے ایمان و اسلام کو قبول کیا اور اس کی تصدیق فرمائی۔ اس طرح اس نے عمل کی زبان میں تمام انسانوں کو بتا دیا کہ اس کو کون سا ایمان و اسلام مطلوب ہے۔

اس نمونہ کے سامنے آنے کے بعد اب ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے ایمان کو اصحاب رسول کے ایمان سے ملا کر دیکھے۔ اگر اس کا ایمان اصحاب رسول کے نمونہ کے مطابق ہے تو ٹھیک ہے۔ اور اگر وہ اس نمونہ کے مطابق نہیں ہے تو وہ خدا کے یہاں قبول کیے جانے کے لائق نہیں۔

اصحاب رسول کی یہ حیثیت کہ وہ تمام انسانی نسلوں کے لیے "ستارہ" قرار دیے گئے اور اعلان کیا گیا کہ تمام لوگ ان سے روشنی حاصل کریں، یہ کوئی سادہ سی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصحاب رسول نے وہ انتہائی مہنگی قیمت ادا کی جو کسی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ لوگوں کے لیے ستارۂ ہدایت بنے۔ اس قیمت کی ادائیگی کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ان کے حق میں یہ اعلان کیا جائے کہ وہ تمام نسلوں کے لیے ستارۂ ہدایت ہیں، اور اب قیامت تک تمام لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان کے نمونہ سے روشنی لے کر اپنی زندگیوں کی تعمیر کریں۔

آج ایک شخص محمدؐ (قابل تعریف) پیغمبر پر ایمان لاکر مومن کہلاتا ہے، صحابہ کو مومن بننے کے لیے مذممؔ (قابل مذمت) پیغمبر پر ایمان لانے کے امتحان میں کھڑا ہونا پڑا۔ آج ہم مذہبی آزادی کے

ماحول میں دیندار بنے ہوئے ہیں، انھیں مذہبی جبر کے ماحول میں دین کو اختیار کرنا پڑا۔ آج ہم ایک پُرفخر اسلامی تاریخ کے مالک ہیں، انھیں ایک ایسے اسلام سے وابستہ ہونا پڑا جس کی سرے سے کوئی تاریخ ہی نہ تھی۔

آج لوگوں کو اسلام کے نام پر بڑے بڑے اعزازات مل رہے ہیں، انھیں اسلام کی خاطر اپنے آپ کو بالکل بے قیمت کر دینا پڑا۔ آج اسلام کی علم برداری سے ہر جگہ لوگوں کو قیادت اور استقبال کا تحفہ حاصل ہو رہا ہے، انھیں ایک ایسے اسلام کا علمبردار بننا پڑا جس نے ان کی موجودہ عزت و رفعت کو بھی مٹی میں ملا دیا۔

صحابہ نے جس اسلام کو اختیار کیا اس کو اختیار کرنا اخلاص کے بغیر ممکن نہ تھا۔ انھوں نے جس دین کو اپنا دین بنایا اس کا محرک اللہ کی رضا کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ ان کا اسلام مکمل طور پر بے داغ اسلام تھا۔ ان کی للّٰہیت ہر امتحان میں پوری اتری تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخ کے وہ منتخب گروہ قرار پائے جس کی تقلید کی جائے۔ جس کے نمونہ کو ہمیشہ کے لیے اپنا رہنما بنالیا جائے۔

جو لوگ معمول کے حالات میں اسلام کو اختیار کریں، وہ کبھی اسلام کا نمونہ نہیں بن سکتے۔ اسی طرح جو لوگ اس دور میں اسلام کا نام لیں جب کہ اسلام کا نام لینے سے قیادت ملتی ہے۔ اقتصادی فائدے حاصل ہوتے ہیں، اور سماج میں عزت کا مقام حاصل ہوتا ہے، وہ بھی نمونہ بننے کے لائق نہیں۔ کیونکہ نمونہ کے لیے خالص ہونا ضروری ہے۔

اسلام کا نمونہ صرف وہ لوگ بن سکتے ہیں جو غیر معمولی حالات میں اسلام پر قائم رہیں۔ جو اس دور میں اسلام کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کریں جب کہ اس کے ساتھ وابستگی کے بعد ملی ہوئی عزت بھی ختم ہو جائے۔ جب آدمی عوام کے درمیان اپنی مقبولیت کھو دے۔

اصحاب رسول اسی قسم کے غیر معمولی لوگ تھے جنھوں نے غیر معمولی حالات میں اسلام کا ساتھ دیا۔ انھوں نے کھونے کی قیمت پر اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ وابستہ کیا۔ وہ اعلیٰ انسانیت پر کھڑے ہوئے۔ وہ اپنے معیاری قول و عمل کی بنا پر اس قابل ٹھہرے کہ وہ تمام قوموں اور تمام نسلوں کے لیے رول ماڈل ہوں۔ وہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے ابدی مثال بن جائیں۔

دنیا کے لیے رحمت

پیغمبروں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ ان کی مخاطب قوم اگر ان کو نہ مانے تو اس کو زمینی یا آسمانی عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دیا جائے۔ چنانچہ پچھلے زمانوں میں ایسا ہوا کہ پیغمبروں کی مخاطب قومیں اپنے انکار کے سبب سے بار بار ہلاک کی جاتی رہیں (العنکبوت ۴۰) آخر کار اللہ نے چاہا کہ ایک ایسا پیغمبر بھیجے جس کے بعد ہلاکت کا مذکورہ سلسلہ ختم ہو جائے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم یہی خاص پیغمبر تھے۔ اسی لیے قرآن میں آپ کو دنیا والوں کے لیے رحمت (الانبیاء ۱۰۷) کہا گیا ہے۔ اس آیت سے متعلق مفسرین کے کچھ اقوال یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

قوله تعالى (وما ارسلناك الا رحمة للعالمين) قال سعيد بن جبير عن ابن عباس قال: كان محمد صلى الله عليه وسلم رحمة لجميع الناس فمن آمن به وصدّق به سعد ومن لم يؤمن به سلم مما لحق الأمم من الخسف والغرق (الجامع لاحکام القرآن ۱۱/ ۳۵۰)

"اور ہم نے تم کو بس رحمت بنا کر بھیجا ہے" اس کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے لیے رحمت تھے۔ جو آدمی آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تصدیق کی اس نے سعادت حاصل کی اور جو آدمی آپ پر ایمان نہیں لایا وہ زمین میں دھنسنے اور غرق ہونے کے اس عذاب سے بچ گیا جو دوسری قوموں کو پیش آیا۔

فان قيل فاى رحمة حصلت لمن كفر به۔ فالجواب ما رواه ابو جعفر بن جرير عن ابن عباس، قال من آمن بالله واليوم الآخر كتب له الرحمة فى الدنيا والآخرة۔ ومن لم يؤمن بالله ورسوله عوفى مما اصاب الامم من الخسف والقذف (مختصر تفسیر ابن کثیر ۲/ ۵۲۵)

اگر یہ کہا جائے کہ اس کو کون سی رحمت ملی جس نے آپ کا انکار کیا۔ تو اس کا جواب وہ ہے جو ابن جریر نے عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو آدمی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا اس کے لیے دنیا اور آخرت میں رحمت لکھ دی گئی۔ اور جو آدمی اللہ اور رسول پر ایمان نہیں لایا وہ دھنسانے اور پتھراؤ کیے جانے کے اس عذاب سے بچ گیا جو پچھلی امتوں کو پیش آیا تھا۔

وقيل هو رحمة للمومنين في الدارين وللكافرين في الدنيا بتاخير عذاب الاستئصال والمسخ والخسف (تفسير النسفی ۹۱/۳)

اور کہا گیا ہے کہ آپ اہل ایمان کے لیے دونوں عالموں میں رحمت ہیں۔ اور اہل انکار کے لیے دنیا میں رحمت، کیونکہ ان پر مہلک عذاب اور مسخ اور دھنسائے جانے کا عذاب ٹال دیا گیا۔

فكان رحمةً للعالمين حتى الكفار رُحموابه حيث اخّرعقوبتهم ولم يستأصلهم بالعذاب كالمسخ والخسف والغرق (صفوۃ التفاسیر ۲۷۰/۲)

آپ منکرین تک کے لیے رحمت تھے۔ آپ کی وجہ سے ان کی سزا موخر ہوگئی اور ان پر عذاب مستاصل نہیں آیا، مثلاً مسخ، دھنسانا اور غرق کرنا۔

روى البخاري في التاريخ عن ابي هريرة، قال: انما بعثت رحمة ولم ابعث عذابا- وقال ابن عباس: هو رحمة للكافر في الدنيا بتأخير العذاب عليهم ورفع المسخ والخسف والاستئصال (التفسیر المظہری ۲۴۴/۶)

بخاری نے اپنی تاریخ میں ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں عذاب بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ اور عبداللہ بن عباس نے کہا کہ آپ منکرین کے لیے دنیا میں ان پر عذاب ٹل جانے کی وجہ سے رحمت ہیں اور مسخ اور دھنسا اور مہلک عذاب اٹھا لیے جانے کی وجہ سے۔

مگر دنیا میں "رسولِ رحمت" کا دور لانا سادہ طور پر محض تقرری (appointment) کا معاملہ نہ تھا۔ یہ ایک نئی تاریخ کو ظہور میں لانے کا معاملہ تھا۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک طاقت ور انسانی ٹیم رسول رحمت کی کامل معاونت کرے اور اسباب وعلل کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مطلوبہ تاریخی انقلاب لے آئے۔ اصحاب رسول اپنے اعلیٰ شعور اور اپنی بے پناہ قربانیوں کے ذریعہ یہی طاقت ور ٹیم بنے۔ انھوں نے رسول رحمت کے خدائی منصوبہ کو عملاً قائم کیا۔

قرآن کے مطابق، موجودہ دنیا انسان کے لیے آزمائش گاہ ہے۔ یہاں انسان کو آزادی دے کر دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا عمل کرتا ہے اور کون برا عمل۔ انسان کے اسی ریکارڈ کے مطابق اس کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے گا۔ خدا کے پیغمبر انسان کو اسی نوعیتِ حیات کی خبر دینے کے لیے آتے تھے۔ جب آخری رسول پر پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم کیا گیا تو اس کے بعد اللہ نے چاہا کہ دینِ پیغمبر کو ذاتِ پیغمبر کا بدل بنا دیا جائے۔ زندہ پیغمبر کے بجائے پیغمبر کا لایا ہوا ہدایت نامہ لوگوں کے لیے ہدایت کا

ذریعہ بن جائے۔

یہ صرف اس وقت ممکن تھا جب کہ خدا کا دین ہمیشہ کے لیے ایک محفوظ دین بن چکا ہو۔ پچھلے زمانوں میں ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ کیونکہ پیغمبروں کو انسانوں کی اتنی بڑی تعداد نہیں ملی جو دین کی حمایت کر کے عالم اسباب میں اس کی حفاظت کا انتظام کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر کا دین اس کے بعد مٹایا جاتا رہا۔ آج پچھلے پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کی تاریخ موجود نہیں، اور نہ کسی پیغمبر کی کتاب محفوظ حالت میں پائی جاتی ہے۔

اس مقصد کے لیے ضرورت تھی کہ خدا کے دین کو مجرد نظریہ کی سطح سے اٹھا کر اس کو عملی انقلاب کے درجہ تک پہنچا دیا جائے۔ اس کے لیے ضرورت تھی مخالفِ دین طاقتوں کا زور توڑ دیا جائے تاکہ وہ ماضی کی طرح اس دین کو مٹانے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ خدا کے دین کی پشت پر ایک طاقت ور امت کھڑی کر دی جائے جو تمام مخالفین کے علی الرغم اس کی محافظ اور امین بن سکے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ خدا کے دین کی بنیاد پر ایک مکمل تاریخ وجود میں آجائے تاکہ خدا کے دین کی پشت پر ایک عملی نمونہ موجود رہے جو ہر دور کے انسانوں کی رہنمائی کرتا رہے۔

یہ منصوبہ بلاشبہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اصحاب رسول نے ہر قسم کی رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دے کر اس کو مکمل کیا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنا وطن اور اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ دیا۔ قریش آپ کے دشمن ہو گئے۔ مگر صحابہ نے اپنے جان و مال کو لٹا کر پیغمبر کی مدد کی۔ حنین کی جنگ میں دشمنوں نے آپ پر تیروں کی بارش کر دی۔ اس وقت صحابہ کی ایک جماعت نے آپ کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان کے جسموں پر تیر اس طرح لٹک رہے تھے جس طرح ساہی کے جسم پر کانٹے لٹکتے ہیں۔ مگر انھوں نے پیغمبر کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ روم و ایران کی طاقتور سلطنتیں خدا کے دین کی دشمن ہوگئیں۔ صحابہ نے ان طاقتور چٹانوں کو توڑ ڈالا، وغیرہ۔

صحابہ کرام نے ہر قربانی کی قیمت پر پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دیا۔ انھوں نے اپنے بے پناہ عمل سے وہ تاریخی حالات پیدا کیے جس کے بعد سنت اللہ کے مطابق نبیوں کا سلسلہ ختم ہوا اور انسانیت بار بار دنیوی ہلاکت کے انجام سے بچ گئی۔ نبوت رحمت کا قیام ایک خدائی منصوبہ تھا مگر یہ اصحاب رسول ہی تھے جنھوں نے عالم اسباب میں اس منصوبہ کو مکمل کیا۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

عظمتِ مومن

عجیب لوگ

ایران حضرت عمر فاروق کے زمانۂ خلافت میں فتح ہوا ہے۔ اس وقت ایران کی مسلم افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص تھے۔ اس جنگ میں ایرانیوں کا کافی نقصان ہوا۔ چنانچہ انہوں نے گفت وشنید کی پیش کش کی۔ حضرت سعد نے مختلف وفود کو رستم اور یزدگرد کے دربار میں بھیجا۔ مثلاً نعمان بن مُقرن۔ فرات بن حیان۔ حنظلہ بن ربیع۔ عُطارد بن حاجب۔ اشعث بن قیس۔ مغیرہ بن شعبہ۔ عمرو بن معدیکرب کے وفود (البدایہ والنہایہ) ۷/ ۳۸۔۳۹

تاریخ میں ان سفارتوں کی کافی تفصیلات آئی ہیں۔ آخری مرحلہ میں حضرت مغیرہ کا وفد شہنشاہ یزدگرد کے زرق برق دربار میں آیا۔ مدائن کے محل میں انھوں نے انتہائی بے خوفی کے ساتھ تقریر کی۔ یزدگرد اس کو سن کر بگڑ گیا۔ اس نے کہا کہ تم میرے سامنے اس طرح کی باتیں کرتے ہو۔ اگر یہ قاعدہ نہ ہوتا کہ ایلچی قتل نہ کئے جائیں تو میں تم کو ضرور قتل کر دیتا۔ اب تم واپس جاکر اپنے امیر کو بتا دو کہ میں سپہ سالار رستم کی سرکردگی میں ایسا لشکر بھیجنے والا ہوں جو تم سب کو قادسیہ کے خندق میں دفن کر دے گا۔

پھر یزدگرد نے محل کے آدمیوں سے کہا کہ ایک ٹوکری میں مٹی بھر کر لاؤ۔ مٹی لائی گئی تو اس نے مسلمانوں کے وفد سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ تم میں سب سے زیادہ شریف کون ہے۔ وفد کے افراد چپ رہے۔ اس کے بعد عاصم بن عمرو بولے کہ میں سب سے زیادہ شریف ہوں۔ یزدگرد نے حکم دیا کہ مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے گلے میں لٹکائی جائے اور ان کو یہاں سے بھگا دیا جائے یہاں تک کہ وہ مدائن کے باہر چلے جائیں۔

شاہی حکم کے مطابق مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے گلے میں لٹکا دی گئی۔ وہ اس کو لے کر مدائن کے محل سے نکلے اور اونٹنی پر سوار ہو کر تیزی سے قادسیہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں حضرت سعد بن ابی وقاص مقیم تھے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے حضرت سعد کو ساری روداد سنائی اور مٹی کی ٹوکری ان کے سامنے رکھ دی۔ اس کے بعد مسلم سردار نے جو جواب دیا وہ یہ تھا :

ابشروا فقد واللہ اعطاناللہ — خوش ہو جاؤ۔ کیونکہ خدا کی قسم اللہ نے ہمیں ان کے
اقالید ملکھم و تفاء لوا بذالک — اقتدار کی کنجیاں دیدی ہیں۔ اور انھوں نے اس
اخذ بلادھم — سے ان کے ملک پر قبضہ کی فال لی۔

یہ مسلمان اگر مٹی پاکر غصہ ہوتے تو ان کے حصہ میں نفرت اور شکایت کے سوا کچھ نہ آتا۔ مگر جب وہ غصہ نہیں ہوئے تو مٹی دینے کا واقعہ ان کے لئے ملک دینے کے ہم معنیٰ بن گیا۔ ایک انتہائی ناخوشگوار واقعہ سے بھی انھوں نے اپنے لئے یقین اور حوصلہ کی غذا حاصل کر لی۔

یہی موجودہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر شخص اور ہر گروہ کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اس آزادی نے موجودہ دنیا کو مقابلہ (Competition) کی دنیا بنا دیا ہے۔ یہاں ہر آدمی دوسرے آدمی کی کاٹ میں ہے۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کو دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔

ایسی حالت میں ایک صورت یہ ہے کہ آدمی غصہ اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو۔ وہ انتقامی نفسیات میں جلتا رہے۔ ایسے آدمی کا ذہن ہمیشہ منتشر رہے گا۔ وہ کبھی گہری منصوبہ بندی نہ کر سکے گا۔ ایسے آدمی کے لئے موجودہ دنیا میں ناکامی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچائے۔ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہو۔ ایسے آدمی کا ذہن ہمیشہ اعتدال کی حالت میں رہے گا۔ وہ اپنے منفی اور مثبت پہلوؤں کو کسی کمی بیشی کے بغیر جان لے گا۔ اس کے لئے یہ ممکن ہو گا کہ وہ تمام حقیقتوں کو نگاہ میں رکھے اور حالات کے عین مطابق منصوبہ بندی کرے۔ ایسے شخص کے لئے کامیابی اتنی ہی یقینی ہے جتنا رات کے بعد سورج کا نکلنا۔

جو شخص اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچائے اس کی سوچ نہایت اعلیٰ سوچ بن جاتی ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ امکانات پر ہوتی ہے۔ وہ مٹی کی ٹوکری میں پورے ملک کی تصویر دیکھ لیتا ہے۔ حوصلہ شکنی کے واقعات اس کے ذہنی خانہ میں داخل ہو کر حوصلہ مندی کے واقعات بن جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شکست کو فتح میں تبدیل کرتے ہیں۔ وہ ناکامی میں کامیابی کا راز دریافت کر لیتے ہیں۔

تاریخ کی آواز

حضرت عمر فاروق رضی کی خلافت کے زمانہ میں ۱۴ھ میں ایران فتح ہوا۔ اس زمانہ میں لوگوں کے ذہن پر ایرانی شہنشاہ کی اتنی عظمت تھی کہ حضرت عمرؓ اس مہم کی سربراہی کے لیے خود مدینہ سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گیے۔ مگر لوگوں نے اس کے خلاف مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک صحابی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو اس مشکل مہم کا سپہ سالار بنایا گیا۔

اس مہم کا آخری معرکہ قادسیہ کے قریب ایک میدان میں ہوا۔ یہاں میدان جنگ کے کنارے ایک قدیم شاہی عمارت تھی۔ حضرت سعدؓ اس کی چھت پر چڑھے اور میدان کی طرف رخ کر کے تکیہ کے سہارے بیٹھ گیے۔ وہ جنگ میں خود شریک نہیں ہوئے۔ اپنی جگہ خالد بن عرفطہ کو میدان مقابلہ کا سردار مقرر کیا۔ حضرت سعد عمارت کے اوپر بیٹھے ہوئے مسلسل جنگ کا مشاہدہ کر رہے تھے اور حسب ضرورت اپنی ہدایات پرچی پر لکھ کر خالد بن عرفطہ کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔

یہ جنگ اسلامی تاریخ کی انتہائی ہولناک جنگ تھی۔ اس جنگ میں ایرانی ہاتھیوں کی فوج لائے تھے جن کا اس سے پہلے عربوں نے تجربہ نہیں کیا تھا۔ ایک موقع پر ہاتھیوں کی کالی آندھی نے مسلمانوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ حضرت سعد یہ دیکھ کر بے تاب ہو گیے اور بار بار کروٹیں بدلنے لگے۔ حضرت سعد کی اہلیہ سلمیٰ جو اس وقت ان کے پاس تھیں، یہ دیکھ کر بول اٹھیں "کاش آج مثنیٰ ہوتا"۔ حضرت سعد نے سلمیٰ کو تھپڑ مار کر کہا۔ "مثنیٰ ہوتا تو وہ کیا کر لیتا"۔ سلمیٰ نے جواب دیا۔ "سبحان اللہ، بزدلی کے ساتھ غیرت بھی"۔ سلمیٰ نے یہ بات اس لیے کہی کہ حضرت سعدؓ خود لڑائی میں شریک نہیں تھے۔

اس کے بعد تاریخ لمبی تفصیل بیان کرتی ہے کہ کس طرح مسلمانوں نے ایران کی فوجی تیاریوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر شاندار فتح حاصل کی۔

اس جنگ میں ایرانیوں کا سردار رستم تھا۔ رستم کو ہلال نامی ایک مسلمان سپاہی نے قتل کیا۔ اگرچہ فردوسی نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ رستم کا مقابلہ حضرت سعد سے ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے شاہنامہ میں لکھا ہے:

زیک سوئے رستم زیک سوئے سعد

حضرت سعدؓ کے براہِ راست جنگ میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت فوج کے اندر کافی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ایرانیوں کی شکست کے بعد ایک مسلمان فوجی نے نظم کہی جس کے دو اشعار یہ تھے:

وَقَاتَلْتُ حَتَّى اَنْزَلَ اللّٰهُ نَصْرَهُ وَسَعْدٌ بِبَابِ الْقَادِسِيَّةِ مُعْصِمُ

فَاُبْنَا وَقَدْ اٰمَتْ نِسَاءٌ كَثِيْرَةٌ وَنِسْوَةُ سَعْدٍ لَيْسَ فِيْهِنَّ اَيِّمُ

میں لڑا یہاں تک کہ اللہ نے اپنی مدد بھیجی۔ اور سعد قادسیہ کے دروازے سے پیٹے رہے۔ پھر ہم واپس ہوئے اور بہت سی عورتیں بیوہ ہو چکی تھیں۔ اور سعد کی بیویوں میں سے کوئی بیوی بیوہ نہیں ہوئی۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نہایت جلیل القدر صحابی تھے۔ وہ اسلام کے بڑے بڑے مجاہدوں میں شامل تھے۔ لیکن مذکورہ واقعہ کو اگر اس کی ظاہری صورت میں لیا جائے تو ایک شخص یہ رائے قائم کرے گا کہ نعوذ باللہ وہ ایک بزدل آدمی تھے۔ انھوں نے دوسروں کی عورتوں کو بیوہ بنایا اور خود اپنی بیوی کے ساتھ شاہی قلعہ میں محفوظ بیٹھے رہے۔

مگر یہ شبہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ اصل واقعہ کو ادھوری شکل میں دیکھا جائے۔ واقعہ کو پوری شکل میں دیکھئے تو یہ شبہ باقی نہ رہے گا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کو عرق النسار کی بیماری تھی (كان به عرق النسا يومئذ، البدایہ والنہایہ ۷/۴۱) ایرانی جنگ کی ابتدا میں وہ ٹھیک حالت میں تھے۔ چنانچہ قادسیہ کے آخری معرکہ سے پہلے دوسری جنگوں میں وہ براہ راست شریک رہے۔ مگر قادسیہ کے معرکہ کے موقع پر ان کو عرق النسار کا شدید دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس وقت چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے۔ اس بنا پر مقابلہ میں براہِ راست شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر ان کے جنگی تجربات اور ان کی اعلیٰ ذہانت کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ان کو بدستور سپہ سالاری کے عہدہ پر باقی رکھا۔ اگرچہ وہ عملی طور پر جنگ میں شریک نہ تھے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی رہنمائی اور ان کی منصوبہ بندی ہی کی وجہ سے اس معرکہ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا۔

ان کی جنگی ذہانت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے عین معرکہ کے وقت ایران کی ہاتھیوں کی فوج کا حل دریافت کیا جس نے کالی آندھی کی طرح مسلمانوں کو روندنا شروع کر دیا تھا۔ عرب ذہن کے لیے یہ بالکل ایک نیا مسئلہ تھا اس لیے وہ اس کا حل سوچنے سے عاجز ہو رہے تھے۔ حضرت سعدؓ نے یہ کیا کہ ان ایرانیوں کو بلایا جو پہلے پارسی تھے اور اب مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے نام ضخم اور سلم وغیرہ تاریخوں میں آئے ہیں۔

حضرت سعدؓ نے ان ایرانی نو مسلموں سے پوچھا کہ اس کالے طوفان کا کیا علاج ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا حل یہ ہے کہ کسی طرح ان کے سونڈ اور ان کی آنکھیں بے کار کر دی جائیں۔

اس کے بعد حضرت سعد نے مسلم فوج سے کچھ خاص جوانوں کو طلب کیا۔ ان کو پوری بات سمجھائی اور ان کو ابھارا کہ تم جان پر کھیل اس مہم کو سر کرو۔ چنانچہ قعقاع اور کچھ دوسرے جوانوں نے دو ہاتھیوں کو منتخب کیا۔ یہ دونوں ہاتھی جسامت میں سب سے بڑے تھے اور بقیہ ہاتھیوں کے لیے سردار کا کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہاتھی کا نام ابیض تھا اور دوسرے کا نام اجرب۔ مسلم جوانوں نے ان دونوں ہاتھیوں کو نرغے میں لے لیا۔ انھوں نے نہایت پھرتی سے برچھا مار کر ان کی آنکھوں کو بے کار کر دیا۔ اس کے بعد سونڈ پر اتنے زور سے تلوار ماری کہ وہ کٹ کر الگ ہو گئی۔ اب دونوں ہاتھی پیچھے کی طرف بھاگے۔ ان کو دیکھ کر بقیہ ہاتھی بھی ان کے ساتھ مڑ کر پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔ ہاتھیوں کی جو فوج پہلے مسلمانوں کو روند رہی تھی اس نے انتہائی بے دردی کے ساتھ خود ایرانی فوج کو روند ڈالا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کے مذکورہ واقعہ میں دو بہت بڑے سبق ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کے خلاف کوئی بات سامنے آئے تو آدمی کو کبھی ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس کو فوراً مان لے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معاملہ کی پوری جانچ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اصل بات اس سے بالکل مختلف تھی جو بظاہر ابتدائی رپورٹ سے سامنے آئی تھی۔ جس خبر میں کسی کے خلاف بدگمانی کا پہلو ہو اس کو مکمل تحقیق کے بغیر مان لینا سراسر ایمانی تقاضے کے خلاف ہے۔

دوسرا سبق وہ ہے جس کا ثبوت قادسیہ کے موقع پر عرب فوجیوں نے دیا۔ انھیں اپنے سردار سے زبردست شکایت تھی۔ حتی کہ اس شکایت کا اظہار انھوں نے اشعار کی صورت میں کیا اور وہ اشعار تمام فوجیوں کے درمیان پھیل گئے۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ لوگ اپنے سردار سے بغاوت کر دیں یا جنگ میں بے جگری کے ساتھ نہ لڑیں۔ سردار سے شکایت کے باوجود وہ اپنا فرض بھرپور طور پر ادا کرتے رہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو تاریخ بناتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ مزاج نہ ہو وہ صرف یہ کریں گے کہ آپس میں لڑ بھڑ کر بنتے ہوئے کھیل کو بگاڑ دیں اور ایک جنگ جو جیت پر ختم ہونے والی تھی اس کو شکست اور ناکامی میں تبدیل کر دیں۔

ایک باپ

اموی خلیفہ مروان بن الحکم نے اپنے بعد علی الترتیب عبد الملک اور اس کے بعد اپنے بھائی عبد العزیز کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا۔ مروان کے بعد عبد الملک حکمراں ہوا تو اس کی نیت بگڑ گئی جلد ہی بعد عبد العزیز کا انتقال ہوگیا۔ اب عبد الملک کو موقع مل گیا۔ اس نے ولید اور سلیمان کی ولی عہدی پر بیعت لینے کے لئے صوبوں کے حاکموں کے نام فرمان جاری کر دئے۔ ہشام بن اسماعیل مدینہ کا حاکم تھا۔ سعید بن المُسَیِّب (۹۴-۱۳ھ) جو سید التابعین کہے جاتے ہیں، اس وقت مدینہ میں موجود تھے۔ ہشام نے چاہا کہ سب سے پہلے حضرت سعید بن المسیب سے بیعت لے۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر انھوں نے بیعت کر لی تو اس کے بعد تمام اہل مدینہ بیعت کر لیں گے۔

سعید بن المسیب نے بیعت سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک خلیفہ کی زندگی میں دوسرے خلیفہ کے لئے بیعت نہیں کر سکتا۔ ہشام کے حکم سے سعید بن المسیب کو کوڑے مارے گئے اور سخت سزائیں دی گئیں۔ چند دن کے بعد ہشام نے ابو بکر بن عبد الرحمٰن کو ان سے بات کرنے کے لئے بھیجا۔ واپسی کے بعد ہشام نے پوچھا: کیا سعید مار کے بعد کچھ نرم پڑے۔ ابو بکر بن عبد الرحمٰن نے جواب دیا: تمہارے اس سلوک کے بعد خدا کی قسم وہ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اپنا ہاتھ روک لو۔

خلیفہ عبد الملک کو معلوم ہوا تو اب اس نے دوسری تدبیر سوچی۔ سعید بن المسیب کی ایک لڑکی تھی جو صورت اور سیرت دونوں میں ممتاز تھی۔ اسی کے ساتھ اس نے وقت کے مطابق، اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ عبد الملک نے سوچا کہ ولی عہد سے اس لڑکی کا نکاح کر دیا جائے۔ اس کے بعد لڑکی کے باپ سعید بن المسیب اپنے آپ نرم پڑ جائیں گے۔ خلیفہ نے امیر مدینہ ہشام بن اسماعیل المخزومی کے ذمہ یہ کام سپرد کیا کہ وہ سعید بن المسیب کو اس رشتہ کے لئے راضی کرے۔

ہشام نے خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں سعید بن المسیب سے ملاقات کی۔ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، اس کے بعد کہا: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، عبد الملک بن مروان نے اپنے بیٹے ولید کی آئندہ خلافت کے لئے لوگوں سے بیعت لینے کا ارادہ کیا ہے، بیعت لینے سے پہلے، امیر المومنین یہ چاہتے ہیں کہ آپ ولید کو اپنی دامادی میں لے لیں۔ یہ سنتے ہی سعید بن المسیب کے چہرہ پر غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے۔ انھوں

نے کہا: مجھے ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی منظور نہیں۔

اس انکار کے بعد سعید بن المسیب کو دوبارہ مختلف قسم کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ ان پر طرح طرح سے دباؤ ڈالے گئے۔ مگر وہ برابر اپنے انکار پر قائم رہے۔ اسی کے ساتھ وہ خاموشی سے یہ سوچتے رہے کہ کوئی مناسب رشتہ سامنے آئے تو لڑکی کا عقد کر دیا جائے۔ آخر کار انھوں نے قریش کے ایک غیر معروف طالب علم ابو وداعہ کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا۔ مورخ ابن خلکان (۶۸۱ - ۶۰۸ ھ) نے ابو وداعہ کے الفاظ میں یہ واقعہ مکمل طور پر نقل کیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ ابو وداعہ کہتے ہیں :

میں سعید بن المسیب کے حلقۂ درس میں نہایت پابندی سے بیٹھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ مدت تک حاضر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد جب گیا تو انھوں نے پوچھا، اتنے دنوں تم کہاں تھے۔ میں نے جواب دیا کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے حاضر نہ ہو سکا۔ انھوں نے کہا، پھر ہمیں تم نے کیوں نہ خبر کی۔ ہم بھی اس کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوتے۔

اس کے بعد جب میں اٹھنے لگا تو انھوں نے کہا، تم نے دوسری بیوی کا کوئی انتظام کیا۔ میں نے کہا خدا آپ پر رحم فرمائے۔ کون میرے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح کرے گا جب کہ میں چند درہم سے زیادہ کی حیثیت کا آدمی نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا، اگر میں کروں تو تم کرنے کے لئے تیار رہو۔ میں نے کہا بہت خوب۔ اس سے بہتر کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ کی حمد بیان کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا اور اسی وقت دو یا تین درھم پر میرے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح پڑھا دیا۔

ابو وداعہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں وہاں سے اٹھا اور میری خوشی کا یہ عالم تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں اپنے مکان پر پہنچا اور اس فکر میں پڑ گیا کہ اب رخصتی وغیرہ کے لئے قرض کہاں سے حاصل کروں۔ میں نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس دن میں روزہ سے تھا۔ نماز کے بعد میں نے چاہا کہ کھانا کھاؤں جو کہ روٹی تھا اور زیتون کا تیل۔ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ آواز آئی "سعید" میں نے سعید بن مسیب کو چھوڑ کر اس نام کے ہر شخص کا تصور کیا۔ کیوں کہ سعید بن مسیب تو چالیس برس سے اپنے گھر اور مسجد کے علاوہ کہیں دیکھے نہیں گئے تھے۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہاں سعید بن مسیب کھڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر معاً خیال ہوا کہ شاید ان کا خیال بدل گیا ہے اور وہ فسخ نکاح کرانے آئے ہیں۔

میں نے کہا " اے ابو محمد، آپ نے کیوں زحمت فرمائی۔ مجھے بلا بھیجا ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، اس وقت مجھ کو ہی تمہارے پاس آنے کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا پھر کیا حکم ہے؟ انھوں نے کہا، مجھے خیال آیا کہ تم اپنے گھر میں تنہا ہو گے، حالاں کہ اب تو تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ مجھے گوارا نہیں ہوا کہ تم تنہا رات بسر کرو، اور یہ ہے تمہاری بیوی "۔ اس وقت ابن مسیب کی صاحبزادی ٹھیک ان کے پیچھے کھڑی تھیں۔ انھوں نے صاحبزادی کو دروازہ کے اندر کر کے باہر سے خود ہی دروازہ بند کر دیا اور واپس چلے گئے۔

میری بیوی شرم کے مارے گر پڑی، پھر میں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور اس کے بعد چھت پر چڑھ کر پڑوسیوں کو آواز دی۔ وہ لوگ جمع ہوئے اور پوچھا قصہ کیا ہے۔ میں نے کہا، سعید بن مسیب نے آج اپنی لڑکی کا عقد میرے ساتھ کر دیا۔ اور آج ہی اچانک وہ اسے میرے گھر بھی پہنچا گئے۔ اور وہ یہاں گھر میں موجود ہے۔ لوگوں نے آکر اسے دیکھا اور میری ماں کو خبر ہوئی تو وہ بھی آگئیں اور انھوں نے کہا، اس کو چھونا تمہارے لئے حرام ہے جب تک میں حسب دستور تین دن تک اسے بنا سنوار نہ لوں۔ چنانچہ میں تین دن تک رکا رہا۔ اس کے بعد اس کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک حسین وجمیل خاتون ہے۔ کتاب اللہ کی حافظ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عالم ہے۔ اور حقوق شوہری کو خوب پہچاننے والی ہے۔

ابو وداعہ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد ایک ماہ تک میں گھر ہی پر رہا۔ اس دوران میں سعید بن مسیب کا نہ کوئی حال ملا اور نہ ان سے ملاقات ہوئی۔ پھر ایک مہینہ کے بعد میں ان کی صحبت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہاں مجلس قائم تھی۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد کوئی بات چیت نہ کی۔ یہاں تک کہ جو لوگ مسجد میں تھے سب چلے گئے۔ اس کے بعد جب میرے سوا کوئی وہاں نہیں رہ گیا تو انھوں نے پوچھا۔ تمہارے ساتھی کا کیا حال ہے۔ میں نے کہا، بہترین حال ہے۔ انھوں نے فرمایا: ان رابك شئ فالعصا۔ یعنی وہ کوئی ناپسندیدہ حرکت کرے تو اس کو مارو۔

پھر میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ اور یہ سعید بن مسیب کی لڑکی وہ تھی جس کے لئے خلیفہ عبد الملک بن مروان نے اپنے لڑکے ولید کا پیغام دیا تھا جب اس نے اس کو ولی عہد بنایا تھا، تو سعید بن مسیب نے شہزادہ ولید سے رشتہ کرنے سے انکار کیا۔ جس کی وجہ سے عبد الملک سعید بن مسیب کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ سخت سردی کے دن میں انھیں کوڑے سے پیٹا گیا اور اوپر سے ٹھنڈا پانی ڈالا گیا۔

مسلم جج

قاضی شُریک بن عبید اللہ بن الحارث النخعی مشہور عالم اور فقیہ ہیں۔ وہ بخاریٰ میں ۹۵ ھ (۸۱۳ ء) میں پیدا ہوئے۔ کوفہ میں ۱۷۷ھ (۸۹۴) میں ان کی وفات ہوئی۔ خلافت عباسی کے زمانہ میں ۱۵۳ھ میں وہ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے۔

قاضی شریک کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک عورت ان کے پاس یہ شکایت لے کر آئی کہ کوفہ کے حاکم موسیٰ بن عیسیٰ (خلیفہ مہدی کے چچا) کے ہاتھ جب وہ اپنا باغ فروخت کرنے پر راضی نہیں ہوئی تو انھوں نے اپنے غلاموں کو حکم دیا اور انھوں نے باغ کے حدود اور نشانات مٹا دیے اور اس کو امیر موسیٰ کے باغ میں ملا دیا۔

قاضی شریک نے امیر موسی کے یہاں کہلوایا کہ وہ عدالت میں عورت کے ساتھ حاضر ہوں۔ امیر نے کوفہ کے پولیس افسر کو قاضی کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان سے گزارش کریں کہ وہ اس معاملہ میں دخل دینے سے باز رہیں۔ قاضی نے پولیس افسر کو پکڑ کر قید کر دیا۔ جب امیر موسی کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے بعض درمیانی افراد کو بھیجا۔ انھوں نے قاضی کو ان کے اس فعل پر ملامت کی۔

قاضی شریک نے ان لوگوں سے کہا کہ امیر نے کیوں اپنے آپ کو عدالت کی حاضری سے بالاتر سمجھا۔ کیا عدالت صرف عوام کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے ہے۔ عدالت بلاشبہ بڑے اور چھوٹے کے درمیان فرق نہیں کرے گی۔ اور تم نے عدالت کے معاملہ میں مداخلت کی ہے۔ ضروری ہے کہ تم کو اس کی سزا دی جائے۔ پھر قاضی نے ان لوگوں کو قید کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد امیر موسی اپنے محافظ سواروں کے ساتھ قید خانہ گئے اور قیدیوں کو بزور اس سے نکال دیا۔

اس کے بعد قاضی شریک سفر کر کے بغداد گئے۔ تاکہ خلیفہ مہدی سے ملیں اور اس سے یہ کہیں کہ وہ ان کو قضاء کے عہدہ سے الگ کر دے۔ انھوں نے خلیفہ سے کہا: خدا کی قسم، میں نے بنو عباس سے قاضی کا عہدہ نہیں مانگا تھا، خود انھیں نے مجھ کو یہ عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا، اور انھوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم با اختیار اور آزاد ہوں گے۔ اگر ہم کو قاضی بنایا گیا تو ہم اپنے فیصلے پوری طرح عدل کے مطابق کریں گے۔ مگر اب قاضی کے عہدہ پر باقی رہنے کی کوئی صورت

نہیں ہے جب کہ ہم دیانت دارانہ فیصلہ کرنے میں بے بس ہیں۔

پھر امیر موسی نے قاضی سے ملاقات کی اور ان سے مہربانی کی درخواست کی۔ قاضی شریک نے کہا کہ میرے نزدیک اس کا حل صرف یہ ہے کہ وہ تمام لوگ دوبارہ قید خانہ میں لوٹائے جائیں جن کو قید کیے جانے کا میں نے حکم دیا تھا۔ چنانچہ امیر موسی نے مجبور ہو کر تمام لوگوں کو دوبارہ قید خانہ میں واپس کیا۔ اور خود عورت کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوئے۔ پھر قاضی شریک نے یہ فیصلہ دیا کہ امیر عورت کے باغ کو اسے لوٹائے اور جو حدود اور نشانات ڈھا دیے گئے تھے ان کو دوبارہ قائم کرے۔ چنانچہ اس حکم کا نفاذ کیا گیا :

روی ان القاضی (شریك بن عبید الله) قد شکت الیه امرأة من انها عندما امتنعت عن بیع بستانها للامیر موسی بن عیسی عم امیر المومنین المهدی امر غلمانه فأزالوا حدود بستانها ومعالمه — وخلطوه ببستانه، فارسل یستدعی الامیر للحضور فی مجلس القضاء مع المرأة۔ فارسل الامیر رئیس الشرطة بالکوفة لیطلب منه العدول عن هذا فحبس رئیس الشرطة، ولما علم الامیر بذلك بعث بعض الوسطاء یعتبون علی القاضی فقال لهم (شریك) لماذا ترفع الامیر عن الحضور الی مجلس الحکم؟ هل نصب القضاء للفصل بین العامة فحسب، ان العدالة لا تفرق بین امیر و صغیر، وانتم بتداخلکم فی امر القضاء لا بد ان یحل بکم جزاء، ثم امر بحبسهم۔ فذهب الامیر فی رکب من حراسه الی السجن واخرج المسجونین عنوة فاعد القاضی نفسه للسفر الی بغداد للقاء الخلیفة المهدی لیطلب اعفاءه من القضاء قائلا: (والله ماطلبت من بنی العباس ولایة القضاء، وانما هم الذین اکرهونا علیها۔ ولقد وعدونا ان نکون اعزة احرارا نتوخی العدل فی احکامنا ان تولینا القضاء۔ اما الآن فلا سبیل الی البقاء فی مجلس الحکم مادمنا عاجزین عن اداء الامانة) فلحق به الامیر واخذ یستعطفه فقال: الحل عندی ان یرد الی السجن جمیع من امرت بسجنهم فاضطر الامیر الی اعادتهم الی السجن والی حضور مجلس القضاء مع المرأة، وحکم علیه شریك برد البستان، واقامة الحدود والمعالم التی هدمت فنفذ الحکم۔

بارش شروع ہوگئی

چوتھی صدی ہجری کا واقعہ ہے ۔ اندلس میں سلطان عبدالرحمٰن الناصر کی حکومت تھی ۔ اس کا دارالسلطنت قرطبہ تھا ۔ قاضی منذر بن سعید اس وقت قرطبہ کے قاضی تھے اور اسی کے ساتھ وہ قرطبہ کی جامع مسجد میں نماز کی امامت کی خدمت بھی انجام دے رہے تھے ۔ وہ بہت اچھے خطیب تھے اور اسی کے ساتھ بہت بڑے عالم بھی ۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کو عمارتوں کا بہت شوق تھا ۔ اس نے الزہرار کے نام سے ایک شاہی بستی بسائی اور اس میں شاندار محل تعمیر کئے ۔ ان تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان اتنا مشغول رہا کہ مسلسل تین جمعہ میں وہ مسجد نہ پہنچ سکا ۔ چوتھے جمعہ کو جب وہ جامع مسجد آیا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر نے جو خطبہ دیا اس میں نام لئے بغیر سلطان پر سخت تنقید کی ۔ قاضی منذر نے ایسی آیتیں پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑی کرنے اور آخرت سے غافل ہو جانے پر وعیدیں تھیں ۔ مثلاً : کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شاندار محل بناتے ہو گویا کہ تم کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے ۔ اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جبار انہ حملہ کرتے ہو ۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو (شعراء) تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اس کو لے کر جہنم کی آگ میں جا گری ۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا ۔ یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے ، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی یہاں تک کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں ۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے (توبہ) اسی طرح قاضی منذر نے اس مضمون کی بہت سی حدیثیں سنائیں اور ان کی تشریح کی ۔ اپنے خطبہ میں اگرچہ انھوں نے سلطان کا نام نہیں لیا مگر مسجد کا ہر نمازی سمجھ رہا تھا کہ ان سخت تنقیدوں کا مخاطب کون ہے اور وہ کس کے اوپر پڑ رہی ہیں ۔

تنقید یوں بھی آدمی کے اوپر بہت سخت ہوتی ہے اور جب مجمع عام میں کسی پر تنقید کی جائے تو وہ اور بھی زیادہ ناگواری کا باعث ہوتی ہے ۔ مزید یہ کہ یہ تنقید ایک ماتحت کی زبان سے اپنے حاکم کے اوپر تھی ۔ اور جب کوئی حاکم اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس پر کبر کا سخت دورہ پڑتا ہے ۔ بڑے بڑے شریف اور دیندار لوگ بھی اس وقت قابو سے باہر ہو جاتے ہیں ۔ مگر سلطان نے حد درجہ ضبط سے کام لیا ۔ اگرچہ

سلطان پر اس تنقید کا بہت زیادہ اثر تھا مگر وہ مسجد میں کچھ نہ بولا اور نماز کے بعد خاموشی سے اٹھ کر باہر آگیا۔

گھر پہنچ کر سلطان نے اپنے لڑکے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ ان کے پیچھے جمعہ کی نماز کبھی نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے کہا: قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ ان کو معزول کر دیجئے اور ان کی جگہ دوسرا کوئی امام مقرر کر دیجئے جو ایسی گستاخی نہ کرے۔ یہ سن کر سلطان غصہ میں آگیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا: تمھارا برا ہو، ایک شخص جو ہدایت سے دور ہے اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہے کیا اس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے آدمی کو معزول کر دیا جائے گا۔ یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی (هذا ما لا يكون) مجھے ان کی باتوں سے چوٹ لگی اس لئے میں نے ان کے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھالی۔ میری خواہش ہے کہ اس قسم کے کفارہ کی کوئی صورت نکل آئے۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے (بل يصلي بالناس حياتنا وحياته انشاء الله تعالى) چنانچہ قاضی منذر بدستور جمعہ کی نماز پڑھاتے رہے۔ عبدالرحمٰن الناصر کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے نے بھی ان کے مقام کو اسی طرح باقی رکھا۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑا۔ بہت سخت حالات پیدا ہو گئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر بن سعید کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ استسقار کی نماز پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے۔ قاضی منذر نے سلطان کے قاصد سے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے مگر وہ خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے کہا: آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مٹی کے فرش پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے اور اللہ سے کہہ رہے تھے: خدایا میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا حالاں کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (هذه ناصيتي بيدك، اتراك تعذب بي الرعية وانت ارحم الراحمين)

یہ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان ظاہر ہو گیا۔ انھوں نے قاصد سے کہا: اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ اب ضرور بارش ہو گی۔ کیوں کہ زمین کا حاکم جب تضرع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قاصد واپس ہو کر گھر پہنچا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

امکان ختم نہیں ہوتا

عبدالرحمٰن بن معاویہ ابن ہشام (۱۷۲-۱۱۳ھ) بنو امیہ کا ایک شہزادہ تھا۔ وہ نہایت ذہین اور باصلاحیت تھا۔ چنانچہ اس کی تربیت ابتدا ہی سے نہایت شاہانہ انداز میں کی گئی۔ اس کو اس طرح تیار کیا گیا کہ جب وہ بڑا ہو تو کامیابی کے ساتھ تخت خلافت پر بیٹھ سکے۔

مگر ۱۳۲ھ میں بنوامیہ کی خلافت ختم ہو کر بنوعباس کی خلافت شروع ہو گئی۔ اس وقت عبدالرحمٰن کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ جب عباسی لشکر شام میں داخل ہو کر دمشق پر قابض ہو گیا اور بنو امیہ کا قتل عام ہونے لگا اس وقت اتفاق سے عبدالرحمٰن دمشق میں موجود نہ تھا۔ بلکہ باہر دریائے فرات کے کنارے ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ یہاں دریا کے کنارے اس کی جاگیر تھی اور اس کے باغات وغیرہ تھے۔ اس وقت وہ یہیں پر مقیم تھا۔

عبدالرحمٰن کو جب معلوم ہوا کہ بنو امیہ کے افراد کا قتل عام ہو رہا ہے تو وہ یہاں درختوں کے جھنڈ میں خیمہ لگا کر چھپ گیا۔ ایک روز وہ اپنے خیمہ میں تھا کہ اس کا چار سال کا لڑکا خوف زدہ حالت میں خیمہ میں آیا۔ معلوم ہوا کہ بنوعباس کے سپاہی اس کو تلاش کرتے ہوئے اس باغ تک پہونچ گئے ہیں۔ عبدالرحمٰن نے اپنے بچہ کو گود میں اٹھایا اور دریا کی طرف بھاگا۔ وہ دریا میں کود پڑا اور تیرتا ہوا اس کے دوسرے کنارے پر پہونچ گیا۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ دمشق سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم کئی سال تک اس کی زندگی نہایت مصیبت کی زندگی رہی۔ دشمن سے بچنے کے لیے دریا میں کودنا، جنگلوں میں پناہ لینا، بھوکے پیاسے ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف بھاگنا، یہ اس کی زندگی تھی۔ اسی حال میں وہ سبطہ پہونچا جو افریقہ کے ساحل پر واقع تھا۔

بظاہر عبدالرحمٰن کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی بنتے بنتے بگڑ گئی تھی۔ بچپن کی عمر میں جس کا یہ حال تھا کہ تخت خلافت اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جوانی کی عمر کو پہونچ کر اس کے لیے زمین میں ایک گوشہ بھی نہیں رہا جہاں وہ سکون کی زندگی گزار سکے۔

مگر مایوسی کی آخری حد پر پہونچ کر اس کے لیے امید کی روشنی پیدا ہوگئی۔ عین اسی زمانہ میں اندلس کے مسلمان بے سردار ہو کر آپس میں لڑ رہے تھے۔ دمشق کے مرکز خلافت سے دور ہونے کی وجہ سے یہ حال تھا کہ دمشق اور قرطبہ کے درمیان ایک پیغام کے آنے جانے میں اکثر مہینوں لگ جاتے تھے۔ اس بنا پر اندلس کے اوپر دمشق کی مضبوط گرفت باقی نہیں رہی تھی۔

اندلس کے یہ حالات عبدالرحمٰن بن معاویہ کے لیے ایڈوانٹیج بن گیے۔ وہ آبنائے جبرالٹر کو پار کرکے اندلس پہونچا۔ وہاں کے مسلمانوں کو ایک سردار کی ضرورت تھی۔ عبدالرحمٰن اپنی شخصی قابلیت نیز بنوامیہ کا ولی عہد ہونے کی وجہ سے بہت جلد وہاں کے لوگوں کا مرجع بن گیا اور بالآخر اس نے اندلس میں مضبوط مسلم سلطنت قائم کی۔ یہی امیر عبدالرحمٰن اندلس کی علمی اور تہذیبی ترقیوں کا بانی ہے۔ وہ شخص جس کی تاریخ دمشق میں ختم ہو چکی تھی اس نے اپنی حوصلہ مندی کی بنا پر قرطبہ میں اپنی ایک نئی شاندار تر تاریخ بنائی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی کسی کے لیے امکان ختم نہیں ہوتا۔ جہاں ایک موقع ختم ہو وہیں دوسرا زیادہ بہتر موقع اس کے لیے موجود رہتا ہے۔ جب ایک تاریخ اختتام پر پہونچتی ہے تو وہیں دوسری تاریخ کے آغاز کے امکانات شروع ہو جاتے ہیں۔

مگر نئے امکانات کبھی اپنے آپ واقعہ نہیں بنتے۔ ان کو استعمال کرکے انھیں واقعہ بنانے کے لیے ایک حوصلہ مند انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آدمی اپنی ہمت نہ کھوئے، اگر وہ نئی جدوجہد کی ضروری شرطیں پوری کرنے کے لیے تیار ہو تو اس کے لیے ناکامی کا سوال نہیں۔ یہ دنیا خدا نے اسی لیے بنائی ہے کہ آدمی یہاں جدوجہد کرکے کامیاب ہو۔ اب جو شخص ناکام ہوتا ہے وہ اپنی نادانیوں سے ناکام ہوتا ہے، وہ خود اپنی کوتاہیوں کی سزا بھگتتا ہے۔

"انسان کے لیے کبھی امکان ختم نہیں ہوتا" یہ جملہ اتنا ہی بامعنیٰ ہے جتنا یہ کہنا کہ "اس دنیا میں کبھی صبح کا آنا بند نہیں ہوتا"۔ جس طرح ہر رات کے بعد صبح کا آنا یقینی ہے اسی طرح ہر ناکامی کے بعد دوبارہ کامیابی کا دور آنا یقینی ہے۔ تاہم رات کے بعد نئی صبح لانے کے لیے زمین و آسمان کو عظیم گردش کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح کسی آدمی کی زندگی میں ناکامی کے بعد کامیابی اس وقت آتی ہے جب کہ وہ اس کی خاطر عظیم جدوجہد کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اسلامی حکمراں

صلاح الدین ایوبی (۱۱۳۸ - ۱۱۹۳) مصری سلطان کی فوج میں معمولی سپاہی تھے۔ اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے وہ ۳۱ سال کی عمر میں مصری افواج کے سپہ سالار مقرر کیے گئے۔ اسی کے ساتھ انھیں مصر کا وزیر بھی بنا دیا گیا اور انھیں مَلِک کا خطاب دیا گیا۔ بعد کو ایک انقلاب کے نتیجہ میں وہ مصر کے خود مختار سلطان ہوگیے۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ طویل صلیبی جنگوں کے درمیان یورپ کی مسیحی طاقتوں نے یروشلم (فلسطین) پر قبضہ کرلیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے مسلم حکمرانوں میں یہ تبلیغ کی کہ وہ اپنی متحدہ کوشش ہی سے مسیحی یلغار کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ چنانچہ وہ مصر، شام وغیرہ ممالک کو متحد کرنے میں کامیاب ہوگیے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے پوری قوم میں جہادی روح پیدا کردی۔ انھوں نے زبردست تیاری کے بعد جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین (فلسطین) کے مقام پر مسیحی افواج پر حملہ کیا اور ان کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین کی فوجوں نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ یروشلم تک پہونچ گئیں اور بالآخر یروشلم کو فتح کرکے فلسطین کو دوبارہ اسلامی خلافت کا حصہ بنا دیا۔

تاہم سلطان صلاح الدین کی فوجی کارروائی نمایاں طور پر مسیحی اقوام کی کارروائیوں سے مختلف تھی۔ مسیحی اقوام نے فلسطین پر قبضہ کرنے کے بعد نہایت وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اس کے برعکس سلطان صلاح الدین ایوبی نے مکمل ضبط سے کام لیا۔ انھوں نے کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اس سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

Saladin's crowning achievement and the most disastrous blow to the whole crusading movement came on October 2, 1187, when Jerusalem, holy to both Muslim and Christian alike, surrendered to the Sultan's army after 88 years in the hands of the Franks. In stark contrast to the city's conquest by the Christians, when blood flowed freely during the barbaric slaughter of its inhabitants, the Muslim reconquest was marked by the civilized good faith and courteous behaviour of Saladin and his troops.

Encyclopaedia Britannica, 1984 Volume 16, p. 177

صلاح الدین کی شاندار کامیابی اور پوری صلیبی تحریک کی سب سے زیادہ تباہ کن شکست ۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو ظہور میں آئی جب کہ یروشلم، جو کہ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک مقدس ہے، وہ ۸۸ برس تک مسیحیوں کے قبضہ میں رہنے کے بعد دوبارہ سلطان کی فوجوں کے قبضہ میں آگیا۔ مسیحیوں نے جب شہر پر قبضہ کیا تھا تو انھوں نے وحشیانہ طور پر اس کے باشندوں کو قتل کیا اور آزادانہ طور پر لوگوں کا خون بہایا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ مہذب انسانوں کا قبضہ تھا، صلاح الدین اور اس کی فوجوں نے مفتوح کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کیا۔

رعایا کے ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی کا یہ انصاف محض اتفاقی نہ تھا۔ یہ اس کی اسلامیت کا نتیجہ تھا۔ صلاح الدین صرف ایک بہادر اور حوصلہ مند شہسوار ہی نہ تھا۔ وہ ایک خداترس اور عبادت گذار آدمی تھا۔ اس کا ذہن اسلامی تعلیمات کے تحت بنا تھا۔

اسلامی تعلیمات کے اثر سے سلطان صلاح الدین کا یہ حال تھا کہ وہ دنیا سے زیادہ آخرت کو اہمیت دیتا تھا۔ وہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ قیامت میں اس سے اس کی رعایا کے بارہ میں پوچھ ہوگی۔ اسلام اس کے لیے اس میں مانع بن گیا تھا کہ اس کے اندر گھمنڈ کا مزاج پیدا ہو۔ اس کے برعکس اس کے اندر زہد اور تواضع کا مزاج تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے سلطان صلاح الدین کے زہد و تقویٰ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے :

> --- and on March 4, 1193, he died. While his relatives were already scrambling for pieces of the empire, his friends found that the most powerful and most generous ruler in the Muslim world had not left enough money to pay for his grave. (16/178)

اور ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو صلاح الدین کا انتقال ہوگیا۔ جب کہ اس کے رشتہ دار ابھی سلطنت کے ٹکڑوں کے لیے آپس میں کش مکش کر رہے تھے، اس کے دوستوں نے پایا کہ مسلم دنیا کے سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ فیاض حکمراں نے اپنے پیچھے اتنی رقم بھی نہیں چھوڑی ہے جو اس کی قبر کے اخراجات کو پورا کر سکے۔

اسلام ایک طرف انسان کی صلاحیتوں کو ترقی دیتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کو اس سے روکتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کے استعمال میں حد سے تجاوز کرنے لگے۔

اختلاف کے باوجود

اموی خاندان کے ایک نوجوان عبدالرحمٰن نے ۷۵۶ء میں اسپین میں بنوامیہ کی سلطنت کی بنیاد رکھی، اس کا دارالسلطنت قرطبہ تھا۔ اسی خاندان میں ایک سلطان الحکم گزرا ہے۔ اس نے ۹۶۱ء سے لے کر ۹۷۶ء تک اسپین میں حکومت کی۔

الحکم کو مسلم اسپین کا سب سے بڑا حکمراں کہا جاتا ہے۔ مورخ ابن اثیر نے اس کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں: کان محبا لاهل العلم، عالما، فقيها في المذاهب، عالما بالانساب والتواريخ، جماعا للكتب والعلماء (وہ اہل علم کو دوست رکھتا تھا۔ عالم اور فقیہ تھا۔ انساب اور تاریخ کا ماہر تھا۔ کتابوں اور علماء کو اپنے پاس جمع رکھتا تھا) الکامل فی التاریخ ۶۷۷/۸

الحکم کی علم پسندی نے اس کو اہل علم کا بے حد قدرداں بنا دیا تھا۔ وہ اہل علم کو نہایت عزت اور احترام کا درجہ دیتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک عالم اگر اس کی ذات پر تنقید کرے یا اس کی مرضی کا لحاظ نہ کرے تب بھی اس کی قدردانی میں کمی نہیں آتی تھی۔ اپنے تمام تر جاہ وجلال کے باوجود وہ اہل علم کے آگے جھک جاتا تھا۔ اس کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

الحکم کے زمانہ میں ایک عالم تھے جن کا نام ابو ابراہیم تھا۔ ایک روز وہ قرطبہ کی مسجد ابو عثمان میں وعظ بیان کر رہے تھے۔ عین اس وقت سلطان کا ایک قاصد مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے کہا کہ اے ابو ابراہیم، امیر المومنین باہر آپ کے انتظار میں ہیں۔ اور آپ کو اسی وقت بلا رہے ہیں۔ ابو ابراہیم نے بے پروائی کے ساتھ اس شخص کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ تم جا کر امیر المومنین سے کہہ دو کہ ابو ابراہیم اس وقت اللہ کے کام میں مصروف ہے۔ وہ جب تک اس کام سے فارغ نہ ہو جائے، آپ کے پاس نہیں آ سکتا۔

الحکم کے قاصد کو یہ جواب سن کر حیرانی ہوئی۔ وہ سلطان کی طرف واپس گیا اور ڈرتے ڈرتے اس کو ابو ابراہیم کا جواب سنایا۔ قاصد کی توقع کے خلاف، الحکم نے اس کا کوئی برا اثر نہیں لیا۔ اور کسی خفگی کے بغیر کہا کہ تم جا کر ابو ابراہیم سے میرا یہ پیغام کہہ دو کہ ان کی اس

بات کو سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے کہ وہ اللہ کے کام میں مصروف ہیں۔ جب ان کو اس کام سے فراغت ہو جائے تو اس وقت وہ میرے پاس آجائیں۔ میں دربار میں ان کا انتظار کروں گا۔

شاہی قاصد نے دوبارہ مسجد میں آکر ابو ابراہیم کو الحکم کا پیغام سنایا۔ ابو ابراہیم نے کہا کہ تم جاکر امیرالمومنین سے کہہ دو کہ میں بڑھاپے کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ پیدل چل کر ان کے پاس آؤں یا گھوڑے کی سواری کروں۔ باب السدّہ جو کھلا ہوا ہے وہ یہاں سے کافی دور ہے۔ باب الصنع قریب ہے مگر وہ بند رہتا ہے۔ اگر امیرالمومنین باب الصنع کھولنے کی اجازت دے دیں تو میں اس دروازہ سے ان کے پاس آجاؤں گا۔

باب الصنع ایک مخصوص دروازہ تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا۔ کسی ہنگامی موقع پر ہی اس کو کھولنے کی اجازت ہوتی تھی۔ ابو ابراہیم مذکورہ پیغام دے کر اپنے وعظ میں مصروف ہو گئے۔ دوسری طرف مذکورہ قاصد الحکم کے پاس گیا اور اس کو ابو ابراہیم کا پیغام پہنچایا۔ الحکم نے قاصد سے کہا کہ تم جاکر مسجد میں بیٹھ جاؤ اور جب وہ اپنا وعظ ختم کر لیں تو ان کو باب الصنع کے راستہ سے گزار کر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ قاصد واپس آکر مسجد میں بیٹھا رہا۔ ابو ابراہیم نے جب اپنا وعظ ختم کیا تو اس نے ان سے کہا کہ باب الصنع آپ کے لیے کھول دیا گیا ہے اور امیرالمومنین آپ کے منتظر ہیں۔ اس کے بعد ابو ابراہیم مسجد سے نکلے اور چلتے ہوئے باب الصنع پر پہنچے۔ وہاں امراء اور درباریوں کی بڑی تعداد ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ ابو ابراہیم دربار کے اندر داخل ہوئے۔ الحکم نے کچھ دیر تک ان سے باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ اسی باب الصنع سے عزت و احترام کے ساتھ واپس ہو گئے۔

دورِ اول میں جو اسلامی انقلاب آیا۔ اس کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس نے لوگوں میں اکابر پرستی کے بجائے خدا پرستی پیدا کر دی۔ اس نے لوگوں میں یہ مزاج بنایا کہ وہ چیزوں کو شخصیتوں کی نسبت سے دیکھنے کے بجائے حقیقتوں کی نسبت سے دیکھیں۔ یہ فکری انقلاب اتنا طاقت ور تھا کہ بعد کو جب مسلمانوں میں خلفاء کے بجائے سلاطین ہونے لگے اس وقت بھی لوگ ملوک اور سلاطین پر کھلی تنقیدیں کرتے تھے اور کسی کو بھی اس پر ٹوکنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

پکار کے وقت

تھیوفیلس (Theophilus) بازنطینی سلطنت کے آخری دور کا حکمراں ہے۔ اس کا مرکز سلطنت قسطنطنیہ تھا۔ اس کا زمانہ حکومت ۸۲۹ء تا ۸۴۲ء ہے۔ تھیوفیلس عباسی خلیفہ المعتصم کا ہم عصر تھا۔

دور اوّل کے مسلمانوں نے قدیم رومی (بازنطینی) سلطنت کے بڑے حصہ کو پہلی صدی ہجری میں فتح کر لیا تھا۔ تاہم قسطنطنیہ اب بھی بازنطینی حکمراں کے قبضہ میں تھا۔ موجودہ ترکی کے ایک حصہ پر اب بھی اس کی حکومت قائم تھی۔

قسطنطنیہ کا بازنطینی بادشاہ تھیوفیلس ۲۲۳ھ (۸۳۸ء) میں ایک بڑا لشکر لے کر نکلا اور مسلم علاقہ میں پہونچ کر زبطرہ پر چھاپہ مارا۔ اسی کے ساتھ اس نے ملطیہ کے مسلم قلعہ پر حملہ کیا۔ ان حملوں میں اس نے بہت سے مسلمان مردوں اور عورتوں کو قتل کیا۔ انھیں گرفتار کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ لوگوں کا مُثلہ کیا۔

اس موقع پر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ بازنطینی سپاہیوں نے ایک عربی عورت کو پکڑا اور اس کو گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ عورت چلا اٹھی۔ اس کی زبان سے نکلا: وامعتصماہ (ہائے معتصم)

خلیفہ المعتصم اس وقت بغداد میں تھا۔ وہاں سے آنے والوں نے خلیفہ کو بازنطینی حکمراں کے مظالم کی خبریں بتائیں۔ اسی کے ساتھ مذکورہ عرب عورت کا قصہ بھی بتایا۔ المعتصم اس کو سن کر تڑپ اٹھا۔ اس وقت وہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وامعتصماہ کا لفظ سنا تو اسی وقت لبیك لبیك کہتے ہوئے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے محل کی چھت پر چڑھا اور پکار کر کہا: النفیر، النفیر (کوچ، کوچ)

اس کے بعد المعتصم نے زبردست تیاری کی اور ایک طاقت ور فوج کو لے کر مقام حادثہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ وہ عموریہ (Amorium) پہونچ گیا۔ عموریہ (ترکی) اس وقت بازنطینیوں کے قبضہ میں تھا اور یہاں ان کا قلعہ تھا۔ المعتصم نے قلعہ کو گھیر لیا اور حکم دیا کہ منجنیق کے ذریعہ اس پر گولے برسائے جائیں۔ یہاں تک کہ اس کی دیواریں ٹوٹ گئیں۔ المعتصم اپنی فوج کو لے کر قلعہ کے اندر داخل ہو گیا۔ اہل قلعہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ المعتصم نے تمام مسلم قیدیوں کو چھڑایا اور اس عرب عورت کو بھی قید سے رہا کیا جس نے اس سے پہلے وامعتصماہ کہہ کر خلیفہ کو پکارا تھا۔

مظلوم کی پکار پر دوڑنا زندہ انسان کی خاص علامت ہے ۔ ایک شخص جس کے اندر انسانی جوہر موجود ہو ۔ جو اپنے مردانہ اوصاف پر قائم ہو ، وہ ایسی کسی پکار کو نظر انداز کرنے کا تحمل نہیں کر سکتا ۔ یہی وہ انسانی صفت ہے جس کے بارہ میں عرب شاعر نے کہا ہے کہ ان کا بھائی جب اپنی کسی مصیبت پر انھیں پکارے تو اس وقت وہ تفصیل نہیں پوچھتے ، وہ فوراً اس کی مدد پر دوڑ پڑتے ہیں :

لا یسئلون اخاھم حین یندبھم　　فی النائبات علی ما قال برھانا

مظلوم کی مدد کرنا یا مظلوم کی پکار پر دوڑنا ایک فطری صفت ہے ۔ جن لوگوں کی فطرت زندہ ہو، ان کے اندر یہ انسانی خصوصیت بھی ضرور زندہ ہوگی ۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی فطرت کے اعتبار سے زندہ ہو اور اس کے اندر یہ صفت نہ پائی جائے ۔

قومی تعصب یا ذاتی تعلق کے تحت ہر آدمی اپنے لوگوں کی مدد کے لیے دوڑتا ہے ۔ مگر اس قسم کے دوڑنے کو کوئی اعلیٰ اخلاقی صفت نہیں کہا جاسکتا ۔ اعلیٰ اخلاقی صفت کا درجہ صرف اس دوڑنے کو حاصل ہے جو ذاتی تعلق یا قومی تعصب جیسی چیزوں سے بلند ہو ۔ جب کہ آدمی اس لیے دوڑ پڑے کہ پکارنے والا مظلوم ہے ، نہ اس لیے کہ ذاتی مفاد یا جماعتی حمیت کا تقاضا ہے کہ اس کی پکار پر دوڑا جائے ۔

مومن ایک با اصول انسان ہوتا ہے ۔ دوسرے لوگ مفاد کے لیے تڑپتے ہیں، مومن اصول کے لیے تڑپتا ہے ۔ دوسرے لوگ اپنی ذات کے لیے عمل کرتے ہیں ، مومن اپنے سوا دوسروں کے لیے عمل کرتا ہے ۔ عام آدمی اس وقت حرکت میں آتا ہے جب کہ اس کی اپنی ذات کے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہو ۔ جب کہ مومن کو صرف یہ بات متحرک کر دینے کے لیے کافی ہے کہ انسانی اصولوں میں سے کوئی اصول ٹوٹ گیا ہے ۔

المعتصم کے جس واقعہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ، اس کا حوالہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (IX/939, 3/559) میں مختصر طور پر موجود ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تھیوفلس کو ایک خونی جنگ میں جولائی ۸۳۸ میں شکست ہوئی :

Theophilus was defeated in a bloody battle at Dazmana in July 838.

اسلامی شجاعت

حطین کی جنگ (۱۱۸۷) تاریخ کی مشہور جنگ ہے۔ حطین شمالی فلسطین کا ایک مقام ہے۔ صلاح الدین ایوبی نے اسی مقام پر اپنی غیر معمولی جنگی منصوبہ بندی کے ذریعہ صلیبی فوجوں پر فتح حاصل کی۔ اس وقت مسلم فوج کی تعداد ۱۸ ہزار تھی، اور عیسائی فوج کی تعداد ۱۵ ہزار۔ جنگ میں بیشتر عیسائی فوجی مارے گئے۔ اور مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔

جنگ کے بعد بہت سے عیسائی سردار گرفتار ہوئے۔ ان میں یروشلم کا بادشاہ (Guy de Lusignan) اور فرانسیسی جنرل ریجنالڈ (Reginald) بھی شامل تھا۔ ریجنالڈ کے متعلق مورخین متفق ہیں کہ اس نے صلاح الدین ایوبی کے ساتھ بار بار غدر کا معاملہ کیا تھا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے لکھا ہے کہ ریجینالڈ ۱۱۴۷ء اور ۱۱۸۷ء کے درمیان ہونے والی صلیبی لڑائیوں میں اہم فوجی شخصیتوں میں سے ایک تھا جس کی صلح کی مدت کے دوران مسلم قافلوں پر ناعاقبت اندیشانہ حملوں کی پالیسی آخر کار یروشلم کی لاتینی بادشاہت کی بربادی اور اس کے بیشتر علاقوں کے کھوئے جانے کا سبب بنی:

> One of the leading military figures of the Crusades between 1147 and 1187, whose reckless policy in raiding Muslim caravans during periods of truce led to the virtual destruction of the Latin Kingdom of Jerusalem and the loss of most of its territory (VIII/480).

مورخ ابن شداد نے لکھا ہے کہ ریجنالڈ نے ایک بار مسلم قافلہ پر دھوکے سے حملہ کیا۔ انھوں نے اس کو خدا کا واسطہ دلایا۔ اور اس معاہدہ صلح کا واسطہ دیا جو اس کے اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ مگر ریجنالڈ نے کہا کہ اپنے محمد سے کہو، وہ تمہیں بچائے۔ یہ خبر جب صلاح الدین ایوبی تک پہونچی تو اس نے نذر مانی کہ اللہ جب اس کے اوپر مجھے فتح دے گا تو میں خود اس کو قتل کروں گا (انه لما غدر بالقافلة ناشدوا الله والصلح الذي بينه وبين المسلمين۔ فقال: قولوا لمحمد يخلصكم۔ فلما بلغه ذلك عنه نذر انه متى اظفره الله به قتله بنفسه، صفحہ ۱۲۷)

جنگ کے بعد ریجینالڈ اور دوسرے لوگ قیدی کی صورت میں صلاح الدین ایوبی کے سامنے لائے گئے۔ صلاح الدین نے ریجینالڈ کی غداری کے واقعات اس کو یاد دلائے۔ نیز اس واقعہ کو یاد دلایا جب کہ اس نے حاجیوں کے ایک قافلہ کو لوٹا تھا۔ اور ان کی فریاد پر ان سے کہا تھا کہ اپنے محمد کو بلاؤ، وہ تم کو بچائیں گے۔ اس کے بعد صلاح الدین نے تلوار اپنے میان سے نکالی اور ریجینالڈ کی گردن مار دی۔ اس کو قتل کرتے ہوئے صلاح الدین نے کہا کہ لو یہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمہارا انتقام لیتا ہوں (ھا انا ذا انتصر لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم)

یروشلم کے بادشاہ گائی نے جب ریجینالڈ کا یہ انجام دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ وہ ڈرا کہ اب میرا بھی یہی انجام ہوگا۔ اس کو یقین ہوگیا کہ تلوار کا دوسرا وار اس کے اوپر پڑنے والا ہے۔ مگر سلطان صلاح الدین نے اس کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا :

لیس من عادۃ الملوك ان یقتلوا الملوك	یہ بادشاہوں کی عادت نہیں کہ وہ بادشاہوں
ولما ھذا فانہ نقض العھد مرۃ بعد مرۃ	کو قتل کریں۔ باقی اس شخص (ریجینالڈ) نے تو
فجری ما جری (النوادر السلطانیہ، ۶۴)	عہد کو بار بار توڑا تھا۔ پس ہوا جو کچھ ہوا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس شخص کو قتل کر دیا جس نے بار بار کے غدر اور معاہدہ کی خلاف ورزی سے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ ناقابل معافی حد تک ایک برا آدمی ہے۔ مگر صلاح الدین نے اس شخص کو چھوڑ دیا جو اگرچہ دشمن تھا۔ مگر اس نے خبث اور کمینگی اور نقض عہد کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

اسی کا نام اسلامی شجاعت ہے۔ سچا اسلامی بہادر وہ ہے جو لڑنے کے ساتھ صلح بھی کرنا جانتا ہو۔ جو انتقام لینے کے ساتھ معاف کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔ جو یہ جانتا ہو کہ کب تلوار اٹھائی جاتی ہے اور کب یہ ضروری ہوتا ہے کہ تلوار کو میان میں ڈال لیا جائے۔

مومن کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حد کے اندر رہتا ہے۔ کسی سے خوش ہو تب بھی وہ ایک حد کے اندر رہ کر خوشی کا اظہار کرے گا۔ وہ اگر کسی سے غصہ ہو جائے تب بھی اس کا غصہ اس کو حد سے باہر کرنے والا ثابت نہیں ہوگا۔ مومن کی یہ صفت اس کو قابل پیشین گوئی کردار کا حامل بنا دیتی ہے۔

تاریخ کا صفحہ

اسپین میں تقریباً ۸۰۰ سال تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ ۱۴۹۲ء میں اس حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ خاتمہ کے وقت بھی مسلمان اپنے حریف اسپینیوں کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ مسیحیوں کی فتح اور مسلمانوں کی شکست کا بنیادی سبب یہ تھا کہ مسیحیوں نے متحد ہوکر اپنی طاقت بہت زیادہ بڑھالی اور مسلمانوں نے آپس کے اختلاف کی وجہ سے اپنے آپ کو بے حد کمزور کرلیا۔

مسلم دور حکومت میں بھی اسپین کا ایک نسبتاً چھوٹا حصہ مسیحیوں کے پاس تھا۔ اس کو اپنا سیاسی مرکز بنا کر وہ مسلم حکومت کے خلاف کارروائی کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر آخری دور میں اپنا رقبہ کافی بڑھا لیا تھا اور مسلمانوں کے پاس صرف غرناطہ (Granada) رہ گیا تھا۔

دور آخر کا ایک مسلم حکمراں سلطان ابوالحسن تھا۔ مسیحی حکمراں فردی نند (Ferdinand II) نے سلطان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کو خراج دینا منظور کرے۔ سلطان ابوالحسن نہایت بہادر تھا۔ اس نے فردی نند کو جواب میں لکھا کہ "غرناطہ کے دار الضرب میں اب سونے کے سکوں کے بجائے فولادی تلواریں تیار کی جارہی ہیں تاکہ مسیحیوں کی گردنیں ماری جائیں" اس کے بعد دونوں کے درمیان کئی مسلح تصادم ہوئے۔ آخر کار ۸۸۷ھ میں لوشہ کے مقام پر دونوں کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ اس میں فردی نند کی فوجوں کو مکمل شکست اور سلطان ابوالحسن کی فوجوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔

اس کے بعد فردی نند نے از سر نو اپنے کو تیار کرنا شروع کیا۔ اس وقت مسیحی اسپین میں دو حکومتیں تھیں۔ ایک اراغون (Aragon) جہاں فردی نند کی حکومت تھی۔ دوسرا قسطلہ (Castile) جہاں ملکہ ازبیلا (Isabella I) تخت کی مالک تھی، فردی نند نے یہ دانش مندی کی کہ ازبیلا کو راضی کرکے ۱۴۶۹ء میں اس سے نکاح کرلیا۔ اس طرح دونوں کو ملا کر ایک بڑی مسیحی سلطنت وجود میں آگئی۔

ایک طرف مسیحی دنیا میں یہ اتحادی واقعہ ہوا۔ دوسری طرف یہ اختلافی واقعہ پیش آیا کہ سلطان ابوالحسن کے لڑکے ابوعبداللہ محمد نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کردی، وہ سلطنت غرناطہ کے ایک حصہ پر قبضہ کرکے بیٹھ گیا۔ اب سلطان ابوالحسن کی حکومت صرف چار ہزار مربع میل پر مشتمل ہوکر رہ گئی۔ دوسری طرف فردی نند کی سلطنت کا رقبہ بڑھ کر سوا لاکھ مربع میل ہوگیا۔ اس صدمہ کے بعد

سلطان ابوالحسن پر فالج کا حملہ ہوا اور اس کی بینائی بھی ختم ہوگئی۔

سلطان ابوالحسن اس کے بعد غرناطہ کے تخت سے دستبردار ہوگیا اور اپنی جگہ اپنے بھائی ابوعبداللہ زغل کو سلطان مقرر کیا۔ اس کے بعد ایک سازش کے تحت ابوعبداللہ زغل کو سلطنت سے ہٹا دیا گیا اور ابوعبداللہ محمد پوری سلطنتِ غرناطہ کا حکمراں بن گیا۔ مگر اس کے اندر اپنے باپ والی دانش مندی موجود نہ تھی۔ چند مقابلوں میں اس نے مسیحی حکمراں سے شکست کھائی۔

آخری مرحلہ میں غرناطہ کے قلعہ کو مسیحی فوجوں نے گھیر لیا۔ ابوعبداللہ محمد جس نے اپنے اور اپنے چچا کے مقابلہ میں بہادری دکھائی تھی وہ مسیحی فوجوں کے مقابلہ میں صرف بزدل ثابت ہوا۔ آخر کار ۲ جنوری ۱۴۹۲ کو اس نے قلعہ اور غرناطہ کی دستبرداری کے معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدہ پر ایک طرف فاتح فردی نند نے اپنا دستخط ثبت کیا۔ اور دوسری طرف مفتوح ابوعبداللہ محمد نے۔

ایک مورخ نے اسپین کے مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غرناطہ کے آخری مسلم حکمراں سلطان ابوالحسن نے فردی نند اور ازبیلا کو شکست دی تھی۔ مگر اس کے اپنے لڑکے ابوعبداللہ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی جو آخر کار اس کے باپ کے زوال کا سبب بنی۔

The last ruler of Granada, Sultan Abul-Hasan, defeated Ferdinand II (1452-1516) and Queen Isabella, but his own son, Abu Abdullah, made a coup against his father which resulted to the downfall of his father.

اس دنیا میں باہمی اتحاد سب سے بڑی طاقت ہے اور باہمی اختلاف سب سے بڑی کمزوری۔ یہ بلاشبہ تاریخ کا سب سے بڑا سبق ہے۔

اختلاف کا سبب کیا ہوتا ہے اور اتحاد کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ جب لوگوں کے اوپر ذاتی مفاد کا غلبہ ہو جائے تو ان کے درمیان اختلاف ابھر آئے گا۔ اور جب وہ قومی مفاد کو اہمیت دیں تو وہ باہم متحد رہیں گے۔ قوم کے وسیع تر مفاد کا احساس انفرادی اختلافات پر غالب آجاتا ہے۔ لوگ اختلاف کے باوجود متحد رہتے ہیں۔ لوگ اختلاف کے باوجود اپنے اپنے اختلاف کو اپنی ذات تک رکھتے ہیں، وہ اپنے اختلاف کو اجتماعی تعلق میں موثر نہیں ہونے دیتے۔

ماضی اور حال

ہارون الرشید (۸۰۹ - ۷۶۶) عباسی دور کا مشہور خلیفہ ہے۔ اس کی حکومت مشرق میں چین سے لے کر مغرب میں اٹلانٹک تک پھیلی ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے بادل کے ایک ٹکڑے کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا تو اس کی زبان سے نکلا: إمطري حيث شئتِ فسيأتيني خراجك (جہاں چاہے جاکر برس، تیرا خراج میرے ہی پاس آئے گا)

خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں بغداد دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر تھا۔ اس نے فرانس کے بادشاہ شارلیمان (۸۱۴ - ۷۴۲) کے لیے ایک گھڑی بطور تحفہ بھیجی تھی۔ یہ گھڑی پانی سے چلتی تھی اور وقت بتانے کے لیے آواز کرتی تھی۔ اس کو دیکھ کر شارلیمان کے درباری حیران رہ گئے۔ وہ اس کی تشریح نہ کر سکے۔ انھوں نے گمان کیا کہ اس گھڑی کے اندر ایک شیطان ہے جو اس کو حرکت دیتا ہے (اهدى لشارلمان ساعة مائية دقاقة۔ احتار رجال شارلمان في تفسيرها وظنوا أن فيها شيطانًا يحركها)

خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ کا ایک واقعہ عرب تاریخوں میں نقل کیا گیا ہے، اس زمانہ میں نقفور اوّل (Nicephorus I) روم کی باقی ماندہ سلطنت کا جانشین تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس کی حکومت عباسی خلافت کو جو خراج دے رہی تھی، اس کو روک دے۔ اس نے ہارون الرشید کو ایک خط لکھا۔ اس کا مضمون یہ تھا:

من نقفور ملك الروم إلى هارون ملك العرب۔ أما بعد فإن الملكة التي كانت قبلي أقامتك مقام الرُّخ وأقامت نفسها مقام البيذق۔ فحملت إليك أموالها أحمالاً۔ وذلك لضعف النساء وحمقهن۔ فإذا قرأت كتابي فاردد ما حصل قبلك من أموالها وإلا فالسيف

شاہ روم نقفور کی طرف سے شاہ عرب ہارون کے نام۔ اس کے بعد یہ ہے کہ مجھ سے پہلے جو ملکہ تھی اس نے تم کو رخ (خیالی قسم کا بڑا جانور) کی حیثیت دے دی اور اپنے آپ کو بیذق (شطرنج کا پیادہ) سمجھ لیا۔ چنانچہ اپنا مال لاد کر تمہارے پاس بھیج دیا۔ یہ عورتوں کی کمزوری اور ان کی بے وقوفی کی وجہ سے ہوا۔ پس جب تم میرے اس کو پڑھو تو اس کا جو مال تم کو اس

بیننا و بینک۔ (تاریخ الخلفاء للسیوطی، ۲۶۰) سے پہلے پہنچا اس کو مجھے لوٹا دو۔ ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہے۔

ہارون الرشید نے جب اس خط کو پڑھا تو وہ سخت غضب ناک ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے قلم دوات منگوائی۔ اور اسی خط کی پشت پر اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھ کر بھیج دیے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ہارون امیر المومنین کی طرف سے رومی کتے نقفور کے نام، اے کافر عورت کے بچے، میں نے تمہارا خط پڑھ لیا۔ اس کا جواب تم جلد ہی دیکھ لوگے (۲۶۸)

اس جواب کو بھیجنے کے فوراً بعد خلیفہ نے تیاری کا حکم دے دیا۔ اور پھر ایک طاقت ور فوج لے کر تیزی سے رومی علاقہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے نقفور سے کئی لڑائیاں لڑکر اس کو بری طرح شکست دی۔ یہاں تک کہ وہ مجبور ہوگیا کہ دوبارہ بغداد کو خراج دینے پر راضی ہوجائے۔

نقفور سے پہلے ملکہ آئرین (Irene) رومی تخت کی وارث تھی۔ ۸۰۲ میں ایک انقلاب ہوا اور ملکہ آئرین کی حکومت ختم ہوگئی۔ نقفور ۸۱۱ تک حکمراں رہا:

When Nicephorus withheld the tribute that Irene had agreed to pay the Baghdad calipah Harun ar-Rashid, was followed, and Arab forces defeated the Byzantine emperor at Crasus in Phrygia (805). In 806 Harun captured Heraclea, Tyana, and other places. Nicephorous was forces to agree to pay a yearly tribute of 30,000 gold pieces. (EB-VII/322)

جب نقفور نے اس خراج کو روک دیا جس کو ملکہ آئرین نے بغداد کے خلیفہ ہارون الرشید کو دینا منظور کیا تھا تو دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ عرب فوجوں نے بازنطینی بادشاہ کو ۸۰۵ میں کراسس کے مقام پر شکست دی۔ ۸۰۶ میں ہارون نے ایشیائے کوچک پر ایک لاکھ ۳۵ ہزار سے زیادہ لشکر کے ساتھ حملہ کیا اور ہرقل اور تیانہ اور دوسرے مقامات پر قبضہ کرلیا۔ نقفور کو اس پر مجبور کردیا گیا کہ وہ بغداد کو سالانہ ۳۰ ہزار سونے کا سکہ ادا کرے۔

دورِ اوّل کے مسلمانوں کی طاقت کا راز صرف تلوار نہ تھی۔ ان کی طاقت کا اصل راز یہ تھا کہ وہ علم میں دوسری قوموں سے حیران کن حد تک آگے بڑھے ہوئے تھے۔ علم ہی کے ذریعہ آدمی حقیقتوں سے واقف ہوتا ہے۔ علم ہی کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کی منصوبہ بندی کرسکے۔ علم اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

رحم دل فاتح

۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء مسلم تاریخ کا نہایت اہم دن ہے۔ یہی وہ دن ہے جب کہ صلیبی طاقتوں کے ۸۸ سالہ قبضہ کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

۱۰۹۵ء میں پوپ نے یورپی قوموں کو صلیبی جنگ پر ابھارا تاکہ " مسیح کی مقدس قبر کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لیا جا سکے"۔ اس کے جواب میں یورپ کے مسیحی حکمراں جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہولناک لڑائیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ مسیحیوں نے فلسطین کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد فتح کے نشہ میں انھوں نے تمام انسانی قدروں کو پامال کر ڈالا۔ وہ مسلمانوں کو فلسطین سے بزور نکالنے لگے اور انھیں ہلاک کرنا شروع کیا۔

اس موضوع پر بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں چھپ چکی ہیں۔ حال میں ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ) میں اس کے بارہ میں ایک مفید معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون فرانسیسی مستشرق آلان روکو کے فرانسیسی مقالہ کا ترجمہ ہے جو مصطفٰے کمال الجابری نے کیا ہے۔

صلاح الدین ایوبی ۲۷ نومبر ۱۱۷۴ء کو دمشق پہنچے۔ پھر وہ حلب گیے۔ جلد ہی اپنی خصوصیات کی بنا پر انھیں دمشق، حلب، قاہرہ کے حاکم کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ انھوں نے دمشق کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ خلیفہ بغداد نے ان کو مصر اور شام کا فرماں روا تسلیم کر لیا۔ اپنی صفات کی بنا پر وہ عامۃ الناس کے محبوب بن گیے۔ ان کو سیف الاسلام کہا جانے لگا۔

صلاح الدین نے اس کے بعد اپنی فوج کو طاقتور انداز میں منظم کیا۔ اور پھر انھوں نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا جو فلسطین پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ ارض مقدس سے صلیبی طاقتوں کو نکال کر رہیں گے۔ اعلیٰ ترین جنگی منصوبہ ثابت کرتا ہے کہ صلاح الدین جنگی امور میں عبقری مہارت رکھتے تھے (خطة حربية عالية المستوى تدل على عبقرية صلاح الدين العسكرية) انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ صلیبی فوجوں کو پانی سے محروم کر دیا اور حطین کے مقام پر ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

صلاح الدین نے مسلسل فتوحات حاصل کرتے ہوئے اکتوبر ۱۱۸۷ء میں قلعۃ القدس پر قبضہ کرلیا۔ صلیبیوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں فلسطین کے مسلمانوں پر ہر قسم کے ظلم کیے تھے۔ مگر صلاح الدین نے فتح حاصل کرنے کے بعد ان کے خلاف کوئی بھی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ ان کی تلوار صلیبی جارحیت کے خلاف میان سے نکلی تھی، صلیبی جارحیت کو ختم کرتے ہی وہ دوبارہ میان میں چلی گئی۔

فرانسیسی مستشرق نے لکھا ہے کہ صلاح الدین نے مسیحیوں کے ساتھ انتہائی شریفانہ معاملہ کیا۔ قدس میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے حکم جاری کیا کہ اسپتالوں میں جو مسیحی لوگ زیر علاج ہیں، ان کا علاج جاری رکھا جائے۔ تمام بڑے بڑے چرچ مسیحیوں کے قبضہ میں بدستور باقی رہے۔ انھوں نے ۱۵۰۰ مسیحیوں کے اوپر سے جزیہ معاف کردیا، کیوں کہ انھوں نے کہا تھا کہ وہ مفلسی کی وجہ سے جزیہ نہیں دے سکتے۔ انھوں نے ایک بڑے صلیبی عہدیدار کو اجازت دی کہ وہ چرچ کے خزانہ کو اپنے ساتھ جہاں چاہے لے جائے۔ وغیرہ

صلیبی فوجی جو گرفتار ہوگیے تھے، ان کی عورتیں صلاح الدین کے پاس آئیں۔ انھوں نے صلاح الدین کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا اور اپنے فوجی شوہروں کی رہائی کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے تمام فوجیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ مضمون ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے :

فرانسیسی مورخ گستاؤ لیبان یہ کہنے میں بالکل حق بجانب تھا کہ تاریخ نے عربوں سے زیادہ رحم دل فاتح نہیں دیکھا	فقد كان المورخ الفرنسي (جوستاف لوبون) على حق عندما قال جملته المأثورة : لم يعرف التاريخ فاتحاً ارحم من العرب (صفحه ۱۰۱)

جنگ کے بارہ میں یہی اسلام کا اصول ہے۔ اسلام جارحیت کے خلاف دفاع کی مکمل اجازت دیتا ہے۔ مگر جب جارح کی تلوار ٹوٹ جائے تو اس کے بعد اہل اسلام بھی اپنی تلوار توڑ لیتے ہیں۔ اسلام میں دفاع ہے مگر جارحیت نہیں۔ اسلام میں حفاظتی کارروائی ہے مگر انتقامی کارروائی نہیں۔ اسلام میں اپنا حق وصول کرنا ہے مگر اسلام میں یہ جائز نہیں کہ آدمی دوسرے کے خلاف دست درازی کرنے لگے۔ اسلام جس دل میں اترتا ہے وہ اس کو مثبت احساسات میں جینے والا انسان بناتا ہے نہ کہ منفی احساسات میں جینے والا انسان۔

ظالم کا دل ہل گیا

ساتویں صدی ہجری میں تاتاری قبائل نے اسلامی سلطنت پر حملہ کیا اور عراق، ایران، ترکستان میں مسلم تہذیب وسلطنت کو زیر وزبر کر ڈالا۔ مگر اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں کو نرم کیا اور تقریباً پوری کی پوری قوم مسلمان ہوکر اسلام کی پاسبان بن گئی۔ اس زمانہ کے دعوتی واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جارہے تھے۔ اتفاق سے انھیں دنوں ایک تاتاری شہزادہ تغلق تیمور شکار کے لئے نکلا ہوا تھا۔ یہ شہزادہ تاتاریوں کی چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا جو ایران پر حکومت کر رہی تھی۔ شیخ جمال الدین ایرانی چلتے ہوئے اس علاقہ میں پہنچ گئے جہاں شہزادہ شکار کھیل رہا تھا۔ تاتاری اس زمانہ میں ایرانیوں کو منحوس سمجھتے تھے۔ شہزادہ کے سپاہیوں نے شکارگاہ میں ایک ایرانی کی موجودگی کو برا فال سمجھا اور ان کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہ اس گستاخ ایرانی کو شہزادہ کے پاس لے گئے۔ شہزادہ ان کو دیکھ کر سخت برہم ہوا۔ غصہ کی حالت میں اس کی زبان سے نکلا: تم ایرانیوں سے تو ایک کتا اچھا ہے۔ شیخ جمال الدین تاتاری کے اس نفرت انگیز سوال کو سن کر سنجیدہ انداز میں بولے: اگر ہم کو سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے۔

تاتاری اگرچہ وحشی تھے مگر ان میں فطری مردانگی کا جوہر موجود تھا۔ وہ منافقت سے خالی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کا یہ جواب تغلق تیمور کے لئے سخت جھنجھوڑنے والا ثابت ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ جب میں شکار سے فارغ ہوجاؤں تو اس ایرانی کو میری خدمت میں حاضر کرو۔ شیخ جمال الدین جب حاضر کئے گئے تو وہ ان کو تنہائی میں لے گیا اور ان سے پوچھا کہ یہ دین کیا ہے۔ شیخ جمال الدین نے نڈر ہوکر اس کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ اس گفتگو نے تاتاری شہزادہ کا دل ہلا دیا۔ بے دینی کی حالت میں مرنا اسے بڑا خطرناک معلوم ہونے لگا۔ وہ اس پر آمادہ ہوگیا کہ اسلام قبول کرلے۔ تاہم ابھی وہ ولی عہد تھا، بادشاہ نہ تھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت اگر میں اسلام قبول کرتا ہوں تو میں اپنی رعایا کو اسلام کے دین پر نہیں لا سکتا۔ اس نے شیخ جمال الدین سے کہا: اچھا اس وقت تم جاؤ۔ جب تم سنو کہ میری تاج پوشی ہوئی ہے اور میں تخت پر بیٹھ گیا ہوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا۔

شیخ جمال الدین اپنے گھر واپس آگئے اور اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب کہ تغلق تیمور کی تخت نشینی کی خبر انھیں معلوم ہو۔ مگر یہ وقت ان کی زندگی میں نہیں آیا۔ یہاں تک کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہوگئے۔ اس وقت انھوں نے اپنے لڑکے شیخ رشید الدین کو بلایا اور تاتاری شہزادہ کا قصہ بتاکر کہا کہ دیکھو میں ایک مبارک گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آنا میری زندگی میں مقدر نہیں۔ اس لئے میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ جب تم سنو کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوئی ہے تو تم وہاں جانا اور اس کو میرا اسلام کہنا

اور بے خوفی کے ساتھ اس کو شکار کا واقعہ یاد دلانا جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ شاید اللہ اس کا سینہ حق کے لئے کھول دے۔

اس کے بعد شیخ جمال الدین کا انتقال ہوگیا۔ باپ کی وصیت کے مطابق ان کے لڑکے شیخ رشید الدین تاتاری شہزادہ کی تخت نشینی کا انتظار کرنے لگے۔ جلد ہی ان کو خبر ملی کہ تغلق تیمور تخت پر بیٹھ گیا ہے۔ اب وہ اپنے وطن سے روانہ ہوئے۔ منزل پر پہنچے تو دربانوں نے خیمہ کے اندر جانے سے روک دیا۔ کیوں کہ ان کے پاس دربانوں کو بتانے کے لئے کوئی بات نہ تھی کہ وہ کیوں بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے یہ کیا کہ خیمہ کے قریب ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔

ایک روز وہ فجر کے لئے اٹھے۔ اول وقت تھا اور فضا میں ابھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے بلند آواز سے اذان دینا شروع کیا۔ یہ آواز خیمہ کے اس حصہ تک پہنچ گئی جہاں شاہ تغلق تیمور سو رہا تھا۔ بادشاہ کو ایسے وقت میں یہ آواز بے معنی شور معلوم ہوئی۔ اس نے اپنے ملازموں سے کہا کہ دیکھو یہ کون پاگل ہے جو اس وقت ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہا ہے۔ اس کو پکڑ کر ہمارے پاس حاضر کرو۔ چنانچہ شیخ رشید الدین فوراً بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دئے گئے۔

اب بادشاہ نے ان سے سوال و جواب شروع کیا کہ تم کون ہو اور کیوں ہمارے خیمہ کے پاس شور کر رہے ہو۔ شیخ رشید الدین نے اپنے والد شیخ جمال الدین کی پوری کہانی سنائی اور کہا کہ آپ کے سوال کے جواب میں جب میرے والد نے کہا تھا کہ اگر ہم کو سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے تو آپ نے کہا تھا کہ اس وقت میں کچھ نہیں کہتا مگر جب میری تخت نشینی ہو جائے تو تم میرے پاس آنا۔ مگر اس کے انتظار میں میرے والد کا آخری وقت آگیا۔ اب ان کی وصیت کے مطابق میں آپ کے پاس وہ بات یاد دلانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

بادشاہ نے پورے قصہ کو غور کے ساتھ سنا۔ آخر میں بولا کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں تمھارے انتظار میں تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے وزیر کو بلایا اور کہا کہ ایک راز میرے سینہ میں تھا جس کو آج اس ایرانی فقیر نے یاد دلایا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اسلام قبول کر لوں۔ تمھاری کیا رائے ہے۔ وزیر نے کہا کہ میں بھی یہی راز اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ سچا دین یہی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ اور وزیر دونوں شیخ رشید الدین کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد بقیہ درباریوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ بادشاہ کے قبول اسلام کے بعد پہلے ہی دن ایک لاکھ ساٹھ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا اور بالآخر ایران کی پوری تاتاری قوم نے بھی۔

تاریخ کا ایک صفحہ

چودھویں صدی عیسوی میں دو بڑے مسلم حکمراں تھے۔ ایک تیمور لنگ (۱۴۰۵-۱۳۳۶) اور دوسرا بایزید اول (۱۴۰۲-۱۳۸۹) تیمور لنگ سمرقند (وسط ایشیا) میں پیدا ہوا۔ وہ چنگیز خاں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بایزید اول اناتولیہ (ترکی) میں پیدا ہوا۔ اس کا دار السلطنت ایڈریانوپل تھا۔

ان دونوں مسلم حکمرانوں کے درمیان ایک نہایت ہولناک جنگ ہوئی جس کو تاریخ میں جنگ انگورہ (Battle of Angora) کہا جاتا ہے۔ انگورہ موجودہ انقرہ کا انگریزی نام ہے۔ تیمور نے چاہا کہ وہ بایزید کی سلطنت کے ایشیائی علاقہ پر قبضہ کرلے۔ یہاں سے دونوں میں اختلافات پیدا ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف کارروائی کرنے لگے۔ بایزید نے تیمور کے دشمنوں کو اپنے یہاں پناہ دی۔ تیمور نے بایزید کے دشمنوں سے تعلق قائم کیا، وغیرہ۔

اس قسم کی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ جولائی ۱۴۰۲ میں انگورہ (انقرہ) کے مقام پر دونوں کی فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ دونوں طرف نہایت بہادر لوگ تھے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان سخت ہولناک لڑائی ہوئی۔ ایک مورخ کے الفاظ میں گویا دو پہاڑ آپس میں ٹکرا گیے۔ دونوں طرف کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی مارے گیے۔ آخر کار بایزید کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہوا اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں ساری دنیا میں تیمور اور بایزید کے برابر کوئی طاقتور بادشاہ موجود نہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان جنگ چھڑی تو عالم یہ تھا کہ دور تک خون اور لاشوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس ہولناک جنگ کے سلسلہ میں کچھ لوگ تیمور کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور کچھ لوگ بایزید کو۔ تاہم ذمہ دار جو بھی ہو، نتیجہ بہر حال ایک تھا۔ وہ یہ کہ اس لڑائی سے عالم اسلام کو شدید ترین نقصان پہونچا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یورپ جو عثمانی ترکوں کے ذریعہ اسلامی براعظم بننے جارہا تھا، وہ اس باہمی جنگ کے نتیجہ میں عیسائی براعظم بن کر رہ گیا۔

جنگ کا فیصلہ ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ کو ہوا۔ بایزید گرفتار ہو گیا۔ تیمور نے اس کو ایک لوہے کے

کٹہرے میں بند کروایا۔ تیمور اپنے سفروں میں اس کٹہرے کو ساتھ ساتھ لے جاتا تھا تاکہ اس کی تشہیر کرے۔ سلطان بایزید اس رسوائی کو برداشت نہ کرسکا۔ گرفتاری کے صرف آٹھ ماہ بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ خود تیمور بھی اپنی فتح کے ڈھائی سال بعد اس دنیا سے رخصت ہوکر وہیں چلا گیا جہاں اس نے اپنے مفتوح سلطان کو پہونچایا تھا۔ دنیا میں بظاہر ایک فاتح تھا اور دوسرا مفتوح۔ مگر آخرت نے دونوں کے فرق کو ختم کردیا۔ آخرت میں دونوں یکساں طور پر خدا کے بندے کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کر دیئے گیے۔

تیمور اور بایزید دونوں نہایت بہادر تھے۔ تیمور کی ہیبت مشرقی دنیا پر چھائی ہوئی تھی اور بایزید کی ہیبت مغربی دنیا پر جس نے اسلام کے حدود دریائے ڈینوب (ہنگری) تک پہونچا دیئے تھے۔

اگر ایسا ہوتا کہ تیمور اپنے عمل کا میدان مشرق کو بناتا اور بایزید مغرب کی سمت میں آگے بڑھتا تو وہ دونوں پورے عالم کو اسلام کے سایہ میں لانے کے لیے کافی ہوجاتے۔ مگر آپس کی لڑائی نے اس امکان کو واقعہ بننے نہیں دیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے تیمور کے تذکرے کے ذیل میں لکھا ہے :

By defeating the Ottoman Sultan Bayezid at Angora (modern Ankara) in 1402 and thus preventing him from extending his domain into Europe, the fall of Constantinople and the death agony of Byzantium were delayed half a century by this Muslim nomad (18/242).

یعنی تیمور نے عثمانی سلطان بایزید کو انگورہ (موجودہ انقرہ) کے مقام پر ۱۴۰۲ میں شکست دی۔ اس طرح اس نے بایزید کو یورپ میں اپنا اقتدار بڑھانے سے روک دیا۔ اس کے نتیجہ میں قسطنطنیہ کی فتح اور بازنطینی سلطنت کا خاتمہ نصف صدی تک کے لیے موخر ہوگیا۔

مسلمان اکثر دوسری قوموں کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو جتنے بھی نقصان پہونچے ہیں، سب اپنوں کی وجہ سے پہونچے ہیں۔ مسلمانوں کی آپس کی لڑائیاں مسلمانوں کی بربادی کا سب سے بڑا سبب ہیں، گزرے ہوئے دور میں بھی اور حال کے زمانہ میں بھی۔ مگر تاریخ کا یہی سب سے بڑا سبق ہے جس سے مسلمانوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

ترک فاتح

ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا جو اب استانبول کہا جاتا ہے۔ یہ مسیحی دنیا کے لیے سب سے زیادہ ہلا دینے والا واقعہ تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک یونانی کتبہ میں اس کے بارے میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ اس سے زیادہ ہولناک واقعہ نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہوگا :

> There has never been and there never will be
> a more dreadful happening (p. 336).

حضرت عثمان کی خلافت (۶۴۴ - ۶۵۶) کے زمانہ میں مسلمان ترکی میں داخل ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ کے زمانہ میں انھوں نے ترک علاقہ میں مزید پیش قدمی کی۔ مگر اس کا دار السلطنت قسطنطنیہ انتہائی محفوظ جغرافیہ اور بے حد مضبوط قلعہ کی بنا پر اتنا مستحکم تھا کہ بار بار کوشش کے باوجود مسلمان اس کو مسخر نہ کر سکے۔ اس کی تسخیر ۸۰۰ سال بعد صرف ۱۴۵۳ میں ممکن ہو سکی۔

ترکی کا عثمانی سلطان محمد دوم جو محمد فاتح کے نام سے مشہور ہے، وہ پہلا شخص ہے جس نے اس طویل مہم کو کامیابی تک پہنچایا۔ اس نے اس مقصد کے لیے نہایت گہرا منصوبہ بنایا۔ سلطان محمد ۱۴۵۱ میں تخت پر بیٹھا جو اس وقت ادرنہ (Edirne) میں تھا۔ اس نے خاموش اور مسلسل عمل کے ذریعہ تمام ممکن سیاسی اور فوجی تدبیریں اس مقصد کے لیے مہیا کیں۔

۱۴۵۲ کا پورا سال اس نے باسفورس کے کنارے ایک نیا قلعہ تعمیر کرنے میں صرف کیا جہاں سے جنگی کارروائیوں کو منظم کیا جا سکے۔ یہ قلعہ بعد کو قلعہ رومیل (Rameli Hisari) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ۳۱ جنگی جہازوں کا ایک طاقتور بیڑا تیار کروایا تاکہ سمندر کے راستہ سے موثر حملہ کیا جا سکے۔ اس نے ہنگری کے ایک استاد اربان (Urban) کو بلا کر اتنی بڑی توپ تیار کرائی جو اس وقت کے یورپ میں ایک نادر چیز تھی۔ یہ توپ سازی بے حد اہم تھی، کیونکہ اسی کے ذریعہ قسطنطنیہ کی مضبوط سنگی فصیل توڑی جا سکی۔

اس قسم کی مختلف ضروری تیاریوں کے علاوہ اس نے مزید یہ کیا کہ بوقت جنگ یونان اور ہنگری کو غیر جانب دار رکھنے کے لیے ان سے امن معاہدے کیے جن کی شرائط یک طرفہ طور پر ان کے مفاد میں تھیں :

To keep Venice and Hungary neutral, he signed
peace treaties favourable to them (11/860).

یہ عین وہی تدبیر تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ حدیبیہ کے وقت اختیار فرمائی، اور جس کے ذریعہ آپ نے مکہ کے قریش کو خیبر کے یہودیوں سے کاٹ دیا تھا۔ اس معاہدہ کے تحت قریش اس کے پابند ہو گئے تھے کہ بوقت جنگ وہ یہود کی مدد نہیں کریں گے۔

ان تمام تیاریوں کے بعد سلطان محمد خاموش نہیں بیٹھا۔ بلکہ اس نے جنگی کارروائی کی کمان براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پوری مہم کے دوران وہ بذاتِ خود اس میں شریک رہا۔ قسطنطنیہ کی مہم کی تیاری اور اس کی کارروائیوں کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اس کو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس زبردست منصوبہ بندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح ہو گیا۔ بازنطینی شہنشاہیت کا آخری تاجدار قسطنطین (Constantine XI) جنگ کرتا ہوا شہر کے دروازے پر مارا گیا۔ ترکی میں مسلمانوں کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی۔

اس فتح کے بعد ترکی کی راجدھانی ادرنہ (ایڈریانوبل) کے بجائے قسطنطنیہ قرار پائی اور آج تک وہ وہیں قائم ہے۔ اب اس کا نام استانبول ہے۔ قسطنطنیہ گیارہ سو سال سے زیادہ مدت تک مسیحی سلطنت کی راجدھانی تھا۔ اس کے بعد وہ مسلم سلطنت کی راجدھانی بنا۔ تقریباً پانچ سو سال تک وہ عظیم عثمانی خلافت کی راجدھانی اور پورے عالم اسلام کی سیاسی طاقت کا مرکز رہا ہے۔ اس کی یہ حیثیت پہلی بار صرف جنگ عظیم اول (۱۸-۱۹۱۴) میں ختم ہوئی۔

فتح مکہ (۶۳۰ء) سے لے کر فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳) تک اسلامی تاریخ کے تمام بڑے بڑے فاتحانہ واقعات گہری حکمت اور عظیم منصوبہ بندی کے ذریعہ انجام پائے ہیں۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کی بات ہے کہ مسلمان تدبیر اور منصوبہ بندی کے بغیر محض جوش و خروش کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر بالاکوٹ مارچ (۱۸۳۱) سے لے کر اجودھیا مارچ (۱۹۸۹) تک ان کے تمام اقدامات صرف ناکامی پر ختم ہو رہے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ مومن کی فراست سے بچو۔ کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ مومن کا ایمان اس کو زیادہ بہتر تدبیر کے قابل بنا دیتا ہے۔

ناکامیوں کے بعد

ظہیر الدین محمد بابر (۱۵۳۰-۱۴۸۳) فرغانہ میں پیدا ہوا۔ یہ علاقہ اِس وقت ازبکستان (ازبیک) میں شامل ہے۔ باپ کے واسطہ سے اس کا سلسلہ نسب تیمور سے ملتا ہے اور ماں کے واسطہ سے چنگیز خاں سے۔ بابر کا باپ عمر شیخ مرزا فرغانہ کا حاکم تھا۔ اُس وقت یہ مقام کوہ ہندوکش کے شمال میں ایک چھوٹے پرگنہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

فرغانہ کے پڑوس میں سمرقند تھا جو تیمور کی قدیم راجدھانی تھا۔ یہاں محمد شیبانی خاں کی حکومت تھی جو چنگیز خاں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ بابر کا باپ مستقل اس کوشش میں رہا کہ وہ سمرقند کو فتح کرکے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ باپ کی وفات پر ۱۴۹۴ میں بابر فرغانہ کا حاکم بنا جب کہ اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ باپ کی پیروی میں اس نے سمرقند پر قبضہ کرنے کے لیے اس پر کئی حملے کیے۔ مگر ۱۵۰۱ میں اس کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ اس نے خود اپنی موروثی سلطنت فرغانہ کو بھی کھو دیا۔

ایک مورّخ نے لکھا ہے کہ ایک کم سن بادشاہ کی حیثیت سے بابر نے فرغانہ کو کھو دیا۔ وہ مصیبتوں کے ایک دور میں داخل ہوگیا۔ اس کو خود اپنے پدری اور مادری چچاؤں سے لڑائی لڑنی پڑی۔ مگر ۲۰ سالہ مصیبت اور جنگ کے دوران اس نے اپنے حریفوں (ترک، مغل، ایرانی اور افغانی) سے کامیاب جنگی تدبیریں اور حربی طریقے سیکھ لیے۔ اس نے ان طریقوں میں سائنٹفک امتزاج پیدا کیا۔ سالہا سال کی شکستوں اور وطن سے محرومی اور طرح طرح کی مشکلات کے نتیجہ میں وہ ایک اچھا فوجی جنرل بن گیا۔ اپنے باپ دادا کے علاقہ کو حاصل کرنے کے بارہ میں اپنے منصوبہ کی ناکامی کے بعد بابر نے اپنی توجہ ہندستان کی طرف موڑ دی:

As a boy king he lost Farghana and passed through a period of adversity, having to fight his own paternal and maternal uncles. During 20 years of adversity and warfare Babur trained himself by appropriating military tactics and modes of warfare of his adversaries – Turks, Mongols, Persians, and Afghans, and he made a scientific synthesis of these systems. He became a good general through a career of many defeats and through years of homeless wanderings, privations and hardships... Foiled in his design of recovering his ancestral domain in Central Asia, Babur turned his attention to India. (9/378).

بابر نے پہلی بار ۱۵۱۹ میں ہندستان پر حملہ کیا۔ اس کی پیش قدمی جاری رہی۔ یہاں تک کہ ۱۵۲۶ میں اس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرکے ہندستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اپنے وطن فرغانہ کو اس نے ایک شکست خوردہ انسان کی حیثیت سے چھوڑا تھا، مگر ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ کو آگرہ میں جب اس کا انتقال ہوا تو تاریخ اس کو اپنے صفحات میں ایک فاتح بادشاہ کی حیثیت سے درج کرچکی تھی۔

بابر کو کامیابی اس حوصلہ مندانہ عمل کی بنا پر ہوئی کہ اس نے اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کیا۔ اس نے خود ناکامی کے اندر وہ پہلو تلاش کرلیے جو اس کو عظیم تر کامیابی کی طرف لے جانے والے ہوں۔

بابر کو جب اپنے حریفوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو اس نے شکایتی انداز اختیار نہیں کیا۔ اس نے ایسا نہیں کیا کہ وہ ان کی سازشوں اور ان کے تخریبی منصوبوں کی فہرست مرتب کرنے لگے۔ وہ اپنے حریفوں کے خلاف لفظی گولہ باری میں مشغول ہوجائے۔

اس کے بجائے بابر نے اپنا ذہن اس سوچ میں لگایا کہ میرے حریفوں کو میرے مقابلہ میں کامیابی کیونکر حاصل ہوئی۔ میری ہار اور ان کی جیت کا سبب کیا تھا۔ بابر کی اس سوچ نے اس کو بتایا کہ اس کے حریف زیادہ کارگر تدبیروں کو جانتے تھے۔ انھوں نے زیادہ موثر حربے استعمال کرکے اس کو ہرادیا۔

اب بابر نے اپنے حریف کے حربوں اور ان کی تدبیروں کو اپنانا شروع کیا۔ اس نے مزید غور وتجربہ کے ذریعہ ان کو مزید ترقی یافتہ بنایا۔ اس طرح زیادہ بہتر طور پر مسلح ہوکر اس نے ایک نئے وسیع تر میدان (برصغیر ہند) کی طرف رخ کیا۔ اس کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ اپنے وطن میں اس نے جتنا کھویا تھا، اس سے بہت زیادہ اس نے وطن کے باہر حاصل کرلیا۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں دوسروں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس لیے ناکامیوں کا پیش آنا لازمی ہے۔ کامیاب وہ ہے جو اپنی ناکامی کو اپنے لیے غذا بنا سکے۔ وہ کھونے میں پانے کا راز دریافت کرلے۔

مومن سب سے زیادہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کرسکے۔ کیونکہ مومن کا اللہ پر بھروسہ اس کو کبھی مایوس اور پست ہمت نہیں ہونے دیتا۔ وہ ہر حال میں پرامید رہتا ہے، کیونکہ ہر حال اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور وہ ضرور اس کا ساتھ دے کر اس کو فتح وکامیابی عطا فرمائے گا۔

میدانِ جنگ میں نماز

اورنگ زیب عالمگیر (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) مشہور مغل حکمراں ہے۔ اس کے زمانہ میں مغل سلطنت کو سب سے زیادہ وسعت حاصل ہوئی۔ اس کی زندگی کا تقریباً نصف حصہ لڑائیوں میں گزرا۔ اس کی بہادری کے بہت سے عجیب واقعات تاریخ کی کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں۔

اورنگ زیب نوجوانی کی عمر ہی میں اپنی امتیازی صلاحیتوں کی بنا پر شاہی خاندان میں نمایاں ہوگیا تھا۔ جب وہ نوجوان تھا، اس زمانہ میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مست ہاتھی اس کے سامنے آگیا۔ اس وقت وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ پہلے اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے ہاتھی کا مقابلہ کرنا چاہا۔ لیکن گھوڑا بدکنے لگا۔ اورنگ زیب اس سے ہراساں نہیں ہوا۔ وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور زمین پر آکر تلوار کے ذریعہ ہاتھی کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے ہاتھی کو زیر کر لیا۔

انھیں صفات کی بنا پر شاہ جہاں اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ نوجوانی کی عمر ہی سے اس کو بڑی بڑی مہموں پر بھیجنے لگا تھا۔ اورنگ زیب لڑائی کے گُر سے خوب واقف تھا۔ وہ دشمن کا مقابلہ نہایت اطمینان کے ساتھ کرتا تھا اور کبھی گھبراتا نہ تھا۔ مستقل مزاجی کی صفت اس کے اندر کمال درجہ میں تھی۔ ان تمام صفات کے باوجود وہ انتہائی سادہ مزاج تھا اور بالکل معمولی زندگی گزارتا تھا۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ جزیرہ نمائے ہند میں (اورنگ زیب کے زمانہ میں) اگرچہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے کچھ ہولڈنگ رکھتی تھی، مگر کابرٹ کے زمانہ میں اور اس کے بعد تک فرانسیسیوں کی پیش قدمی بہت سست رہی۔ اس کی وجہ جزئی طور پر یہ تھی کہ آخری مغل شہنشاہ اورنگ زیب انڈیا پر حکومت کر رہا تھا اور یہاں غالب تھا:

In the Indian peninsula, where the English East India Company had holdings, French progress was slow in Colbert's time and after, partly because the last great Mughal emperor, Aurangzeb, reigned and dominated India. (4/887)

اورنگ زیب کی زندگی کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو ۱۶۴۷ میں پیش آیا۔ جب کہ اس نے عین میدان کارزار میں گھوڑے سے اتر کر نماز ادا کی۔ ڈاکٹر آر سی مجمدار اور ڈاکٹر ایچ سی رائے چودھری نے اپنی مشترک کتاب (An Advanced History of India) میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں درج کیا ہے :

Aurangzeb was a pious Muslim, and with the zeal of Puritan he scrupulously observed the injuctions of the Holy Qur'an. Once during the Balkh campaign he knelt down to finish his prayers at the proper time, though the fighting was going on all around him. (p. 501-502)

اورنگ زیب ایک پارسا مسلمان تھا۔ اور ایک سخت محتاط مذہبی انسان کی طرح جوش کے ساتھ وہ مقدس قرآن کے احکام کی اطاعت کرتا تھا۔ ایک بار بلخ کے معرکہ کے دوران وہ زمین پر جھک گیا تاکہ ٹھیک وقت پر اپنی نماز کو مکمل کرے۔ اگرچہ اس وقت اس کے چاروں طرف لڑائی جاری تھی۔

جنگ وہ لمحہ ہے جب کہ ہر طرف تیر، تلوار اور نیزوں کی جھنکار ہوتی ہے۔ چاروں طرف قتل اور خون کا بھیانک منظر دکھائی دیتا ہے۔ زندگی اور موت دونوں اتنے قریب آجاتے ہیں کہ دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا، اس وقت عین میدانِ جنگ میں نماز کے لیے کھڑا ہونا اور اطمینان کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرنا ایک انتہائی حیرت انگیز واقعہ ہے۔ وہ کونسی طاقت ہے جو ایک انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اس قسم کا حیرت ناک واقعہ ظہور میں لاسکے۔

یہ اللہ پر ایمان کی طاقت ہے۔ ایک مومن جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی کی حمایت میں آگیا ہے جو تمام طاقتوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ جو ہر خطرہ کے مقابلہ میں اس کی طرف سے ناقابل تسخیر ڈھال بن سکتا ہے۔ یہ احساس مومن کے اندر بے پناہ اعتماد پیدا کر دیتا ہے۔ انسان اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو اپنے سامنے دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایمان ایک عظیم عقیدہ ہے اور اسی کے ساتھ ایک عظیم طاقت بھی۔

حسد کے نقصانات

بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء میں سلطان محمد بن تغلق سے بغاوت کرکے قائم ہوئی۔ اس کا بانی حسن گنگو تھا۔ حسن کا کہنا تھا کہ وہ ایران کے قدیم بادشاہ بہمن کی اولاد سے ہے۔ اس بنا پر اس کا خاندان بہمنی خاندان کہا جاتا ہے۔

حسن گنگو نے گلبرگہ کو اپنی راجدھانی قرار دیا اور اپنی سلطنت کے حدود کو بڑھانا شروع کیا۔ ۱۳۵۹ میں حسن گنگو کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد اس کا جانشین احمد شاہ بہمنی ہوا۔ اس نے شہر بیدر بسایا اور گلبرگہ کے بجائے بیدر کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔

دکن کی یہ بہمنی سلطنت ۱۸۰ سال تک رہی اور ۱۵۲۷ء میں ختم ہوگئی۔ اس سلطنت کا وزیر ۱۴۶۳ سے لے کر ۱۴۸۱ تک محمود گواں تھا۔ اس کا زمانہ بہمنی سلطنت کا سب سے زیادہ کامیاب زمانہ ہے۔ اس نے سلطنت کو مزید وسیع کیا اور اپنے تدبر سے اس کو نہایت مستحکم کیا۔ مورخین نے بالاتفاق اس کی اعلیٰ لیاقت کا اعتراف کیا ہے۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ "محمود گواں تاریخ ہند کے بہترین مدبروں اور منتظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔" انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں:

The most notable personality of the period,
a leading administrator (9/372).

(اس عہد کی سب سے زیادہ ممتاز شخصیت، ایک اعلیٰ انتظام کار) این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا (۱۹۸۷) کے مصنفین نے ان الفاظ میں اس کے اخلاص کا اعتراف کیا ہے:

Though possessed of wide powers, Mahmud Gawan never abused his authority. By virtue of his skilful diplomacy and successful military operations, he brought the dominions of the Bahmanis to an extent never achieved by former sovereigns.
An Advanced History of India (1987) p. 354

اگرچہ محمود گواں کو نہایت وسیع اختیارات حاصل تھے مگر اس نے کبھی اپنے اختیار کا بے جا استعمال نہیں کیا۔ اپنی ماہرانہ سیاست اور اپنے کامیاب فوجی اقدامات کے ذریعہ اس نے بہمنی سلطنت کے

رقبہ کو ایسی حدود تک پہونچایا جو پچھلے حکمرانوں کے زمانہ میں کبھی نہیں پہونچا تھا۔

محمود گواں اس قدر محنت کا عادی تھا کہ وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا۔ اپنی ضرورتیں اس نے بہت محدود کرلی تھیں۔ چٹائی پر سوتا، مٹی کے برتن میں کھانا کھاتا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا۔ اس کے ذاتی کتب خانہ میں تین ہزار کتابیں تھیں۔ اس نے بہمنی سلطنت کی راجدھانی بیدر میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی تمام کتابیں وہاں بھیج دیں۔ مدرسہ کی عمارت کے آثار اب بھی بیدر میں موجود ہیں۔ اس کے زمانہ میں بہمنی سلطنت کو بہت ترقی ہوئی۔

محمود گواں کے زمانہ میں بہمنی تخت پر محمد شاہ سوم تھا۔ یہ بادشاہ نہایت آرام طلب اور ناکارہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا سارا انتظام عملاً محمود گواں کے ہاتھ میں آگیا۔ محمود گواں نے اس اقتدار کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ پھر بھی دربار کے امراء اس کے قوت و اثر کو دیکھ کر اس سے جلنے لگے۔ انھوں نے خفیہ طریقہ سے محمود گواں کی سرکاری مہر حاصل کرلی۔ اس کے بعد ایک جعلی خط اس کی مہر کے ساتھ تیار کیا جو وجے نگر کے راجہ رائے نرسنگھ کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ فرضی خط انھوں نے بادشاہ کو دکھایا اور کہا کہ وزیر غدار ہے۔ وہ بادشاہ کو تخت سے بے دخل کرنے کے لیے وجے نگر کے راجہ کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔

بادشاہ امیروں کے دھوکے میں آگیا۔ اس نے ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو اس لائق وزیر کو قتل کرادیا۔ بعد کو بادشاہ کو پتہ چلا کہ اس نے غلطی کی ہے، اس کو بے حد صدمہ ہوا، یہاں تک کہ وہ خود بھی ایک سال کے اندر ۱۲ مارچ ۱۴۸۲ کو مرگیا۔

محمود گواں کے خلاف اس شرم ناک سازش کا اصل دماغ ملک نائب تھا۔ مگر محمود گواں کے بعد اس کو بھی چین نصیب نہ ہو سکا۔ اب دربار میں اس کے مخالفین پیدا ہوگیے۔ دوبارہ اس کے خلاف بھی سازش ہوئی اور ۱۴۸۶ میں ملک نائب کو بے دردی کے ساتھ قتل کردیا گیا۔ مقتول کے خاتمہ کے صرف پانچ سال بعد خود قاتل کا بھی ذلت کے ساتھ خاتمہ ہوگیا۔

محمود گواں کے قتل کے بعد بہمنی سلطنت دوبارہ سنبھل نہ سکی۔ ۱۵۲۴ء میں اس کے آخری حکمراں کی وفات کے ساتھ بہمنی سلطنت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد اس علاقہ میں بغاوتیں ہوئیں اور ایک سلطنت پانچ الگ الگ سلطنت میں تقسیم ہوگئی۔

عالی ظرفی

مظفر حلیم (متوفی ۹۳۲ھ) گجرات کا حاکم تھا اور محمود خلجی مانڈو (احمد آباد) کا۔ دونوں ہم زمانہ تھے۔ پاس پاس ہونے کی وجہ سے دونوں میں باہم لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ محمود خلجی اکثر گجرات پر حملہ کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس "خوبصورت اور سرسبز" ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کرلے۔ تاہم اسے اپنے ارادہ میں کامیابی نہ ہوسکی۔ اس درمیان میں ایک واقعہ پیش آیا جو بظاہر مظفر حلیم کے لئے بہت خوش کن تھا۔ وہ یہ کہ اس کے حریف محمود خلجی کے وزیر مِنڈلی رائے نے موقع پاکر بغاوت کردی۔ اس کی بغاوت کامیاب رہی، اس نے سلطان کو تخت سے بے دخل کردیا اور خود ملک پر قابض ہوگیا۔ تاہم سلطان محمود خلجی اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگیا۔

اب اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ کیا کرے۔ اس کی نظر میں صرف ایک ہی شخص تھا جو اس نازک وقت میں اس کی مدد کرسکتا تھا اور یہ وہی سلطان مظفر حلیم تھا جس کے اوپر وہ اپنے اقتدار کے زمانہ میں بار بار حملے کرچکا تھا۔ سلطان محمود خلجی کو معلوم تھا کہ سلطان مظفر حلیم اگرچہ اس کا حریف ہے مگر وہ ایک بہادر اور شریف انسان ہے۔ اور شریف اور بہادر انسان کی یہ صفت ہے کہ وہ مدد مانگنے والے کی مدد کرتا ہے، خواہ وہ اس کا حریف اور دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

سلطان محمود خلجی نے کئی دن کے حیص بیص کے بعد بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ وہ سلطان مظفر حلیم کے پاس جائے گا اور اس سے مدد طلب کرے گا۔ وہ جرأت کرکے اس کے پاس پہنچا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے باغی وزیر کے خلاف اس کی مدد کرے۔

سلطان مظفر حلیم کو موقع تھا کہ وہ اپنے حریف کو ذلیل کرے۔ وہ طعن و تشنیع کرکے اس کے بارے میں اپنے سینہ کو ٹھنڈا کرے۔ مگر اس نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ وہ فوراً اپنے حریف سلطان کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ سلطان مظفر حلیم نے حکم دیا کہ اس کی فوج مانڈو کی طرف کوچ کرنے کے لئے تیار ہوجائے۔ اس نے محمود خلجی کو لیا اور خود اپنی فوج کے ساتھ مانڈو کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر وزیر منڈلی رائے کی فوج سے زبردست مقابلہ ہوا۔ بالآخر منڈلی رائے کی فوج نے ہتھیار ڈال دئے اور مانڈو دوبارہ فتح ہوگیا۔

اب فوجیوں کی فاتحانہ نفسیات نے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ سلطان مظفر حلیم کے فوجی سرداروں نے کہا کہ یہ ملک اب آپ کا ہے۔ کیونکہ اس کو آپ کی فوجوں نے لڑ کر فتح کیا ہے۔ آپ اس کو محمود خلجی کے حوالے نہ کریں بلکہ اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا اعلان کر دیں۔ اس معاملہ میں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔

سلطان مظفر حلیم کے لئے یہ بہت نازک لمحہ تھا۔ تاہم اس نے جرأت سے کام لیا اور اپنے فوجی سرداروں کے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کو یہ بات اپنی بہادری اور غیرت کے خلاف معلوم ہوئی کہ جس ملک کو اس نے سلطان محمود خلجی کے نام پر فتح کیا ہے، اس کو سلطان کے حوالے نہ کرے اور خود اس پر قابض ہو جائے۔ سلطان کی جو شرافت اس کی محرک بنی تھی کہ وہ اپنے دشمن کی مشکل وقت میں مدد کرے، وہی شرافت دوبارہ اس میں مانع ہوگئی کہ وہ دشمن کی کمزوری کا غلط فائدہ اٹھائے اور اس کی چیز کو خود اپنے قبضہ میں لے لے۔ اس کے ایک طرف شرافت تھی اور دوسری طرف ملک۔ اس نے اس سے انکار کر دیا کہ وہ ملک کو پانے کی خاطر اپنی شرافت کو کھو دے۔

تاہم سلطان مظفر حلیم کو اندیشہ تھا کہ اس کی فوج اگر مفتوحہ علاقہ میں ٹھہری رہی تو فتح کے جوش میں وہ کوئی نازک مسئلہ نہ کھڑا کر دے اور موجودہ فضا باقی نہ رہے۔ چنانچہ اس نے فوراً ایک حکم جاری کیا۔ اس حکم میں کہا گیا تھا کہ اس کی فوجوں کا کام اب یہاں ختم ہو چکا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی فوج کا کوئی شخص مزید آگے بڑھ کر مفتوحہ شہر کے اندر نہ داخل ہو۔ تمام کی تمام فوج بلا تاخیر اپنے وطن کی طرف واپس چلی جائے۔

اس حکم پر فوراً عمل ہوا۔ سلطان مظفر حلیم کی فوج اپنے فتح کئے ہوئے ملک کو سلطان محمود خلجی کے حوالے کر کے گجرات واپس چلی گئی۔ سلطان مظفر حلیم نے ایک مفتوحہ ملک کو صرف اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ اپنی شرافت اور اپنی بہادری کو محفوظ رکھ سکے (ظفر الوا، از آصفی)

کوئی انسان کیا ہے، ہمیشہ غیر معمولی حالات میں معلوم ہوتا ہے اور ان غیر معمولی حالات میں سب سے زیادہ نازک لمحہ وہ ہوتا ہے جب کہ آدمی فاتح اور غالب کی حیثیت میں ہو۔ اپنے کو فتح و غلبہ کے مقام پر پاکر بھی جو شخص شرافت اور انصاف پر قائم رہے وہی وہ انسان ہے جو امتحان میں پورا اترا۔

سچائی کی فتح

تیرھویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے جب کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ کاندھلہ (ضلع مظفر نگر، یوپی) کی جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع شروع ہو گئی۔ یہ نزاع مسجد سے متصل ایک زمین کے بارے میں تھی۔ مسلمان اس زمین کو مسجد کی ملکیت قرار دے کر مسجد میں شامل کرنا چاہتے تھے اور ہندوؤں کا اصرار تھا کہ یہ قدیم مندر کا حصہ ہے۔ جھگڑا بڑھا تو معاملہ عدالت تک پہنچا اور کئی سال تک اس کا مقدمہ چلتا رہا۔

مجسٹریٹ انگریز تھا۔ جو شواہد اس کے سامنے پیش کئے گئے وہ اتنے قطعی نہ تھے کہ انکی بنیاد پر وہ کسی ایک فریق کے حق میں فیصلہ کر سکے۔ بالآخر مجسٹریٹ نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ الگ گفتگو کی۔ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ کیا تمھاری نظر میں کوئی ایسا ہندو ہے جو یہ گواہی دے کہ یہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔ اگر تم کسی ایسے ہندو کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ کر دوں گا۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم کسی ہندو کا نام نہیں بتا سکتے، یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور ہم کو کسی ہندو سے یہ امید نہیں کہ ایسے مذہبی معاملہ میں وہ جانب داری کے بغیر بالکل سچ بات کہہ سکے اور یہ گواہی دے کہ زمین مسجد کی ملکیت ہے۔

اس کے بعد انگریز مجسٹریٹ نے ہندوؤں کو بلایا اور کہا کہ کیا تم کسی ایسے مسلمان کا نام بتا سکتے ہو جو تمھارے دعوے کی تصدیق کرے اور یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ملکیت ہے۔ اگر تم ایسے کسی مسلمان کا نام بتاؤ تو میں اس کے بیان پر زمین کا فیصلہ تمھارے حق میں کر دوں گا۔" ہندوؤں نے باہم مشورہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا کہ یہ مسئلہ قومی عزت کا معاملہ بن گیا ہے۔ اس لئے بہت مشکل ہے کہ کوئی مسلمان یہ گواہی دے کہ یہ زمین مندر کی ہے تاہم ہماری بستی میں ایک بزرگ ایسے ہیں جن سے ہم کو امید ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔

ہندوؤں نے جس مسلمان کا نام بتایا وہ مولانا مظفر حسین کاندھلوی کے والد مولانا محمود بخش (م ۱۲۵۸ھ) تھے مجسٹریٹ کا کیمپ اس وقت کاندھلہ کے قریبی موضع ایلم میں تھا۔ اس نے فوراً مولانا محمود بخش کے یہاں پیغام بھیجا کہ وہ کچہری پہنچ کر متعلقہ مسئلہ میں اپنا بیان دیں۔ مجسٹریٹ کا بھیجا ہوا آدمی جب مولانا موصوف کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ فرنگی کا منھ کبھی نہیں دیکھوں گا۔ مجسٹریٹ نے دوبارہ اپنا چپراسی بھیج کر کہلایا کہ اس کا انتظام رہے گا کہ میں یا کوئی دوسرا انگریز آپ کے سامنے نہ پڑے۔ آپ مہربانی کر کے تشریف لائیں، کیونکہ آپ ہی کے بیان پر ایک اہم مقدمہ کا فیصلہ ہونا ہے۔ اس نے مزید کہلایا کہ آپ

کی مذہبی کتاب قرآن میں یہ حکم ہے کہ کسی معاملہ میں کسی کے پاس گواہی ہو تو وہ اس کو پیش کرے، وہ ہرگز اس کو نہ چھپائے۔

اب مولانا محمود بخش کاندھلوی مجسٹریٹ کی عدالت میں تشریف لائے۔ مجسٹریٹ خیمہ کے اندر دروازہ کے پاس بیٹھ گیا۔ مولانا دروازہ کے پاس باہر کی طرف کھڑے ہوگئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی تعداد خیمہ کے باہر جمع تھی۔ ہر ایک ملے جلے جذبات کے ساتھ منتظر تھا کہ دیکھئے آج کیا پیش آتا ہے۔ اندر بیٹھے ہوئے مجسٹریٹ نے بلند آواز سے پوچھا کہ مولانا محمود بخش صاحب یہ بتائیے کہ یہ متنازعہ جگہ ہندوؤں کی ہے یا مسلمانوں کی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کی ہے، مسلمانوں کا دعویٰ اس کے بارہ میں غلط ہے۔ مجسٹریٹ نے مولانا محمود بخش صاحب کے اسی بیان پر اپنا فیصلہ دے دیا اور وہ زمین ہندوؤں کو مل گئی۔ یہ زمین کاندھلہ کی موجودہ جامع مسجد کی جنوب مشرقی دیوار سے ملی ہوئی ہے۔ ہندوؤں نے مجسٹریٹ کے فیصلہ کے فوراً بعد یہاں مندر تعمیر کر دیا۔ اب بھی اس جگہ پر وہ مندر موجود ہے۔

مسلمان کچہری سے اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کے چہرے اداس تھے اور ان کے دلوں میں شکست کا احساس چھایا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ "مولوی نے قوم کو غیروں کے سامنے رسوا کر دیا" مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ قانون کی عدالت کا فیصلہ اگرچہ ہو چکا ہے مگر اخلاق کی عدالت کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ مولانا محمود بخش کی اس سچائی اور بے لاگ حق پرستی کا ہندوؤں پر بہت اثر پڑا۔ وہ مولانا کی سچائی کے واقعہ میں اس دین کی سچائی کو دیکھنے لگے جس نے ان کے اندر یہ زبردست قوت پیدا کی کہ وہ ایک نہایت نازک قومی معاملہ میں بھی انصاف سے نہیں ہٹے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاندھلہ کے کئی ہندو خاندان اسلام سے متاثر ہوئے اور مولانا محمود بخش کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ ان نومسلم خاندانوں میں سے ایک گھرانہ ۱۹۴۷ تک کاندھلہ میں موجود تھا جو تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا۔

مسلمان اپنا مقدمہ ہار گئے مگر اسلام اپنا مقدمہ جیت گیا۔

دو شخصوں یا گروہوں میں جب بھی کوئی نزاعی معاملہ پیش آتا ہے تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر ایک کی نظر مفاد اور مصلحت کی طرف چلی جاتی ہے۔ جس چیز میں بظاہر فائدہ نظر آئے، جو قومی وقار کے مطابق ہو۔ جس میں دنیوی سربلندی حاصل ہوتی ہو، آدمی بس اسی کی طرف جھک جاتا ہے۔ مگر حقیقی کامیابی کا راستہ یہ ہے کہ معاملہ کو حق اور ناحق اور انصاف اور بے انصافی کی نظر سے دیکھا جائے۔ جو طریقہ حق کے مطابق ہو اس کو اختیار کر لیا جائے اور جو طریقہ حق کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ اصولی موقف ہے اور اس دنیا میں بالآخر اصولی موقف کامیاب ہوتا ہے نہ کہ افادی موقف۔

مفاد کی قربانی

دور اول میں جنوبی اسپین کے بڑے حصہ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ اس علاقہ کو اصطلاحی طور پر اندلس کہا جاتا ہے۔ تاہم شمالی اسپین کا ایک حصہ ہمیشہ عیسائیوں کے پاس رہا۔ اس بنا پر دونوں قوتوں میں ہمیشہ ٹکراؤ اور مقابلہ کی صورت قائم رہتی تھی۔ گیارھویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں حالات بہت بگڑ گئے۔ مسیحی بادشاہ الفانسو (Alfonso VI) نے ۱۰۸۵ء میں طلیطلہ (Toledo) کو فتح کر کے اپنی طاقت بہت زیادہ بڑھالی۔ اس نے مسلم شہروں پر حملے شروع کر دیے۔ اس کے یہ حملے اتنے شدید تھے کہ یہ اندیشہ محسوس کیا جانے لگا کہ بہت جلد اسپین سے مسلم اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس وقت المعتمد بن عباد اسپین کے مسلم علاقہ کا سلطان تھا۔ اس کا دار السلطنت اشبیلیہ (Selves) تھا۔ اس کو بہت مشکل حالات میں حکومت کا نظام سنبھالنا پڑا۔ پڑوس کے مسیحی حکمراں نہایت بے رحمانہ طور پر مسلم علاقہ کی طرف اقدام کر رہے تھے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا اسپین دوبارہ مسیحی اقتدار کے تحت آجائے گا :

He was destined to rule in difficult times: neighbouring prices were resuming the inexorable advance that in time would bring all of Spain once again under Christian rule. (VII/138)

الفانسو نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد المعتمد سے اپنے سفیر کے ذریعہ خراج ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔ المعتمد نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مطالبہ کو تسلیم کر لیا اور اس کو خراج کی رقم بھیج دی۔ یہ خراج چاندی کے سکوں کی صورت میں تھا۔ مسیحی حکمراں نے چاندی کے سکے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اتنے ہی مقدار میں سونے کے سکہ کا مطالبہ کیا۔ اب المعتمد کو غصہ آگیا۔ اس نے مسیحی سفیر کو قتل کر دیا اور زر خراج کی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

الفانسو اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایک متکبر بادشاہ تھا۔ مذکورہ واقعہ کے بعد وہ سخت برہم ہوا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اشبیلیہ پر حملہ کر کے نہ صرف اپنا انتقام لے بلکہ ہمیشہ کے لیے مسلم

سلطنت کا خاتمہ کر دے۔ ظاہری حالات کے اعتبار سے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب اسپین کی باقی ماندہ مسلم سلطنت بھی ختم ہو جائے گی۔ اور پورے ملک پر مسیحیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

حالات کی نزاکت کے پیش نظر المعتمد نے فیصلہ کیا کہ وہ مراکش کے طاقت ور سلطان یوسف بن تاشفین سے مدد طلب کرے۔ دوبارہ یہ ایک بے حد نازک معاملہ تھا۔ کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں یہ واضح اندیشہ تھا کہ الفانسو کی جگہ یوسف بن تاشقین اس کے ملک پر قابض ہو جائے گا۔ اس کے کچھ مشیروں نے سنجیدگی کے ساتھ اس اندیشہ کا اظہار کیا۔ المعتمد نے اس وقت اپنے مشیروں کو جو تاریخی جواب دیا وہ یہ تھا :

رعی الجمال ولا رعی الخنازیر۔
(لئن أكون اسيرا لدى ملك
عربي مسلم أرعى له الجمال
خير من ان اكون اسيرا لدى
ملك الافرنج أرعى له
الخنازير)

اونٹ کی چرواہی منظور ہے مگر خنزیر کی چرواہی منظور نہیں۔ اگر میں ایک عربی مسلم بادشاہ کا قیدی بن جاؤں اور اس کے اونٹوں کو چراؤں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ میں فرنگی بادشاہ کا قیدی بنوں اور اس کے خنزیروں کو چراؤں۔

اس کے بعد المعتمد نے سلطان یوسف بن تاشقین کو مدد کے لیے پیغام بھیجا۔ وہ افریقہ سے ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہوا۔ آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے وہ اسپین میں داخل ہوا۔ اس وقت مسلم لشکر کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار تھی۔ اور مسیحی فوج کی تعداد ۵۰ ہزار سے زیادہ تھی۔ زلاقہ کے میدان میں دونوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ یہ رمضان کے مہینہ کا پہلا عشرہ تھا۔ مسیحی لشکر کو کثرتِ تعداد کے باوجود بری طرح شکست ہوئی۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ شدید مقابلہ میں خود المعتمد کا چہرہ زخمی ہوگیا۔ اس دن اس نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ آخر میں فرنگی فوجوں میں سے صرف تین گھوڑے سوار اپنی جان بچا کر بھاگ سکے۔ مسلمانوں کو غیر معمولی مقدار میں مال غنیمت حاصل ہوا (۱۰/۱۵۴)

اس واقعہ کا ذکر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے ـــــ ۱۰۸۶ء میں یوسف نے جبرالٹر کی آبنائے کو پار کیا اور زلاقہ کے مقام پر مسیحی فوجوں کو بری طرح شکست دی :

In 1086 Yusuf crossed the Strait of Gibraltar and at Zallaka inflicted a crushing defeat upon the Christian forces: (VII/138)

فتح کا یہ واقعہ بے حد اہم تھا۔ مسلمانوں کی حکومت اسپین میں اس وقت خاتمہ کے عین کنارے پہنچ گئی تھی۔ مگر اس فتح نے اسپین میں مسلم عہد کو چار سو سال مزید آگے بڑھا دیا۔

تاہم یہ عظیم سیاسی کامیابی ایک عظیم نفسیاتی قربانی کے ذریعہ ممکن ہو سکی۔ ایسا صرف اس وقت ہوا جب کہ سلطان المعتمد نے یہ قربانی دی کہ اس نے اپنے سیاسی مفاد کی پروا نہ کرتے ہوئے یوسف بن تاشقین سے بلاشرط فوجی اتحاد کر لیا۔

زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ آدمی کو قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر فیصلہ لینا پڑتا ہے۔ جب تنگ نظری کے بجائے وسعت نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوتاہ بینی کی جگہ دور بینی کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ جب اس عالی حوصلگی کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی چھوٹے مقاصد کو نظر انداز کر کے بڑے مقصد کے لیے آگے بڑھ جائے۔

ایک سچا مومن ایسے مواقع پر سب سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوتا ہے۔ مومن کا آفاقی مزاج اُس کو اِس سے بچاتا ہے کہ وہ چھوٹی باتوں میں اس طرح الجھے کہ بڑی بات کو وہ کھو دے۔ اس کی نگاہ ہمیشہ اعلیٰ مقاصد پر ہوتی ہے۔ اور جس انسان کی نظر اعلیٰ مقاصد پہ ہو وہ کبھی چھوٹی باتوں میں الجھ کر اپنا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتا۔

زندگی کے تمام فیصلوں میں اصل اہمیت مزاج کی ہے۔ صحیح مزاج کے لوگ صحیح فیصلہ لیتے ہیں اور غلط مزاج کے لوگ غلط فیصلہ کرتے ہیں۔ ایمان کسی آدمی کے اندر سب سے زیادہ صحیح مزاج بناتا ہے۔ ایمان آدمی کو صحیح ترین طرز پر سوچنے والا بنا دیتا ہے۔